معاصر عائلی مسائل کے حل میں منتخب پاکستانی مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ

A Review of the Role of Selected Pakistani Centers of Ifta in Solving Contemporary Family Issues

(مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

وسیع اللہ

ایم فل علوم اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر: 47-Mphil/1S/S23

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

اگست 2025ء

معاصر عائلی مسائل کے حل میں منتخب پاکستانی مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ

A Review of the Role of Selected Pakistani Centers of Ifta in Solving Contemporary Family Issues

(مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

نام: وسیع اللہ

ایم فل علوم اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر:47-Mphil/1S/S23

نگران مقالہ

ڈاکٹر حافظ محمد عاصم

لیکچرار: شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

نمل اسلام آباد

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

سیشن 2023-2025

©وسیع اللہ

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ ودفاع مقالہ

Thesis And Defense Approval Form

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں:

مقالہ بعنوان:

معاصر عائلی مسائل کے حل میں منتخب پاکستانی مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ

A Review of the Role of Selected Pakistani Centers of Ifta in Solving Contemporary Family Issues

نام ڈگری: ایم فل علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: وسیع اللہ

رجسٹریشن نمبر: 47-Mphil/1S/S23

ڈاکٹر حافظ محمد عاصم

نگران مقالہ ______________________ دستخط نگران مقالہ

ڈاکٹر ریاض احمد سعید

(صدر شعبہ اسلامی فکر وثقافت) ______________________ دستخط صدر شعبہ اسلامی فکر وثقافت

پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض شاد

(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) ______________________ دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

تاریخ: ______________________

حلف نامہ فارم

(Candidate Declation Form)

میں وسیع اللہ رجسٹریشن نمبر 47-Mphil/1S/S23 طالب علم، ایم فل، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد، حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ!

مقالہ بعنوان:

معاصر عائلی مسائل کے حل میں منتخب پاکستانی مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ

A Review of the Role of Selected Pakistani Centers of Ifta in Solving Contemporary Family Issues.

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لئے پیش کیا گیا ہے اور **ڈاکٹر حافظ محمد عاصم** کی زیر نگرانی تحریر کیا گیا ہے، یہ راقم الحروف کا اصل کام ہے اور مزید یہ کہ مذکورہ کام کہیں اور جمع کرایا گیا ہے نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: وسیع اللہ

دستخط مقالہ نگار: ________________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

A Review of the Role of Selected Pakistani Centers of Ifta in Solving Contemporary Family Issues.

Abstract

The Quran and *Sunnah* provide profound insights into familial matters and offer detailed guidance on various aspects. However, *Shari'ah* rulings on practices like *Salah* and *Zakat* lack such depth. This discrepancy underscores the paramount importance accorded to family matters in Islamic jurisprudence. In today's world, Muslims encounter new family challenges regularly and they seek solutions rooted in Quranic principles and Prophetic traditions. Consequently, institutions like *Dar ul Ifta* play a pivotal role, particularly in regions like the Indian subcontinent, including Pakistan, where these institutions hold significant influence over the lives of the people. Individuals turn to *Dar ul Ifta,* seeking guidance on a spectrum of matters and the honorable *Muftis* issue *fatwas* and address their concerns, many of which pertain to familial issues. Therefore, it is apparent that these institutions serve as linchpins within society.

This thesis aims to explore the role of *Dar ul Ifta,* in resolving familial issues according to Quran and *Sunnah*. as a sample, the role of four prominent *Dar ul Ifta* related to four famous schools of thought will be examined in the thesis. These are:

1. Dar ul Ifta Jamia Binori Town Karachi (Deobandi School of thought)
2. Jamia Naeemiyyah Lahore, (Barailvi School of thought)
3. Jamia Salafia Faisal Abad (Ahle Hadith School of thought)
4. Jamiat ul Kausar Islamabad (Shia' School of thought)

Keywords: Shari'ah Rulings, Dar ul Ifta, Fatwa, Family Issues

ملخص

معاصر عائلی مسائل کے حل میں منتخب پاکستانی مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ

قرآن وسنت دیگر اہم عبادات جیسے نماز اور زکاۃ وغیرہ سے متعلق اتنی تفصیلی رہنمائی فراہم نہیں کرتیں جتنا کہ خاندانی امور اور اس سے متعلقہ تمام پہلوؤں پر تفصیلی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ اس سے خاندانی امور کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ آج مسلمانوں کو خاندانی امور سے متعلق نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑرہا ہے، جن کے لیے وہ قرآن وسنت کی روشنی میں حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں برصغیر پاک وہند میں دار الافتاء جیسے اہم ادارے نہایت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لوگ اپنے خاندانی مسائل کے حل کے لیے دار الافتاء کا رخ کرتے ہیں اور وہاں محترم مفتیانِ کرام ان کے مسائل کا حل نکال کر فتاوی جاری کرتے ہیں۔ روزمرہ کے اس طرزِ عمل سے دار االافتاء کی اہمیت اور کردار کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں خاندانی مسائل کے حل میں دار الافتاء کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے، چنانچہ چار معروف مکاتبِ فکر کے حسبِ ذیل چار اہم مراکز افتاء کے کردار کو جانچا جائے گا:

1. دار الافتاء جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی (دیوبندی مکتبِ فکر)
2. دارالافتاء جامعہ نعیمیہ لاہور (بریلوی مکتبِ فکر)
3. دارالافتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد (اہلِ حدیث مکتبِ فکر)
4. دارالافتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد (شیعہ مکتبِ فکر)

کلیدی الفاظ: شریعت کے احکام، دار الافتاء، فتویٰ، عائلی مسائل

فہرست عنوانات

1	منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ	Iv
2	حلف نامہ	V
3	Abstract	Vi
4	ملخص	Vii
5	فہرست عنوانات	Viii
6	اظہار تشکر	X
7	انتساب	Xi
8	**باب اول: موضوع تحقیق سے متعلق بنیادی مباحث**	1
9	موضوع تحقیق کا تعارف اور ضرورت و اہمیت	2
10	جواز تحقیق و موضوع تحقیق پر سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ	9-3
12	مقاصد تحقیق، سوالات، تحدید، موضوع	10
13	منہج تحقیق	11
14	**باب دوم: افتاء کا مفہوم، اہمیت اور پاکستانی مراکز افتاء کا تاریخی ارتقاء**	12
15	فصل اول: افتاء: مفہوم، ضرورت اور اہمیت	13
16	فصل دوم: مرکز افتاء: تعارف، مقاصد اور ارتقاء	22
17	فصل سوم: منتخب کردہ پاکستانی مراکز افتاء کا تعارف	30
18	**باب سوم: معاصر عائلی مسائل سے متعلق پاکستانی و شرعی قوانین کا جائزہ**	47
19	فصل اول: کتاب و سنت کی روشنی معاصر عائلی مسائل کی اہمیت	48
20	فصل دوم: پاکستان کے عائلی قوانین کا جائزہ	99
21	فصل سوم: عائلی مسائل سے متعلق بنیادی شرعی احکام	118
22	**باب چہارم: عائلی مسائل کے حل میں پاکستانی مراکز افتاء کا جائزہ**	169
23	فصل اول: نکاح کے مسائل	170
24	فصل دوم: طلاق اور خلع کے مسائل	182
25	فصل سوم: وراثت اور دیگر عائلی مسائل	193

26	نتائج بحث	222
27	سفارشات	224
28	فہارس	225
29	فہرست آیات	226
30	فہرست احادیث	228
31	فہرست اعلام	230
32	مصادر و مراجع	231

اظہار تشکر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے ہمیں اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کیا اور علم کی بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اس کا شکر ادا کرنا حقیقتاً ممکن نہیں، مگر میں اپنی عاجزی اور ندامت کے ساتھ اس کا شکر گزار ہوں۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شمار کرنا ہمارے بس سے باہر ہے، اور اسی وجہ سے اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہونے کا حق ادا کرنا بھی مشکل ہے۔

والدین کی محبت اور شفقت کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، کیونکہ وہ نہ صرف ہماری زندگی کے ظاہری سبب ہیں بلکہ اللہ کی بے پناہ رحمتوں کا سرچشمہ بھی ہیں۔ میرے والدین نے ہر غم کو اپنے سینے میں چھپایا اور مجھے علم کے میدان میں کامیابی کی راہ پر چلنے کے لیے اپنی دعاؤں کا تحفہ دیا۔ اللہ تعالیٰ میرے والد کے درگزر کو اپنی رحمتوں سے منور کرے اور میری والدہ کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

اس سفر میں جو عظیم ہستیاں میرے ساتھ رہیں اور جنہوں نے میری رہنمائی کی، ان کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے لیے مشکل ہے۔ خاص طور پر میرے مقالہ کے نگران ڈاکٹر حافظ محمد عاصم صاحب، صدر شعبہ ڈاکٹر ریاض احمد سعید صاحب اور میرے اساتذہ کرام، جن میں ڈاکٹر مفتی عبدالرشید صاحب، ڈاکٹر بشیر احمد صاحب، ڈاکٹر یاسر احمد زیرک صاحب اور ڈاکٹر عمر فاروق صاحب شامل ہیں۔ ان سب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے میری علمی رہنمائی کی اور مجھے اس سفر کی تکمیل کی جانب قدم بڑھایا۔ اس کے باوجود میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان کے علم سے میں پورا استفادہ نہ کر سکا۔

اس کے علاوہ، میرے چچا پروفیسر ڈاکٹر مفتی عبدالوہاب صاحب، مفتی فیض محمد عزیز صاحب، اور ماموں زاد بھائی ڈاکٹر ذاکر اللہ اور ایم فل سکالر مفتی محمد صابر کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری رہنمائی کی اور میری علمی جدوجہد کو سراہا۔ میری زندگی میں ان کی بے لوث معاونت اور محبت کا ایک اہم کردار ہے۔

میرے خراج عقیدت کے مستحق شیخ الحدیث حضرت مولانا قاری سعید الرحمنؒ کے جانشین حضرت مولانا قاری عتیق الرحمن صاحب، مولانا محمد انس صاحب بھی ہیں جنہوں نے نہ صرف مجھے جامعہ اسلامیہ میں تدریسی خدمات کا موقع دیا بلکہ میرے ایم فل کے داخلے میں بھی میری مدد کی اور مقالے کی تیاری میں میرے لیے بہترین رہنمائی فراہم کی۔

آخر میں، میں اپنے تخصص کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے حوالہ جات کی مراجعت، تصحیح اور مواد کی ترتیب میں میری مدد کی۔ ان تمام حضرات کا بھی شکریہ جنہوں نے کسی بھی شکل میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی بے پناہ رحمتوں سے نوازے اور ان کی زندگیوں میں کامیابیاں اور خوشیاں دے۔ آمین۔

انتساب(DEDICATION)

میں اپنی اس کاوش کا انتساب رحمۃ للعالمین ﷺ کی ذات بابرکت کے نام کرتا ہوں کہ جن کی اتباع و پیروی میں دارین کی سعادت مندی کا راز مضمر ہے۔

اور اپنے والدہ کے نام کرتا ہوں جن کی انتھک محنتوں اور دعاؤں کی بدولت اس منزل سے آشنا ہوا ہوں۔

باب اول

موضوع تحقیق سے متعلق تعارفی مباحث

فصل اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور ضرورت واہمیت

فصل دوم: دراسات سابقہ

فصل سوم: جواز تحقیق، سوالات تحقیق اور منہج

موضوع تحقیق کا تعارف (Introduction to the Topic)

مرکز افتاء شرعی مسائل میں رہنمائی کرنے والا ایک اہم ادارہ ہے۔ایسے ادارے بالعموم ہر دینی درسگاہ کے ساتھ موجود ہوتے ہیں، جہاں مسلمان عبادات نماز، روزہ، حج، زکوۃ سمیت روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ مسائل نکاح، طلاق حلال و حرام، اسلامی بنکاری، وغیرہ کا حل بھی دریافت کرتے ہیں۔

اسی ضرورت کے پیش نظر میں نے اپنے مقالے کا موضوع **"معاصر عائلی مسائل کے حل میں منتخب پاکستانی مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ"** منتخب کیا ہے کیونکہ شرعی احکام اور مسائل دینیہ سے آگاہی ہر مسلمان مرد و عورت کی ضرورت ہے اور اس کی زندگی پر ان احکام و مسائل کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے، بہت سے نیک لوگ جو شریعت کے سانچے میں ڈھل کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہ قدم بہ قدم شرعی احکام میں رہنمائی کے محتاج ہوتے ہیں۔

عائلی مسائل کے تناظر میں دیکھا جائے تو برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا اعتماد عدالتوں سے زیادہ علماء پر ہے، چنانچہ عوام اس طرح کے مسائل ہمیشہ سے علماء کرام کے سامنے رکھ کر رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

روزانہ کئی طرح کے پیچیدہ قسم کے خاندانی مسائل کا یہاں پر تصفیہ کیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں کئی گھر اور خاندان برباد ہونے سے بچ جاتے ہیں۔زیر نظر مقالے میں مرکز افتاء کے اس طرح کے اصلاحی کردار کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس تحقیقی موضوع پر کام کے حوالے سے ملک کے معروف مراکز افتاء کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، جامعۃ الکوثر اسلام آباد، اسی طرح ان مراکز افتاء کے سماجی کردار اور خدمات کو سامنے لانے کے دور حاضر کے اہم ترین معاصر عائلی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے جن میں نکاح، طلاق، خلع، وراثت اور رضاعت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ضرورت و اہمیت (Significance of the Study)

عائلی مسائل ایک اہم موضوع ہے جو مرکز افتاء سمیت تمام علمی مجالس میں زیر بحث رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو مختلف مراحل میں یا شکلوں میں بنایا ہے ایک عورت ہے اور دوسرا مرد ہے مرد و عورت اور ان کا مجموعہ بھی وہ عمل ہے جسکے نتیجے میں انسان سے اگلی نسل تخلیق پاتی ہے مرد کو عورت کے ساتھ کیسے رہنا ہے اور عورت کو مرد کے ساتھ کیسے رہنا انکے باہمی ملاپ کی کیا شکلیں ہوگی اور گھر میں جب بچی ہے اسکی تربیت کی کیا ترتیب ہے اور جب انسان شادی کرلیتا ہے اور گھر میں بیوی آجاتی ہے تو اس کے ساتھ تعلق کس نوعیت کا ہوتا ہے اور اسمیں پیدا ہونے والے اتار چڑھاؤ اور ان میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل کیا ہوتا ہے۔

اسی طرح جب عورت بڑی ہو جاتی ہے اور وہ ماں کی شکل اختیار کرلیتی ہے تو پھر ماں کے ساتھ انسانی رشتہ

کس قدر عظیم ہوتا ہے اور ان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے وہ کس نوعیت کا ہوتا ہے یہ وہ بنیادی صورتیں ہیں جو عائلی مسائل کے ضمن میں ہمارے معاشرے میں پیش آتی ہیں موجودہ دور میں یورپی تہذیب اور مادر پدر آزاد معاشرے نے ان مسائل کو اگرچہ ہمارے ہاں بھی کم کر دیا ہے اور انسان نے ایک حیوانی شکل اختیار کر لی ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق عورت کو لے آتا ہے اور جب تعلق ختم کرنا ہو اپنی مرضی کے مطابق ختم کر دیتے ہیں لیکن وہ معاشرہ اور وہ لوگ جو اسلام پر چلنا چاہتے ہیں اور چلتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جب بھی ان کو اس طرح کے مسائل پیش آتے ہیں تو ان مسائل کے حل کیلئے وہ اگر خود اہل علم ہو تو وہ قران و سنت میں غور کرتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ عمومی طور پہ ان پڑھ ہے تو وہ اس لیے مراکز افتاء اور مفتی حضرات سے رجوع کرتے ہیں اور یہ جو رجوع کا سلسلہ ہے یہ ایک عرصے سے قائم ہے برصغیر میں مراکز افتاء دینی مدارس اور مراکز کا ایک بہت طویل اور بڑا جال ہے جسکی تاریخ تقریبا ڈیڑھ صدی پر محیط ہے اسی ضمن میں ایک عرصے سے عوام الناس کا ایک بڑا حلقہ دینی مدارس اور مراکز افتاء کی طرف رجوع کرتا ہے اور وہاں سے مسائل اور بالخصوص عائلی مسائل کے بارے میں جو رہنمائی لیتا ہے اس رہنمائی کی شکلیں اور اس رہنمائی پر معاشرے کے اثرات اور اس رہنمائی کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ اور ہماری قوم میں موجودہ شکلیں ان حوالے سے میں نے اس موضوع کو منتخب کیا ہے اور میں نے یہاں پر عائلی مسائل کے ضمن میں عوام کا مرکز افتاء کی طرف رجوع کرنا اور پھر مرکز افتاء کا قرآن و سنت کی بنیاد پر عائلی مسائل سے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کرنا اور پھر عوام کا ان نقطہ ہائے نظر کو قبول کرنا اور اس کی عملی شکلیں پیدا ہونا اور اس کے معاشرے پر اثرات کا مرتب ہونا ان چیزوں کو سامنے رکھ کر میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

یہ موضوع ایم فل کے مقالہ کے طور پر لکھا گیا ہے چونکہ ملک ایک بہت طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے تو اس ضمن میں تمام مراکز افتاء کو لینا اور تمام چیزوں کو سمیٹنا اس بحث کے اندر ممکن نہیں تھا اسی چیز کے پیش نظر میں نے ہر مسلک سے ایک ایک مرکز افتاء کو منتخب کیا ہے اور میں نے پاکستان میں موجود دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور اہل تشیع مکتب فکر کو سامنے رکھ کر ان کا ایک ایک مرکز افتاء اور وہ بھی جو اپنے اپنے مکتب میں اور اپنے اپنے سلسلے میں معروف ہیں اور قابل قدر ہے اور وہ ایک نام رکھتا ہے اسی کو منتخب کیا ہے اسی طرح ایک مرکز افتاء کے جائزے سے ہم کسی حد تک پورے مسلک اور اس مسلک سے متعلق ہم تفصیلی جائزہ لے سکتے ہیں اور اس کو اچھی طریقے سے سمجھ سکتے ہیں میں امید کرتا ہوں کہ یہ بحث میرے لیے اور امت مسلمہ کیلئے اور آنے والے لوگوں کے لیے مفید و نافع ہو گی۔

دراسات سابقہ (Review of Literature)

مقالہ جات

1. **عائلی زندگی سے متعلق آیاتِ احکام اور جدید نِسائی فکر کا تنقیدی جائزہ، پی ایچ ڈی مقالہ، ڈاکٹر ذاکر اللہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، 2019۔**

اس مقالہ میں قرآن کی عائلی آیاتِ احکام کا جدید نسائی فکر کے تناظر میں تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نکاح، طلاق، وراثت جیسے موضوعات کو قرآنی نقطۂ نظر سے بیان کر کے نسائی تعبیرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مقالے کی خوبی یہ ہے کہ یہ دورِ جدید کے فکری چیلنجز کے مقابل اسلامی موقف کو مدلل انداز میں واضح کرتا ہے، البتہ میدانی اعداد و شمار اور جدید نسائی افکار کے حوالہ جات کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

2. **صوبہ سرحد میں مراکز افتاء کا قیام، خدمات، اثرات اور اصلاحی تجاویز، (ایم فل مقالہ) محمد ریاض خان الازہری، نگران مقالہ محمد ضیاء الحق، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، 2011ء**

اس مقالہ میں پانچ ابواب ہیں: **باب اول** میں صوبہ سرحد کا تاریخی، سیاسی، جغرافیائی، اور مراکز افتاء کا قیام کو ذکر کیا ہے اس باب میں تین فصول ذکر کئے ہیں، **فصل اول** میں آزادی پاکستان سے قبل صوبہ سرحد کا تاریخی سیاسی جغرافیائی، جبکہ **فصل ثانی** میں آزادی پاکستان کے بعد صوبہ سرحد کا تاریخی، سیاسی، جغرافیائی اور **فصل ثالث** میں صوبہ سرحد میں مراکز افتاء جو آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تھے ان پر بحث کی ہے۔

باب دوئم میں فتویٰ کے تعارف کو پیش کیا ہے، اس میں تین فصول بنائی ہیں، فصل اول میں افتاء کا تعارف اہمیت دائرہ کار اور اصول افتاء کے دیگر مباحث کو ذکر کیا ہے اور اس فصل میں قرآن وحدیث اور اقوال وآثار کی روشنی میں فتوی کے فضائل بھی بیان کی ہے۔ فصل دوئم میں تاریخی افتاء کا پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ عہد رسالت اور عہد رسالت میں منصب افتاء کی کیا کیا شکل تھی اور اس کا طریقہ کار کیا تھا اور وقت اس اہم منصب افتاء پر کون کون سے حضرات فائز تھے۔ جبکہ **فصل ثالث** میں افتاء کے اصول وآداب بیان کئے ہیں نیز اس فصل میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ مفتی کے لیے اہم اور ضروری شرائط کون کونسے ہیں نیز مستفتی کے آداب بھی اس فصل میں بیان کئے ہیں۔

باب سوئم: اس باب میں بھی تین فصول بنائیں گئیں ہیں۔ **فصل اول** آزادی پاکستان سے قبل صوبہ سرحد کے مشہور مفتی حضرات کا تعارف اور انکی خدمات ذکر کی ہے اور **فصل ثانی** میں قیام پاکستان کے صوبہ سرحد کے مفتی حضرات کا تعارف اور انکے خدمات ذکر کئے ہیں اور اس فصل میں زیادہ تر جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فارغ التحصیل علماء کرام کا ذکر کیا ہے

باب چہارم: اس باب میں بھی تین فصول بنائے گئے ہیں: **فصل اول** میں شائع شدہ فتاویٰ جات کے مثبت پہلو کو بیان کیا گیاہے اوران فتاوی کی خصوصیات بیان کی گئ ہیں نیز ساتھ میں بھی بتایا گیاہے کہ صوبہ سرحد کے زیادہ تر فتویٰ جات غیر مطبوع شدہ ہے۔ **فصل ثانی** میں غیر طبع شدہ فتاویٰ جات کا اندراج کیا گیاہے اوراسکی تعداد تقریباً اس میں ایک لاکھ بتائی گئ ہے۔ اوراخر میں غیر مطبوع فتاویٰ جات کیلئے کچھ تجاویز پیش کی ہے۔ فصل سوئم میں غیر مطبوعہ فتویٰ جات میں کچھ کمی پائی جاتی تھی تواس کمی کی منفی پہلو پر بحث کی ہے۔

باب پنجم: اس باب میں بھی تین فصول بنائے گئے ہیں **فصل اول** میں افتاء کا تعلق براہ راست معاشرے اوربنی نوع انسان سے ہے اس لیے افتاءسب سے پہلا ہدف انسان ہی ہے اس کی اہمیت کے متعلق بحث کی ہے معاشرے پر افتاء کے مثبت اثرات ہے اگر فتویٰ ٹھیک اور قرآن کے عین مطابق دیاجائے۔ تواس کافائدہ اور مثبت اثرات ہوتے ہیں۔ **دوسرے فصل** میں فتوی کی منفی اثرات معاشرے پر کیاہے اسکو ذکر کیاہے اور **تیسرے فصل** میں منفی اثرات کے سدباب کیسے کیاجائے اس پر تفصلی بحث کی ہے۔

3. اودھ میں افتاء کے مراکزاوران کی خدمات، پی ایچ ڈی مقالہ، ڈاکٹر اشتیاق احمد اعظمی، 2009ء

باب اوّل، تمہیدی امور کے ذیلی عنوان "مختصر تاریخ افتاء" میں واقعہ ُسلیمان، فتوائے کلالہ، استفتاء فی النساء وغیرہ والی آیات قرآنیہ کو مناسب مقام پر استدلالاً ذکر کیاہے۔ مصنف نے اس باب میں چند فصلیں قائم کرکے افتاء کی لغوی واصطلاحی تعریف کے ساتھ ساتھ افتاء کی مختصر تاریخ ومراحل افتاء کو جامع انداز میں بیان کیاہے اوراس کے ہر گوشے کواپنے مقالہ میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

باب دوم میں فتویٰ نویسی کے اصول وضوابط کے تحت مختلف فصول کو مرتب کیاہے، جس میں لفظ فتویٰ، اصل اور ضابطہ کی لغوی واصطلاحی بحث کی ہے، فتویٰ دینے میں احتیاط کی ضرورت اسکے ضمن میں علامہ ابن قیم کا فیصلہ نقل فرمایاہے کہ بغیر علم کے فتویٰ دیناحرام ہے، مفتی کے شرائط واوصاف اسکے ذیلی عنوان میں استاذ موصوف نے طبقات مجتہدین پر شرح وبسط کے ساتھ صفحہ کتاب کو مزین کیا۔

باب سوم "اودھ کا مختصر تاریخی پس منظر علمی وثقافتی تناظر میں" کے ضمن میں مختلف فصلیں قائم فرمائی ہیں؛ جن میں اودھ کے جغرافیائی پہلو کو ایسے اسلوب سے سنوارا کہ اگر چند شہر وقصبات پر مرکزی نقطہ لگاکر باہم لکیریں ملادیں تواودھ کا ذہنی خاکہ؛ کاغذی خاکہ میں بدلتاہو اصاف وشفاف صورت میں نظر آئے گا۔

تاریخ اودھ میں ندوۃ العلماء جیسے عظیم ہیکل، علمی ادارہ کا ذکر نہ ہو تو اودھ کی تاریخ نامکمل اور ادھوری رہ جاتی؛ اس لیے مصنف نے ندوۃ العلماء کے علمی واتحادی خدمات کے ساتھ ساتھ؛ درس نظامیہ میں ترمیم واصلاحات کی غرض سے علماء ندوۃ کے علمی وتالیفی اقدام کو بھی موضوع بحث بناکر تاریخ اودھ کو مزین فرمایا۔ اس فصل میں فرقہ

شیعہ کی مختصر اور جامع تاریخ بھی پیش کی گئی ہے جس میں ان کے مدارس اور کبار علماء کی دعوتی جدوجہد مذکور ہے۔

باب چہارم کا عنوان "**موضوع کتاب**" ہے، اس باب میں مولانا نے مراکز افتاء کی دو تقسیم بیان فرمائی:

اوّل سنی مراکز افتاء ثانی شیعی مراکز افتاء

سنی مراکز افتاء کے تحت سرفہرست تین مراکز کا شمار کرایا ہے فرنگی محل، ندوۃ العلماء، مدرسہ فرقانیہ ہر ایک مرکز پر مستقل فصل قائم فرما کر مرکز کا تاریخی پس منظر اور اس کی خدمات بیان کی گئی ہیں۔

باب چہارم میں اخیر کی پہلی اور دوسری فصلوں میں اصحاب فقہ و فتاویٰ کے عنوان سے کثیر التعداد شخصیات کی سوانح مدون فرمائی ہیں، جو "اودھ و مضافات اودھ" کے چیدہ چیدہ علماء و مفتیان کرام متوفین و موجودین کی سوانح حیات پر مبنی ایک علاقائی موسوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

باب پنجم "مسلم معاشرے کی رہنمائی" میں مراکز افتاء کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے رائج الوقت مختلف فتاوے کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے؛ اور آخری باب میں خلاصۂ بحث کے عنوان سے مسلمانوں میں ہندو معاشرہ کا چڑھتا رنگ، غلاء مہور، بیوہ عورت سے شادی کا تنفر، نیز غیر مختون مسلمانوں کے ختنہ کا رواج، بدعت و خرافات کے قلع قمع کی فکر میں مفتیان کرام و علماء عظام کے دفاعانہ اقدام کو ذکر کر کے مولانا نے اپنی کتاب کو زینت بخشی ہے۔

کتابیں

1۔ **کتب فقہ، اصول فقہ اور فتاویٰ کا تعارف، مصنف: مولانا محمد نعمان، انوار العلوم کورنگی ٹاؤن کراچی**

اس کتاب میں 256 صفحات ہیں اور اس میں مصنفؒ نے سب سے پہلے فتویٰ کی تعریف ارتقاء اور صحابہ کر دور میں فتویٰ کا طریقہ کار وغیرہ ذکر کیا ہے اس کے بعد مصنف نے فتاویٰ جات کے کتب کا مختصر تعارف ذکر کیا ہے اور اس کے بعد اصول فقہ کے کتب کا تعارف ذکر کیا ہے۔

2۔ **فتوی نویسی کے رہنما اصول، مصنف: مفتی محمد سلیمان منصور پوری، ناشر: کتب خانہ نعمیہ، طبع نامعلوم**

یہ کتاب عقود رسم المفتی کی روشنی میں ہی افتاء کے اصول اور مرتب کی ہے انہوں نے پہلے کچھ کتب کا مختصر تعارف کیا ہے۔ اس کے بعد فقہی رسائل کے نام اور ان پر مختصر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اسکے بعد افتاء میں معاون کتب کا تذکرہ کیا ہے انکی اہمیت بھی بیان کیا ہے۔

3۔ **آپ فتویٰ کیسے دیں گے، مصنف: مفتی سعید احمد پالن پوری، ناشر: مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔2010ء**

اس کتاب میں مصنفؒ نے دراصل عقود رسم المفتی کی تشریح کی ہے اور اس عقود رسم المفتی چونکہ عربی میں اس لیے اس کتاب میں اس ترجمہ مع تشریحات ذکر کی ہے نیز فتاوی کی تصریحات بھی ذکر کی ہے کہ کن کن کتابوں سے فتویٰ دینا جائز ہے اور کن کتب سے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

4۔ ہمارے عائلی مسائل، مصنف: مفتی تقی عثمانی، صفحات:260، دارالاشاعت، مسافر خانہ، کراچی، 1962ء

اس کتاب میں مصنف نے ابواب قائم نہیں کئے بلکہ کتاب کی ابتداء تمہید سے کی ہے اور شریعت کے بنیادی اصولِ استدلال بیان کرتے ہوئے صرف تین اصول کو بیان کئے ہیں چوتھے اصل یعنی قیاس کو بیان نہیں ہے اسکے بعد عائلی مسائل میں سے ایک مسئلہ پوتے کی وراثت کا ہے اور اس پر مدلل گفتگو کی ہے۔ اسکے بعد نکاح کے رجسٹریشن کی شرعی حیثیت اور تعدد ازواج پر بحث کی ہے۔ کتاب کا اختتام مسائل طلاق، اور عمر نکاح پر مفصل بحث کرتے ہوئے کی۔

5۔ أدب المفتي والمستفتي، لابن الصلاح، تحقيق: عبد القادر الأرناؤوط، دمشق: دار العلوم والحكم وعالم الكتب، 2005.

"أدب المفتي والمستفتي" امام ابن الصلاح کی گراں قدر تصنیف ہے جسے فنِّ افتاء میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا مرکزی موضوع فتویٰ دینے اور پوچھنے کے آداب ہیں۔ 96 صفحات اور تقریباً 20 مباحث پر مشتمل یہ کتاب مفتی و مستفتی کے شرائط، فتویٰ نویسی کے اصول اور شرعی رہنمائی کے اسالیب کو نہایت بلیغ اور عالمانہ انداز میں پیش کرتی ہے۔

ابن الصلاح کے نزدیک فتویٰ دینا محض علمی سرگرمی نہیں بلکہ ایک عظیم شرعی ذمہ داری ہے۔ مفتی کیلئے قرآن وسنت اور فقہی اصول سے واقفیت، دیانت و تقویٰ، تواضع اور صبر ضروری ہیں، جبکہ لاعلمی کی صورت میں خاموشی اختیار کرنا افضل ہے۔ انہوں نے مفتی کو قاضی کے ہم رتبہ قرار دیا ہے اور فتویٰ نقل کرنے یا ہر سوال کا جواب دینے میں احتیاط برتنے کی تاکید کی ہے۔

کتاب کا دوسرا پہلو مستفتی کے آداب سے متعلق ہے، جس میں خلوص نیت، ادب، اور خواہشِ نفس سے اجتناب کو بنیادی اصول بتایا گیا ہے۔ ابن الصلاح نے فتویٰ کو اجتہاد سے الگ اور مستقل عمل قرار دیا اور زور دیا کہ فتاویٰ ہمیشہ مجتہدین کے اصول واقوال کی روشنی میں ہوں۔

ان کا اسلوب متین اور مدلل ہے، جو نصوصِ شرعیہ، اقوالِ صحابہ اور ائمہ کی آراء سے مزین ہے۔ عبد القادر الأرناؤوط کی تحقیق نے اس کتاب کو مزید وقعت بخشی ہے اور آج یہ تصنیف ہر عالم، مفتی اور طالب علم کے لیے ایک مستند و معتبر ماخذ سمجھی جاتی ہے۔

5. أصول الإفتاء وآدابه، محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، 2012ء

برصغیر کے جلیل القدر عالمِ دین مفتی محمد تقی عثمانی کی وہ گراں قدر تصنیف ہے جسے فنِّ افتاء کے موضوع پر عربی زبان میں لکھی جانے والی اہم اور معیاری کتب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں نہایت

جاندار اسلوب کے ساتھ فتویٰ کے مفہوم کی توضیح کی ہے، پھر اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی واضح کیا ہے کہ افتاء اور قضاء کے مابین اصولی فرق کیا ہے۔

کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سلفِ صالحین، بالخصوص صحابہ کرام اور تابعین کے مناہجِ افتاء کو نہایت حسنِ ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح فقہائے احناف و شوافع کے طبقات، اصولِ افتاء میں مذہبِ حنفیہ کے امتیازی پہلو، علت، عرف، حاجت و ضرورت، اور سدِّ ذرائع کی بنیاد پر احکام کی تبدیلی جیسے نہایت نازک مباحث کو بھی باریک بینی سے بیان کیا گیا ہے۔ مزید بر آں، افتاء کے اصول و مناہج کو جامعیت اور گہرائی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، جو طالبِ علم اور محقق، دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہیں۔

اگرچہ کتاب ابواب و فصول کی روایتی تقسیم سے خالی ہے، تاہم آخر میں ایک نہایت وقیع فہرستِ اعلام شامل کی گئی ہے، جس میں ان اکابر علماء اور مراجع کے مختصر تراجم درج ہیں جن کا ذکر کتاب کے حواشی میں آیا ہے۔ کتاب اپنی اشاعت کے اعتبار سے بھی دیدہ زیب ہے، یہ نہ صرف مجلد اور حسین سرورق سے مزین ہے بلکہ جاذبِ نظر طباعت کے ساتھ 348 صفحات پر محیط ہے۔ یہ تصنیف آج بھی علمی حلقوں میں خصوصی وقعت رکھتی ہے۔

آرٹیکل

1. **کوئٹہ کے مراکز افتاء اور ان کی کارکردگی، سیف الرحمن، رحمت اللہ اچکزئی، راحۃ القلوب، جلد 3، شمارہ 2، جولائی 2019ء**

آرٹیکل کے (abstract) میں فتویٰ کی اہمیت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ مصنفین نے معاشرتی مسائل کی ضرورت و اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے حل کیلئے ایک مفتی کے کردار کو واضح کیا ہے۔

جن مدارس سے فتاویٰ جات دیئے جاتے ہیں انہیں بھی ایک اہمیت کے پیش نظر رکھتے ہوئے انکے کردار کو سراہا ہے اور اہمیت کا حامل ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ ریسرچ سٹڈی کوئٹہ کے متعلق ہے لہٰذا یہ بتایا گیا ہے کہ صرف کوئٹہ کے فتاویٰ جات و مفتیان کو زیر بحث لایا جائے گا۔

آغاز میں مرکز افتاء کو ذکر کرنے سے پہلے فتوے کی تعریف ذکر کرتے ہوئے مصنفین لکھتے ہیں کہ "اصلاح معاشرہ میں پیش آمدہ واقعات کے بارے میں دلیل شرعی کے ذریعے حکم الٰہی بتانے کا نام فتویٰ ہے اور جن اداروں سے فتاویٰ جاری کئے جاتے ہیں انہیں مرکز افتاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لوگوں کی علماء اور مفتیان کے ساتھ مسائل کے بارے میں پوچھنے میں ایک تعلق کو بھی اس میں ظاہر کیا ہے کہ کیے لوگ رغبت رکھتے ہیں اس کے بعد کوئٹہ شہر کی مختصر تاریخ پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔

2. معاصر عائلی مسائل کے عوامل و اثرات اور تدارک: شریعتِ اسلامیہ کے تناظر میں پاکستانی سماج کا مطالعہ، جعفر عرفان، حافظ محمد عثمان، اور آسیہ پروین، پاکستان اسلامکس، جلد چہارم، 2024ء۔

میں پاکستانی معاشرے کو درپیش جدید خاندانی مسائل کا گہرا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنفین کے مطابق موجودہ دور میں گھریلو نظام کمزور ہو چکا ہے، جسکے نتیجے میں فرد اور معاشرہ دونوں عدم استحکام کا شکار ہیں۔ اخلاقی انحطاط، مرد و عورت کے حقوق میں عدم توازن، طلاق کا غلط استعمال، جبری نکاح اور مغربی ثقافتی اثرات ان بگاڑ کے اہم عوامل ہیں۔

مضمون میں اسلامی تعلیمات کو مسائل کا مؤثر حل قرار دیتے ہوئے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو عملی زندگی میں نافذ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اسلام کا عائلی نظام توازن، حسن سلوک اور باہمی احترام پر قائم ہے، اور یہی عناصر ایک خوشحال اور مضبوط معاشرے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

6. معاصر خاندانی مسائل اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ان کا حل" فخرہ تحسین، العلم، جلد2 شمارہ1، 2018ء

اس ارٹیکل میں عصرِ حاضر میں خاندانی نظام کو درپیش چیلنجز کا تنقیدی جائزہ ہے اور ان کے اسلامی حل پیش کرتا ہے۔ مصنف نے نہایت مؤثر انداز میں اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ خاندان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے، جو فرد کی اخلاقی، سماجی اور دینی تربیت میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن جدید دور میں خاندانی نظام شدید بگاڑ کا شکار ہے، جہاں سماجی اور مذہبی اقدار کمزور ہو چکی ہیں۔

مصنف اس بگاڑ کی وجوہات میں اخلاقی انحطاط، مغربی اثرات، اور دینی شعور کی کمی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ تاہم، وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا کامل ضابطۂ حیات فراہم کرتا ہے جو خاندان جیسے حساس ادارے کو تحفظ دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت کو بطورِ نمونہ پیش کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ کیسے سیرتِ طیبہ کی روشنی میں طلاق، گھریلو ناچاقی، وراثت اور تربیتِ اولاد جیسے مسائل کا حل ممکن ہے۔

اگرچہ تحریر میں چند لسانی خامیاں موجود ہیں، لیکن پیغام نہایت توانا اور فکری طور پر مدلل ہے۔ یہ مضمون دراصل قاری کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ اپنے خاندانی ڈھانچے کو قرآن و سنت کی روشنی میں استوار کرے، تاکہ فرد، خاندان اور معاشرہ اصلاح کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

جوازِ تحقیق(Rationale of The Study)

سابقہ تحقیقی کام میں کوٹ ادوھ کے مرکز افتاء کے کردار، فتاویٰ نویسی کے آداب، صوبہ سرحد میں مراکز افتاء کا قیام اور اصولِ افتاء اور ہمارے عائلی مسائل، معاصر عائلی مسائل اور سیرت طیبہ کی روشنی میں انکا حل، کا جائزہ لیا گیا ہے، تاہم یہ تحقیقی موضوع متعدد پہلوؤں سے اس سابقہ کام سے مختلف ہے۔ اولاً، میں نے صرف ایک مرکز افتاء تک محدود رہنے کے بجائے ہر مسلک کے مرکزی مراکز افتاء کو اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے، جو اس موضوع کی

وسعت اور تنوع کو ظاہر کرتا ہے۔ دوم، میرا کام خاص طور پر معاصر عائلی مسائل پر مرکوز ہے، جب کہ سابقہ تحقیق میں ان مسائل پر موجودہ مراکز افتاء کے فتاویٰ کا جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ یوں میری تحقیق نہ صرف ایک منفرد زاویے سے کی گئی ہے بلکہ یہ معاصر حالات میں افتاءئی رہنمائی کی نوعیت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

بیان مسئلہ (Statement of the Problem)

پاکستانی معاشرہ عائلی سطح پر ایسے مسائل سے دوچار ہے جو نہ صرف مذہبی بلکہ قانونی اور سماجی پیچیدگیوں کے حامل ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے عوام دینی رہنمائی کے طور پر مراکزِ افتاء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تاہم ان مراکز افتاء کا کردار، افتائی اسلوب، فقہی مسالک کی بنیاد پر اختلاف، اور قانونی ہم آہنگی کی سطح جیسے پہلو ابھی تک واضح تجزیاتی مطالعے کے متقاضی ہیں۔ اس تحقیق میں منتخب پاکستانی مراکزِ افتاء کے اس کردار کو معاصر عائلی مسائل کے تناظر میں جانچنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ یہ ادارے صرف فتوے صادر کرنے والے مراکز ہیں یا وہ عائلی اصلاح، سماجی توازن، اور شرعی رہنمائی کے جامع نظام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مقاصد تحقیق (Objectives of the Study)

اس تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

1۔ پاکستان میں مراکز افتاء کا ارتقا اور تاریخی پس منظر کو سامنے لانا۔

2۔ پاکستانی عائلی قوانین اور شرعی احکام کی تطبیق میں مراکز افتاء کے کردار پر روشنی ڈالنا۔

3۔ معاصر عائلی مسائل کے حل میں پاکستانی مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ لینا۔

سوالات تحقیق (Research Questions)

1۔ پاکستان میں مراکز افتاء کے ارتقاء کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟

2۔ پاکستانی عائلی قوانین اور شرعی احکام کی تطبیق میں مراکز افتاء کی کردار کیا ہیں؟

3۔ معاصر عائلی مسائل کے حل میں پاکستانی مراکز افتاء کا کردار کیا ہیں؟

تحدید اور دائرہ کار موضوع (Limitations of the Study)

اس تحقیق کا دائرہ کار پاکستان میں موجود مراکز افتاء کا معاشرتی کردار ہے اور مقالہ نگار نے پاکستان کے ہر مسلک (دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور اہل تشیع) کے نمائندہ مراکز افتاء کا انتخاب کیا ہے۔

معاشرے میں موجود معاصر عائلی مسائل کے حل میں مذکورہ مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ لیا ہے۔

مقالہ نگار نے عائلی مسائل کے ملکی قوانین کا شرعی قوانین سے تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

1۔ دارالافتاء بنوری ٹاؤن کراچی

2۔ جامعہ نعیمیہ لاہور

3۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد

4۔ جامعۃ الکوثر، اسلام آباد

منتخب مراکز افتاء کے معاسر عائلی مسائل کے حل میں 2010ء سے 2024ء تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔

منہج تحقیق (Research Methodology)

اس تحقیق کا منہج بنیادی طور پر بیانیہ اور تجزیاتی ہے، لہٰذا درج ذیل چار مراکز افتاء کے فتاوی جات کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔

عائلی مسائل کو منتخب مراکز افتاء کے جوابات یعنی عائلی مسائل میں ان کے فتاوی جات کو بنیاد بنا کر تحقیق کی گئی ہے۔

اس حوالے سے منتخب مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مرکز افتاء بنوری ٹاؤن کراچی۔ مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور، مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد، مرکز افتاء جامعۃ الکوثر، اسلام آباد

اس تحقیقی کام میں نمل کے فارمیٹ کو مد نظر رکھا گیا ہے اور بنیادی و ثانوی مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

باب دوم

افتاء کا مفہوم، اہمیت اور پاکستانی مراکز افتاء کا تاریخی ارتقاء

فصل اول: افتاء: مفہوم، ضرورت اور اہمیت

فصل دوئم: مرکز افتاء: تعارف، مقاصد، اور ارتقاء

فصل سوئم: منتخب کردہ پاکستانی مراکز افتاء کا تعارف

فصل اول

افتاء کا مفہوم، ضرورت اور اہمیت

اسلامی شریعت خدائی احکامات کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رہنمائی کرکے انسانی زندگی کو منظم کرتا ہے۔ دنیوی زندگی میں ایک آدمی کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات کسی مسئلے کی درست سمت کو معلوم کرنے لیے اہلِ علم کے ساتھ رابطہ کرکے رہنمائی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ کسی بھی مسئلے سے متعلق دینی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے استفسار کرنے کو استفتاء کہا جاتا ہے، جب کہ اس مسئلہ سے متعلق عالمِ دین کی رائے کو فتوی کہا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم افتاء کی تعریف، اس کی اہمیت اور ضرورت پر تفصیل سے زیر بحث لایا جائے گا۔

افتاء کا مفہوم

یہ خالص عربی لفظ ہے جو بعض علماء لغت کے نزدیک (اَلْفُتُوَّةُ) سے ماخوذ ہے اور جسکے معنی ہیں: کرم، سخاوت مروت اور زور آوری۔ فتویٰ کو بھی فتویٰ اسی لیے کہتے ہیں کہ فتویٰ دینے والا مفتی اپنی فتوت یعنی سخاوت ومروت اور عالمانہ قوت سے کام لیتے ہوئے کسی دینی مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔[1]

افتاء اسم مصدر ہے اور عمومی طور پر افتاء فتویٰ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کی جمع فتاویٰ، فتاوِی آتی ہے اور جواب دینے کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی کسی بھی سوال کا جواب دینا خواہ وہ سوال احکام شریعت کے متعلق ہو یا کسی اور چیز کے متعلق۔

علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ:

الفُتْيَاوالفَتْوَى:الجواب عمّا يشكل من الأحكام، ويقال: اسْتَفْتَيْتَ فَافتاءنِي۔[2]

"فتویٰ اور فتیا مشکل احکام کے بارے میں دیئے جانے والے جواب کو کہتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ میں نے اس سے فتویٰ دریافت کیا تو اس نے مجھے فتویٰ دیا۔"

ابن الاثیر نے اس کے معنی کسی مسئلے کے بارے میں رخصت یا جواز پیش کرنے کے بتائے ہیں۔[3]

جبکہ بعض کے نزدیک فتوی دراصل (اَلْفَتِي) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں (اَلثَّابِتُ الْقَوِيُّ) چونکہ کسی حادثہ یا

---

[1] ۔ مصطفی بن عبد اللہ، الشہیر ب(حاجي خليفة) وب"(كاتب جلبي)، كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون، دار احیاء التراث بیروت، 1943، ص1218

[2] ۔ الأصفهاني، أبو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهانى، المفردات في غريب القرآن، دار القلم، بیروت 1412ھ:2073

[3] ۔ ابن الأثير، مجد الدين أبو السعادات المبارك بن محمد بن محمد بن محمد ابن عبد الكريم الشيباني الجزري، النهاية في غريب الحديث الناشر: المكتبة العلمية- بیروت، 1399ھ، ج1، ص199

واقعہ کے جواب میں پیش کیے جانے والے دینی مسائل کو مفتی اپنے دلائل سے قوت اور ثبوت مہیا کرتا ہے، اس لیے فتویٰ گویا اپنے دلائل سے قوت اور ثبوت مہیا کرتا ہے، اس لیے فتویٰ گویا مدلل ثبوت والا جواب ہوا۔

افتی فی المسئلۃ۔ [1]

شرعی حکم بیان کرنا۔

افتاء کی اصطلاحی تعریف

محققین علماء کے نزدیکافتاء کی اصطلاحی تعریف یوں ہے:

((إخبارٌ بحكم الله تعالى عن دليلٍ شرعي، لمنْ سألَ عنه في أمرٍ نازلٍ))۔[2]

((هوالاخباربحکم الله من مسئلۃدینیۃبمقتضی الدلالۃ الشرعیۃ علی جھۃ العموم والشمول))۔[3]

اورابو العباس شہاب الدین نے الفروق میں افتاء کی اصطلاحی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

اخبار حکم الله تعالیٰ فی الالزام والاباحۃ۔ [4]

اصطلاحی اعتبار سے فتوی کے معنی ہیں:

(("الجواب عن مسئلۃ دینیۃ"))[5]

کسی دینی مسئلہ کے بارے میں جواب دینا۔

((الإجابۃعن سؤال شرعی))۔[6]

یعنی شرعی احکام سے متعلق کسی سوال کا جواب دینا۔

لفظ فتوی جس مصدر کا حاصل ہے یعنی افتاء قرآن وحدیث میں کئی جگہ پر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے تو کئی جگہ پر اصطلاحی معنی میں۔ قرآن مجید میں جہاں لغوی معنی کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے جس کی مثال یہ ہے کہ ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا ٱلصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَٰتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ الخ﴾[7] اس آیت میں لغوی معنی کے اعتبار سے ذکر ہے جبکہ ﴿ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِقُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنّ ﴾"[8] اس آیت میں اصطلاحی معنی میں مستعمل ہے۔

ان تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ کسی سائل کو شرعی حکم بتادینا "فتوی" کہلاتا ہے۔

---

[1] ۔ قاسمی، مولانا حمید الزمان، کیرانوی، اصول الافتاء، ص10 ناشر ادارہ اسلامیات، 2001، ص1204

[2] ۔ خالد بن مساعد بن محمد الرویتع، التمذھب (دراسۃ نظریۃ نقدیۃ)، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، 2013، ج1ص246

[3]۔ الاساس الشرعی والقانون، ص128

[4] ۔ القرافی، أبو العباس شھاب الدین أحمد بن إدریس بن عبد الرحمن، الفروق لقرآفی: عالم الکتب، ج4ص53

[5] ۔ عثمانی، محمد تقی، اصول الافتاءوادابہ، ناشر: مکتبہ معارف القرآن کراچی، 2015، ص:10

[6] ۔ ایضاً

[7] ۔ یوسف:46

[8] ۔ النساء:127

مفتی کا لغوی و اصطلاحی معنی :

مفتی افتاء مصدر سے اسم فاعل ہے اور فتوی کے لغوی واصطلاحی معنی ک اعتبار سے مفتی کی تعریف بھی مختلف ہو گی لغوی معنی کے اعتبار سے مفتی کی تعریف ہےھوالمجیب عن سؤال یعنی کسی بھی سوال کا جواب دینے والا جبکہ اصطلاح کے اعتبار سے مفتی کی تعریف ہے "ھوالمجیب عن سؤال شرعی "یعنی شرعی احکام سے متعلق جواب دینے والا۔

افتاء کی ضرورت واہمیت

فتویٰ کی ابتداء اور ضرورت و اہمیت آج کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ فتویٰ کی تاریخ اُتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان خود ہے۔ ہر نبی اپنی اپنی امت کو ان کے شرعی سوالات کے جوابات دیتا رہا ہے۔ انبیاء کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ پر اختتام پذیر ہوا تو فتویٰ کی ذمہ داری راسخ العلم افراد کے سپرد ہو گئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاقَبْلَكَ إِلَّارِجَالاً نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُواْ أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ ﴾[1]

اور (اے حبیبِ مکرّم!) ہم نے آپ سے پہلے (بھی) مَردوں کو ہی (رسول بنا کر) بھیجا تھا ہم ان کی طرف وحی بھیجا کرتے تھے (لوگو!) تم اہلِ ذکر سے پوچھ لیا کرو اگر تم (خود) نہ جانتے ہو۔

اللہ عَزَّوَجَلَّ نے اپنے نبی ﷺ کو منصبِ افتاء سے سرفراز فرمایا اسکے بعد آپکے جانثار اصحاب رضی اللہ عنہم اس منصب جلیلہ عظیمہ پر فائز و متمکن ہوئے جن حضرات نے یہ ذمہ داری سنبھالی انکی تعداد 130 سے زائد بتائی جاتی ہے:

﴿وَالَّذِينَ حُفِظَتْ عَنْهُمْ الْفَتْوَى مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِائَةٌ وَنَيِّفٌ وَثَلَاثُونَ نَفْسًا﴾[2]

نبی ﷺ کے جن اصحاب سے فتاوی منقول و محفوظ ہیں، انکی تعداد ایک سو تیس (130) سے کچھ زائد ہے۔

دور صحابہ سے لیکر عہدِ تابعین تک جو بھی منصب فقہ و افتاء پر فائز ہوئے سب کے سب مجتہد اور مفتیِ مطلق تھے اور اقتضائے زمانہ کے ساتھ لوگوں کو درپیش نئے مسائل کے حل کرنے کیلئے مفتی کا ایک طرح کے اجتھاد سے متصف اور احوالِ ناس سے باخبر ہونا بھی لازم ولابدی ہے جیسا کہ حضرت علامہ شامی[3] قدس سرہ السامی فرماتے ہیں:

((التحقیق ان المفتی فی الوقائع لابدلہ من ضربِ اجتھادومعرفۃباحوال الناس))[4]

---

[1] ۔الانبیاء:21

[2] ۔ابن قیم الجوزیۃ، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين، إعلام الموقعين عن رب العالمين،: دار الكتب العلمية -بیروت 1991م، ج1ص 10

[3] ۔علامہ محمد امین ابن عابدین شامیؒ (وفات: 1252ھ / 1836ء) فقہِ حنفی کے متأخرین ائمہ میں ایک جلیل القدر فقیہ، اصولی، اور محقق عالم تھے۔ آپ کا تعلق دمشق (شام) سے تھا، جہاں آپ نے نہ صرف علمِ فقہ بلکہ حدیث، اصول، ادب اور فتویٰ نویسی میں بھی غیر معمولی مہارت حاصل کی۔ آپ نے فقہِ حنفی کی خدمت میں جو عظیم الشان علمی ورثہ چھوڑا، وہ آج بھی عالمِ اسلام میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کی سب سے مشہور تصنیف "ردالمحتار علی الدر المختار "ہے، جو فقہِ حنفی کی معروف کتاب "الدر المختار "کی شرح ہے، اور "شامی" کے نام سے معروف ہے۔ اس کتاب نے آپ کو ایسا علمی مقام عطا کیا کہ فقہِ حنفی میں آج بھی آپ کا قول قولِ مفتٰی بہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ابن عابدین، محمد امین۔ رد المحتار علی الدر المختار شرح تنویر الأبصار .بیروت: دار الفکر، 2000، ج1، مقدمہ)

[4] ۔شامی: ج2، ص298

سنن ابو داؤد میں ہے: اللہ کے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا تو ارشاد فرمایا: جب تمہارے سامنے مقدمہ پیش ہو گا تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ آپ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عرض گزار ہوئے کہ اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں بھی نہ پاؤ؟ آپ عرض گزار ہوئے کہ سنت نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میں تلاش کروں گا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "اگر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سنت میں نہ ملے اور نہ ہی قرآن میں ملے تو تب"؟ آپ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے فرمایا:

((أَجْتَهِدُرَأْيِي وَلَاآلُوفَضَرَبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ صَدْرَهُ وَقَالَ: الْحَمْدُلِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللَّهِ لِمَا يُرْضِي رَسُولَ اللَّهِ))[1]

البانی نے اس حدیث کو صعیف قرار دیا ہے۔[2]

میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور حقیقت تک پہنچنے میں کوتاہی نہ کروں گا۔ تو رسول صلی اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کے سینے کو تھپکا کر فرمایا: خدا کا شکر ہے جس نے رسول صلی اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بھیجے ہوئے شخص کو اس چیز کی توفیق بخشی جو اللہ کے رسول کو خوش کر دے۔

قرآن وحدیث سے فتوی کا ثبوت

فتوی علما یا فقہائے کرام کا اپنا ایجاد کردہ طریقہ یا عمل نہیں ہے، اس کا ثبوت براہ راست قرآن وحدیث سے ہے، قرآن وحدیث میں کسی جگہ مستقل فتوی کے لفظ سے فتوے کا ذکر ہے اور کسی جگہ لفظ سے فتوی مراد لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ﴾[3]

اور یہ لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیے اللہ انکے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾[4]

یہ لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں، کہہ دیجیے کہ اللہ "کلالہ" کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے

قرآن کی طرح احادیث میں بھی بکثرت فتویٰ کے معنی میں ذکر ہے، حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشادِ گرامی ہے :

((أَجْرَؤُكُمْ عَلَى الْفُتْيَا أَجْرَؤُكُمْ عَلَى النَّارِ)) ۔[5]

---

[1] ۔ السِّجِسْتاني، أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي، سنن أبي داود، الناشر: رحمانيہ لاہور، رقم الحديث:3592

[2] ۔ البانی، محمد ناصر الدین، سلسلہ الاحادیث الضعیفۃ، مکتبۃ المعارف، الریاض، رقم الحدیث؛881

[3] ۔ النساء:127

[4] ۔ النساء:176

[5] ۔ الدرامی، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن بن الفضل بن بَهرام بن عبد الصمد الدارمي، التميمي السمرقندي، مسند الدارمي المعروف بـ(سنن الدارمي)، دار المغني للنشر والتوزيع، باب الفتاوفيه من القتية، المملكة العربية السعودية، 2000، ج1، ص69،، رقم الحديث، 159

وضعفه الشيخ الألباني [1]
والحديث وإن كان ضعيفاًغيرأن معناه صحيح،فمن أقدم على الفتوى من غيرتثبت ولابحث في الأدلة فقد تسبب في إدخال نفسه النار۔[2]

تم سے فتویٰ دینے پر زیادہ جری شخص، جہنم میں جانے پر سب سے زیادہ جری ہے۔

فتوی کے اقسام

فتوی کی تین قسمیں ہیں

1۔ تشریعی فتاویٰ

2۔ فقہی فتاویٰ

3۔ جزئی فتاوی

1۔ تشریعی فتاوی

وہ فتاویٰ ہیں، جو شارع (اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ) کی جانب سے صادر ہوئے ہوں، یا تو قرآن کی وحی متلو کے ذریعے یا احادیث کی وحی غیر متلو کے ذریعے۔

یہ فتاوی عام طور پر نبی ﷺ کے دور مبارک میں کسی سوال کے جواب میں یا کسی فوری پیش آمدہ مسئلے کو بیان کرنے کے لیے صادر ہوئے اور پھر عام شرعی قاعدے بن گئے۔[3]

قرآن سے تشریعی فتوے کی مثال:

1۔ ﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾۔[4]

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں، کہہ دیجیے کہ اللہ "کلالہ" کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔

2۔ ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ-قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ-[5]

ترجمہ:لوگ آپ ﷺ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ ﷺ انہیں بتا دیجئے کہ یہ لوگوں کے مختلف معاملات اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لیے ہیں۔

3۔ ﴿ يسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِؕ-قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِۚ-فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ۪-وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾۔[6]

ترجمہ: آپ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور اللہ کے رسول کا، سو ڈرو اللہ

---

[1]۔ السلسلة الضعيفة.(1814) "

[2] ۔ فیض القدیر، کتاب الصلاۃ، باب فضل الآذان، ج 1، ص 205، رقم الحدیث 206۔

[3] ۔ مولانا، منصور احمد، فتوی، تعارف، اصول، آداب، ادارہ اسلامیات کراچی، 1436ھ، ص 31

[4] ۔ النساء:127

[5] ۔ البقرۃ:286

[6] ۔ الانفال،75

سے اور صلح کر و آپس میں، اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر ایمان رکھتے ہو۔

حدیث سے تشریعی فتوے کی مثال:

((عَنْ الزُّهْرِيِّ،قَالَ:خْبَرَنِي عُبَيْدُاللَّهِ بْنُ عَبْدِاللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ،أَنَّ عَبْدَاللَّهِ بْنَ عَبَّاسٍ،أَخْبَرَهُ:"أَنَّ سَعْدَبْنَ عُبَادَةَالْأَنْصَارِيّ،اسْتَفْتَى النَّبِيَّ ﷺ فِي نَذْرٍكَانَ عَلَى أُمِّهِ،فَتُوُفِّيَتْ قَبْلَ أَنْ تَقْضِيَهُ، فَافتاهُ أَنْ يَقْضِيَهُ عَنْهَا"،فَكَانَتْ سُنَّةً بَعْدُ)). ۔[1]

زہری سے روایت ہے کہ انہیں عبید اللہ بن عبد اللہ نے خبر دی، انہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی، انہیں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے ایک نذر کے بارے میں پوچھا جو ان کی والدہ کے ذمہ باقی تھی اور ان کی موت نذر پوری کرنے سے پہلے ہو گئی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں فتویٰ دیا کہ نذر وہ اپنی ماں کی طرف سے پوری کر دیں۔ چنانچہ بعد میں یہی طریقہ مسنونہ قرار پایا۔

فتوی کی یہ قسم خاتم النبیین ﷺ پر وحی کا سلسلہ مکمل ہو جانے کے بعد ختم ہو گئی۔

2۔ فقہی فتاوی

وہ فتویٰ ہے کہ فقہاء میں سے کوئی فقیہ اسکا اظہار کرتا ہے، لیکن وہ کسی مخصوص واقعے کے متعلق سوال کے جواب میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ مختلف تفریعات کے ضمن میں ہوتا ہے، یا کسی عمومی سوال کے جواب میں، جس کا تعلق کسی متعین جزئی واقعہ سے نہیں ہوتا، اور یہ اس فقیہ و مفتی کا طریقۂ کار ہوتا ہے، جو مسائل فقہیہ کی تدوین کرتا ہے۔

لہٰذا وہ ایسی جزویات کا تصور کرتا ہے، جس کے بارے میں اس سے سوال نہیں کیا گیا اور پھر وہ ان کے احکام شریعت دلائل سے مستنبط کرتا ہے، اور ایسے فتوے کو وہ کسی کتاب یا رسالے میں بیان کرتا ہے یا کسی عمومی سوال یا فرضی سوال کے جواب میں بیان کرتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی فقیہ سے پوچھا جائے کہ اس شخص کا کیا حکم ہے جو اپنی بیوی کو "سر حتکِ" کہے اور اس سوال میں کسی متعین واقعے کا حوالہ نہ دیا گیا ہو۔

((فإذاقال"رہاکردم"أي سرحتک يقع به الرجعي مع أن أصله کنايةأيضًاوماذاک إلالأنه غلب في عرف الناس استعماله في الطلاق))۔ [2]

3۔ جزئی فتاوی

اس سے مراد وہ فتویٰ ہے جس میں کسی متعین واقعے کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے، اس طرح کے فقہ کے کسی کلی حکم کو جزئی واقعے پر منطبق کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ مفتی یا عالم دین سے کسی متعین شخص کے بارے میں یہ سوال کیا جائے کہ اس نے اپنے ورثاء میں والدین، ایک بیوی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑی ہیں، اب اس

---

[1] ۔ بخاری، اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ صحیح البخاری، کتاب الایمان والنذر، باب من مات وعلیہ نعذ، الناشر، دارالاشاعت، کراچی، 2009، رقم الحدیث 6698

[2] ۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقي الحنفي، رد المحتار علی الدر المختار، ایچ ایم سعید، 2009، ج4، ص:530

کے ترکے کو کیسے تقسیم کیا جائے گا؟ مفتی اس سوال کے جواب میں جو جواب دے گا اس کو جزئی فتوی کہا جائے گا۔ اکثر و بیشتر افتاء کے لفظ کا اطلاق اس آخری قسم پر ہوتا ہے۔[1]

افتاء اور قضاء میں فرق

فتوی سے قریبی اصطلاح قضاء کی ہے، کیوں کہ مفتی بھی حکم شرعی کو بیان کرتا ہے اور قاضی بھی، اس لیے اہل علم نے ضرورت محسوس کی کہ قضاء اور افتاء کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل فرق بیان کئے گئے ہیں:

1۔ مفتی کسی حکم کے بارے میں خبر دیتا ہے اور قاضی متعلق اشخاص کو اس کا پابند کرتا ہے اور اس پر اس کو لازم قرار دیتا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

((لافرق بین المفتی والحاکم إلاأن المفتی مخبربالحکم و القاضی ملزم بہ))[2]

"مفتی اور حاکم (قاضی) کے درمیان کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ مفتی حکم کے بارے میں خبر دیتا ہے اور قاضی اس کو لازم قرار دیتا ہے"

اسی لیے مستفتی پر کسی خاص شخص کا فتوی لازم نہیں ہوتا، اگر وہ چاہے تو وہ اس پر عمل کرے اور چاہے تو کسی دوسرے مفتی سے فتوی لے لے، لیکن قاضی کا فیصلہ اس پر واجب الطاعت ہوتا ہے۔[3] اسی لیے اگر کسی معاملہ کے دو فریق میں سے ایک نے کسی مفتی سے رجوع کیا ہو تو اسے اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر اس نے کسی قاضی سے رجوع کیا ہو تو دوسرے فریق کو بھی اس سے رجوع کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔[4] یوں تو قضاء اور افتاء کے درمیان فرق کے اور بھی کئی وجوہ ہیں لیکن دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے، جس کا علامہ شامیؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

2۔ علامہ حصکفیؒ نے بزازیہ کے حوالہ سے ایک فرق یہ بھی کیا ہے کہ مفتی دیانت اور باطن کے اعتبار سے بھی فتوی دیتا ہے، لیکن قاضی ظاہر کے اعتبار سے ہی فیصلہ کرنے کا مکلف ہے، مثلاً: کسی شخص نے مفتی سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو کہا تھا کہ: "تو طلاق یافتہ ہے" "أنت طالق"، اور کہے کہ میرا مقصد انشاء طلاق نہیں تھا، بلکہ میرا مقصود جھوٹی خبر دینا تھا، تو مفتی طلاق واقع نہ ہونے کا فتوی دے گا، لیکن قاضی وقوع طلاق کا فیصلہ کرے گا۔[5]

3۔ علامہ ابن قیمؒ نے ایک فرق یہ بھی لکھا ہے کہ مفتی کے فتوی کی حیثیت عمومی نوعیت کی ہوتی ہے، مستفتی

---

[1] ۔ مولانا، منصور احمد، فتوی، تعارف، اصول، آداب، ادارہ اسلامیات کراچی، 1436ھ، ص:34

[2] ۔ ابن عابدین، محمد أمین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقي الحنفي، شرح عقود رسم المفتی، مکتبہ سعیدہ، سہارنپور: ص:27

[3] ۔ إعلام الموقعین عن رب العالمین: 1/ 26، شهاب الدین أبو العباس أحمد بن ادریس القرافي، المالکي، الاحکام في تمییز الفتاوی من الأحکام للقرافی، مکتبۃ الانوار، 1938ء، ص:20

[4] . الزرکشي، أبو عبد الله بدر الدین محمد بن عبد الله بن بهادر، البحر المحیط في أصول الفقه: دار الکتبي، 1994 ج6، ص315

[5] . رد المحتار علی الدر المختار: 4ج306

بھی اس پر عمل کر سکتا ہے اور دوسرے لوگ بھی، قاضی کا فیصلہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہوتا ہے، دوسرے واقعات میں بطور خود اس کو جاری نہیں کیا جاسکتا۔[1]

4۔ افتاء کا دائرہ بمقابلہ قضاء کے وسیع ہے، کیوں کہ قضاء کا تعلق بنیادی طور پر مصالح دنیا سے ہے اور افتاء کا تعلق مصالح دنیا سے بھی ہے اور مصالح آخرت سے بھی،[2] اسی لیے فتوی معاملات کے علاوہ عبادات اور آداب وغیرہ کے بارے میں بھی دیئے جائیں گے، لیکن مخصوص مواقع کے سوا عبادات جیسے: "نماز روزہ کا درست ہونا اور نہیں ہونا" کے بارے میں فیصلہ کرنا قاضی کا کام نہیں۔

5۔ ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ قاضی کا فیصلہ بہر حال واجب الطاعت ہے خواہ وہ فریقین کے مسلک فقہی کے موافق ہو یا خلاف، اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ قضاء قاضی رافع خلاف ہوتا ہے، یعنی جس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہو، کسی خاص مسئلہ میں جب قاضی فیصلہ کردے تو وہی فریقین کے لیے واجب العمل ہوتا ہے، جبکہ فتوی کا معاملہ اس سے مختلف ہے، اگر مستفتی کسی اور فقہ کا مقلد ہو اور مفتی کسی اور فقہ کا، اور مفتی اپنی فقہ کے مطابق جواب دیدے تو مستفتی کے لیے اس پر عمل کرنا لازم نہیں۔[3]

افتاء اور اجتہاد

متقدمین کے یہاں مفتی وہی ہوتا تھا جو مجتہد ہوتا تھا؛ اسی لیے اصولیین کی ایک جماعت غیر مجتہد کے لیے فتوی دینے کو جائز ہی نہیں کہتی ہے،[4] البتہ متأخرین نے افتاء کے دائرہ کو وسیع کر دیا، اور ایسے لوگ جو خود مجتہد نہ ہوں لیکن فقہاء کے اجتہادات سے واقف ہوں ان کیلئے بھی فتوی دینے کی گنجائش فراہم کی، یا یوں کہئے کہ فتاوی کی نقل و حکایت کو فتوی سے تعبیر کیا جانے لگا، اس لیے فتوی اور اجتہاد کے درمیان فرق کو بھی پیش نظر رکھنا مناسب ہوگا:

1۔ افتاء کا تعلق سوال سے ہے، عام طور پر جب کوئی سوال سامنے آتا ہے تو مفتی اس کا جواب دیتا ہے، اجتہاد کے لیے سوال ضروری نہیں ہے، بہت سے ایسے مسائل کے بارے میں بھی اجتہاد کیا جاتا ہے، جن کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا گیا ہو، بلکہ جو واقعات ابھی پیش ہی نہ آئے ہوں۔

2۔ جو قطعی احکام ہیں ان میں اجتہاد کا دخل نہیں، لیکن فتوی احکام قطعیہ کے بارے میں بھی دیا جاتا ہے اور

---

1. إعلام الموقعين عن رب العالمين: ج1، ص38

2. القرافي، شهاب الدين أبي العباس أحمد بن إدريس بن عبد الرحمن الصنهاجي، تهذيب الفروق بهامش الفروق، عالم الكتب للطباعة والنشر والتوزيع 1990، ج4، ص95

3. الشيخ حسين محمد، الملاح الفتوى نشأتها وتطورها اصولها وتطبيقاتها، المكتبة العصرية، بيروت، ج1، ص401، الزركشي، البحر المحيط، ج6 ص316، الموسوعة الفقهية الكويت، ج21 ص32

4 ۔ سيف الدين، أبو الحسن، علي بن محمد الآمدي، الإحكام في أصول الأحكام، الناشر: مؤسسة النور بالرياض، سنة1387ھ، ج4، ص241

احکام ظنیہ کے بارے میں بھی۔

3۔ اجتہاد احکام کو دریافت کرنے کا نام ہے اور افتاء دریافت شدہ احکام کو ضرورت مند مستفتی تک پہنچانے کا نام ہے۔

4۔ اجتہاد کی حیثیت ایک عام کلی کی ہوتی ہے اور فتوی اکثر اوقات کسی خاص واقعہ سے متعلق ہوتا ہے، اسی پس منظر میں مفتی کو مستفتی کی نفسیات اور اسکے ماحول سے واقفیت کی اور بعض مرتبہ اس سے استفسار کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی لیے فقہاء نے بعض ابواب جیسے "ایمان" وغیرہ کے بارے میں کہاہے کہ جو اس شہر کا باشندہ ہو یا وہاں کی بول چال اور محاورات سے واقف ہو، اسی کو اس بارے میں فتوی دینا چاہئے، چنانچہ امام نووی ؒ[1] فرماتے ہیں:

((لایجوزأن یفتی في الأیمان والإقراروںحوھمامایتعلق بالألفاظ إلاأن یکون من أھل البلد اللافظ أومتنزلا منزلتھم في الخبرة بمراد ھم من ألفاظھم و عرفھم فیھا))[2]

ایمان، اقرار اور اس طرح کے امور جو الفاظ سے متعلق ہیں، میں اسی کے لیے فتوی دینا جائز ہے جو بولنے والے کے اہل شہر میں سے ہو، یا کم سے کم اہل شہر ہی کی طرح ان کی تعبیرات اور بول چال کے عرف سے واقف ہو فتاوی کے نام سے مطبوعہ کتابیں بہت سی کتابیں فتاوی کے نام سے چھپی ہوئی ہیں، جیسے خلاصۃ الفتاوی، فتاوی ابو اللیث سمرقندی، فتاوی ہندیہ اور فتاوی قاضیخان وغیرہ عام طور پر لوگوں کو اچنبھا ہوتا ہے کہ ان میں سوال وجواب نہیں لیکن انہیں "فتاوی" کا نام دیا گیاہے۔ اصل یہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں فتاوی اور واقعات کی ایک خاص اصطلاح ہے، اور وہ یہ کہ استناد و اعتبار کے لحاظ سے کتابوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیاہے، اول درجہ امام محمد ؒ کی چھ کتابوں کا ہے، جنھیں ظاہر روایت کہا جاتا ہے، دوسرا درجہ امام صاحب کے شاگردوں کی تالیفات اور خود امام محمد ؒ کی ظاہر روایات کے علاوہ دوسری کتابوں کا ہے، ان کو "نوادر" کہتے ہیں، جن احکام کی بابت امام صاحب اور آپ کے تلامذہ کی رائے منقول نہیں ہے، بلکہ بعد کے مشائخ اور اہل علم نے ان میں استنباط و استخراج سے کام لیا ہے، ان مسائل کو فتاوی اور واقعات سے تعبیر کرتے ہیں، ان مشائخ میں ابو عصمہ ؒ، عصام بن یوسف ؒ، محمد بن سماعہ ؒ، ابو سلیمان جوزجانی ؒ، ابراہیم بن رستم مروزی ؒ اور بعد کے اہل علم ہیں۔ فتاوی کے نام سے جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ظاہر روایت اور نوادر کے علاوہ بعد کے مشائخ کے اقوال کو بھی نقل کرنے کا اہتمام کیا گیاہے، اسی عموم کی وجہ سے ان کو فتاوی کہتے ہیں، گویا یہ ایک الگ اصطلاح ہے، اس سے فتاوی کی اصولی اصطلاح مراد نہیں ہے۔

---

[1] ۔ امام نووی ؒ کا اصل نام یحیٰ بن شرف بن مُری بن حسن نووی دمشقی شافعی ؒ (631ھ–676ھ) ہے۔ آپ ساتویں صدی ہجری کے عظیم محدث، فقیہ، مفسر، اور زاہد عالم تھے۔ آپ کا تعلق نوٰی نامی ایک قصبے سے تھا جو دمشق (شام) کے قریب واقع ہے، اسی نسبت سے آپ "نووی ؒ" کہلاتے ہیں۔

آپ نے بہت کم عمر میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کر کے علم، عمل، زہد، اور ورع میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔ آپ کا شمار ائمہ شافعیہ کے جلیل القدر محدثین وفقہاء میں ہوتا ہے۔ آپ کی زندگی قناعت، سادگی، عبادت اور مسلسل علمی خدمت سے عبارت تھی۔

[2]. النووی، یحیی بن شرف النووي محي الدین أبوزکریا، مقدمۃ المجموع شرح المھذب، مکتبۃ الارشاد، مملکۃ السعودیۃ، ج1 ص80، مقدمہ

فصل دوم

مرکز افتاء: تعارف، مقاصد اور ارتقاء

مرکزِ افتاء اسلامی تعلیمات کے فروغ اور امت مسلمہ کی رہنمائی کا ایک اہم ادارہ ہے، جو شرعی مسائل کا حل پیش کرنے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دین اسلام کی روشنی میں رہنمائی فراہم کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ فقہِ اسلامی کے اصولوں کو بنیاد بنا کر فتاویٰ جاری کرتا ہے، تاکہ افراد اور معاشرہ دینی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔ اس فصل میں مرکزِ افتاء کا تعارف، فتویٰ جاری کرنے کا طریقہ کار، اور اس کے مقاصد کے ساتھ ساتھ مرکز افتاء کے ارتقاء کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔

مرکز افتاء کا تعارف

مرکز افتاء ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے جہاں ماہر علماء اور مفتیانِ کرام اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عوام کو دینی، شرعی اور فقہی مسائل کا حل فراہم کرتے ہیں۔ یہ مراکز اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق فتاویٰ جاری کرنے اور لوگوں کو انکے روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے دینی مسائل پر رہنمائی فراہم کرنے کیلئے قائم کیے جاتے ہیں۔

مرکز افتاء میں تجربہ کار علماء اور مفتیانِ کرام موجود ہوتے ہیں جو اسلامی فقہ، قرآن و سنت کی بنیاد پر شرعی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ یہ علماء اسلامی قانون میں گہری مہارت رکھتے ہیں اور ان کا فتویٰ عام طور پر قابل قبول اور معتبر سمجھا جاتا ہے۔ یہ مراکز عوام کو دینی مسائل میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں، جن میں عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج)، مالی معاملات، نکاح و طلاق، وراثت، تجارت، اور خاندانی مسائل شامل ہوتے ہیں۔ مرکز افتاء کے ذریعے مسلمانوں کو شرعی احکام کے مطابق اپنے معاملات حل کرنے کا موقع ملتا ہے۔

نیز مرکز افتاء کا ایک اہم کردار جدید دور میں پیش آنے والے نئے مسائل کا شرعی حل فراہم کرنا ہے۔ یہ مسائل ٹیکنالوجی، میڈیکل سائنس، معیشت، اور دیگر جدید علوم سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ مفتیانِ کرام ان مسائل پر تحقیق کرتے ہیں اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا حل تجویز کرتے ہیں۔

فتویٰ جاری کرنے کا طریقہ کار

مرکز افتاء میں جب کوئی شخص یا ادارہ کسی دینی یا شرعی مسئلے پر رہنمائی چاہتا ہے تو وہ اپنے سوالات مفتیانِ کرام کے سامنے رکھتا ہے۔ علماء ان سوالات پر قرآن و سنت اور اسلامی فقہ کی روشنی میں غور کرتے ہیں اور پھر شرعی طور پر اس کا جواب (فتویٰ) دیتے ہیں۔ یہ فتویٰ زبانی یا تحریری صورت میں جاری کیا جاتا ہے۔

فتاویٰ کی اجرائی اور علمی خدمات

مرکز افتاء امت مسلمہ کو مختلف موضوعات پر رہنمائی فراہم کرتا ہے، جن میں عقائد، عبادات، خاندانی مسائل، مالی و تجارتی امور، اور معاشرتی و سیاسی مسائل شامل ہیں۔ یہ مراکز نہ صرف فتاویٰ جاری کرنے میں مصروف ہیں بلکہ دینی علوم کی ترویج اور تحقیق میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

یہ ادارے اسلامی فقہ اور شریعت کے اصولوں کی تشریح کرتے ہیں تاکہ امت مسلمہ کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شرعی رہنمائی فراہم کی جاسکے۔ جدید دور کے چیلنجز کے پیش نظر، مرکز افتاء دین کی روشنی میں مسائل کا حل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو مؤثر اور قابلِ عمل بنانے میں بھی مصروفِ عمل ہے۔

مراکز افتاء کے مقاصد

1. شرعی رہنمائی

مرکز افتاء کا بنیادی مقصد لوگوں کو ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی اصولوں کے مطابق رہنمائی فراہم کرنا ہے، تاکہ وہ اپنے مسائل کا حل قرآن و سنت کے مطابق حاصل کر سکیں۔

2. معاشرتی استحکام

یہ مراکز خاندانی اور معاشرتی مسائل کو شرعی اصولوں کے مطابق حل کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں جس سے معاشرتی استحکام پیدا ہوتا ہے اور اسلامی اصولوں پر مبنی عدل و انصاف کا قیام ہوتا ہے۔

3. دینی شعور اور آگاہی

مراکز افتاء عوام میں دینی شعور بڑھانے اور اسلامی احکام کو صحیح طریقے سے سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ عوام کو حلال و حرام، عبادات، اور دیگر مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

4. اجتہاد اور تحقیق:

مرکز افتاء کا ایک اور اہم مقصد اسلامی اجتہاد کو فروغ دینا ہے، یعنی نئے مسائل پر غور و فکر اور انکا حل تلاش کرنا۔ یہ مراکز اجتہاد کے ذریعے اسلامی شریعت کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

پاکستان میں مراکز افتاء اور فتوی نویسی کا ارتقاء

پاکستان میں فتویٰ نویسی کا سلسلہ پاکستان بنتے ہی کسی حد تک شروع ہو گیا تھا۔ جب علماء ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے۔ جگہ جگہ مساجد و مدارس قائم ہوئے اور علماء کرام نے باقاعدہ مراکز افتاء اور فتوی نویسی کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ اصل میں ہندوستان سے یہاں منتقل ہوا تھا مسلمانوں سے غیر مسلموں نے بھی استفسارات کیے ہیں، چنانچہ اس قسم کے استفسارات کا حال بزرگ بن سہریا کی کتاب "کتاب الہند" سے معلوم ہوتا ہے ہندوپاک کے مسلمان

بادشاہوں کو فقہ اسلامی سے خاص دلچسپی تھی سلطان محمود غزنوی زبردست فقیہ تھے۔ انہوں نے "التفرید فی الفروع "نامی کتاب لکھی جس میں فتاویٰ اور فقہی مسائل ذکر کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ظہیر الدین بابر نے بھی اصول مذاہب پر ایک کتاب لکھی تھی ان میں مسلمان بادشاہوں نے فتاویٰ فیروز شاہی، فتاویٰ ابراہیم شاہی، فتاویٰ اکبر شاہی، فتاویٰ عادل شاہی، فتاویٰ، فتاویٰ تاتارخانی اور فتاویٰ عالمگیری میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان تمام تر فتاوجات میں فتاویٰ عالمگیری کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں عالمگیر نے مولانا عبید اللہ رومی سے اس کا فارسی ترجمہ کروایا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا امیر علی لکھنوی ہندوستان میں اس حوالے سے شافعی علماء کا بھی کام موجود ہے؛ مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی سلسلہ آگے چل کر پاکستان میں منتقل ہوا۔ ابتداء یہاں کچھ مدارس موجود تھے جن کے نام یہ ہے جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، جامعہ دارالعلوم امجدیہ کراچی، جامعہ خیر المدارس ملتان [1]، اور جامعہ دارالعلوم کراچی (1948) [2]، یہ تمام مدارس تقریبا [3] 1947 میں قیام پاکستان کے ایک ماہ بعد قائم ہوا۔ مگر ان مدارس میں باقاعدہ دار الافتاء کا انتظام موجود نہیں تھا۔

ذیل کی سطور میں پاکستان کے چند علماء کرام کے فتاویٰ کے نام تحریر کیے جاتے ہیں:

احسن الفتاوی (مفتی رشید احمد لدھیانوی)	امداد الاحکام (مولانا ظفر احمد عثمانی)
امداد الفتاوی (مولانا اشرف علی تھانوی)	الفتاوی (قاضی محمد ایوب)
فتاوی اجمالیہ (مفتی اجمل قادری رضوی)	فتاوی اویسیہ (مفتی فیض احمد اویسی)
فتاوی حامدیہ (مولانا حامد رضا خان)	فتاوی حقانیہ (مجموعہ فتاوی جامعہ حقانیہ)
فتاوی رحیمیہ (مفتی عبد الرحیم)	فتاوی رشیدیہ (مولانا رشید احمد گنگوہی)
فتاوی عثمانی (مفتی محمد تقی عثمانی)	فتاوی عثمانیہ (مجموعہ فتاوی جامعہ عثمانیہ)
فتاوی قاسمیہ (مفتی شبیر احمد قاسمی)	فتاوی قاضی (مجاہد الاسلام قاسمی)
فتاوی کبیر (مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)	فتاوی مفتی محمود (مفتی محمود)
فتاوی مہریہ (پیر مہر علی شاہ)	فتاوی نعیمیہ (احمد یار خان نعیمی)
فتاوی مظاہر علوم (مولانا خلیل احمد سہارنپوری)	فتاوی نظامیہ (نظام الدین حنفی)
فتاوی دارالعلوم کراچی (مفتی رفیع عثمانی)	خیر الفتاوی (مولانا خیر محمد جالندھری)
کتاب الفتاوی (مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)	نوادر الفقہ (مفتی رفیع عثمانی)

[1] ۔ مفتی انور، مرتب، خیر الفتاوی، مقدمہ، ج1، ص8

[2] ۔ عثمانی، محمد رفیع، مفتی، فتاوی دارالعلوم، ناشر: ادارۃ المعارف کراچی، ص50

[3] ۔ حقانی، مختار اللہ، مقدمہ، ناشر جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، 2002ء، ج1، ص4

آپ کے مسائل اور ان کا حل (مولانا یوسف لدھیانوی) آپ کے مسائل کا حل (مفتی محمد)۔

ان کے علاوہ بھی بے شمار کتب فتاویٰ ہیں، جو یا تو غیر مطبوعہ ہیں یا ایک ہی مرتبہ شائع ہوئے۔ اسی طرح، دورِ حاضر میں بھی پاکستان میں فتاویٰ کا کام جاری ہے، اور اکابر علمائے کرام کے فتاویٰ مختلف کتب خانوں سے چھپ کر منظر عام پر آرہے ہیں۔

یہ فتاویٰ دراصل انیسویں اور بیسویں صدی کی مختلف علمی و فکری تبدیلیوں، سماجی فسادات، مسلم معاشرت، سائنسی و صنعتی ترقیات اور انگریزی ثقافت کے اثرات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان فتاویٰ میں پاکستان کے ادب کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان فتاویٰ کے مجموعوں کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ان فتاویٰ کا گہرائی سے جائزہ لیں تو ہمیں ان کے انداز میں خاص طور پر چند اہم نکات نظر آتے ہیں جو ان دور کی مخصوص خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ یہ فتاوی حقیقت میں مسلم معاشرہ کے اقتصادی، معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخصوص معاشرہ کے لوگ ایک خاص وقت اور حالات میں کن مسائل ومشکلات کے شکار تھے ؟ ہر دور کے فتاویٰ میں اس دور کی خصوصیات اور حالات کی جھلک ملتی ہے۔ ان فتاویٰ میں معاشرتی تبدیلیوں اور علمی و فکری اختلافات کی نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے، اور اس دور کے اہل علم نے ان مسائل کے حل کے لیے کس طریقے سے سوچا اور کس بنیاد پر فیصلے کیے۔ اس کے علاوہ، ان فتاویٰ نے مسلم معاشرت پر کس طرح گہرے اثرات مرتب کیے۔

2۔ کتاب اللہ و سنت نبوی اور فقہی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

3۔ اکثر عبارتیں بغیر ترجمے کے دی گئی ہیں، جو عام مستفتی کے لیے ایک غیر مانوس طریقہ ہے۔

4۔ بعض فتاویٰ میں جدید مسائل کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے، جبکہ دیگر فتاویٰ میں جدید مسائل پر نہ صرف بحث کی گئی ہے بلکہ معاصر اہل علم کی آراء کو بیان کرتے ہوئے دلائل کا علمی محاکمہ بھی کیا گیا ہے، اور عقلی و نقلی دلائل کے ذریعے ان مسائل کا قابل قبول اور قابل عمل حل پیش کیا گیا ہے۔

5۔ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی قدیم فتاویٰ کی پیروی کی گئی ہے۔

6۔ ان فتاویٰ میں اپنے پیش رو فتاویٰ کا حوالہ بھی ملتا ہے۔[1]

پاکستان میں مرکز افتاء کا باضابطہ ابتداء

دارالعلوم کراچی کی علمی خدمات میں ایک عظیم اضافہ یہ ہے کہ تخصص فی الافتاء کا باقاعدہ آغاز سب سے

[1] - بصائر و عبر: ج،1، ص16-17-

پہلے یہیں ہوا۔ یہ حقیقت شاید آج بہت سے حضرات کو معلوم نہ ہو کہ برصغیر پاک وہند میں سب سے پہلا منظم اور مستقل شعبۂ تخصص فی الافتاء دارالعلوم کراچی ہی میں قائم کیا گیا۔ اس سے پہلے پورے برصغیر میں اس نوعیت کا کوئی باقاعدہ تعلیمی اور تربیتی نظام موجود نہ تھا۔[1]

دارالعلوم کراچی کا باقاعدہ آغاز نانک واڑے میں 1951ء کے اوائل میں ہوا، لیکن اس کی عملی دینی خدمات کا آغاز اس سے قبل "مدرسہ امدادالعلوم" کے نام سے آرام باغ سے متصل جامع مسجد باب الاسلام میں ہو چکا تھا۔ وہاں پہلے سے قرآنِ کریم حفظ وناظرہ کا ایک مکتب قائم تھا، جس کی نگرانی محلہ والوں نے حضرت مفتی محمد شفیعؒ کے سپرد کر دی تھی۔ اسی مکتب میں مفتی محمد رفیعؒ نے اپنے حفظِ قرآن کے بقیہ اجزاء مکمل کیے۔

مزید بر آں، عوامی خواہش پر حضرت مفتی شفیعؒ نے روزانہ نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن کریم کا آغاز فرمایا، جو جلد ہی عوامی سطح پر ایک دینی تحریک کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسی مسجد کے مرکزی دروازے پر ایک کمرہ تعمیر کر کے دارالافتاء قائم فرمایا گیا، جو اس وقت نہ صرف کراچی بلکہ پورے پاکستان میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ تھا، کیونکہ اس دور میں ملک بھر میں دارالافتاء کی تعداد بمشکل دو تین تھی۔ حضرت مفتی شفیعؒ نے یہاں دیے گئے فتاویٰ کی نقول محفوظ رکھنے کا بھی اہتمام فرمایا، جو آج تک دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء میں محفوظ ہیں۔[2] ان مراکزِ افتاء کے طرز پر مختلف چھوٹے اور بڑے شہروں میں بھی فتویٰ نویسی کے مراکز قائم ہو گئے۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں کروڑوں کی تعداد میں فتاویٰ صادر ہوئے، جو اردو، عربی، انگریزی، فارسی، ہندی، پشتو اور دیگر زبانوں میں شائع ہوئے، اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ان فتاویٰ میں سے اکثر وقت کے ساتھ ضائع ہو چکے ہیں، اور جو کچھ محفوظ رہ سکے ہیں ان میں بھی بڑی تعداد مطبوعہ شکل میں دستیاب نہیں۔ جو فتاویٰ زبانی طور پر جاری کیے گئے، ان کا شمار ممکن ہی نہیں۔

آج کے دور میں فتویٰ نویسی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ فون اور دیگر جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی مستفتی حضرات اپنے مسائل مفتیانِ کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور وہ قرآن وسنت کی روشنی میں جوابات فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح فنِ افتاء کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم ہو رہا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں فتویٰ

پاکستان میں آزادی کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ملکی قوانین کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ اس مقصد کے تحت کئی ادارے قائم کیے گئے جن میں اہم ترین ادارے درج ذیل ہیں:

1. ادارہ تحقیقات اسلامی (پاکستان)

---

[1] فتاوی دارالعلوم کراچی، ص50

[2] ۔ مولانا محمد طیب، دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، بھارت: دارالعلوم دیوبند، 1965ء ص، 30-

2. اسلامی نظریاتی کونسل (پاکستان)[1]

ان اداروں کے علاوہ دیگر کئی ادارے بھی جدید مسائل پر تحقیق اور فتاویٰ دینے کا عمل جاری رکھتے ہیں، اور ان کی اجتماعی فتاویٰ یا قرار دادیں وقتاً فوقتاً شائع کی جاتی ہیں۔ ان اداروں کے باوجود دینی مدارس میں بھی فتاویٰ دیئے جاتے ہیں، جو عوامی سطح پر لوگوں کی رہنمائی کا باعث بنتے ہیں اور بعض صورتوں میں عدالتی نظام میں قابل قبول ہوتے ہیں۔ تاہم عملی طور پر ان فتاویٰ کا عدالتی نظام میں بہت زیادہ کردار نہیں ہے، لیکن اسکے باوجود عوام ان فتاویٰ پر گہرا اعتماد کرتے ہیں اور انہیں اہمیت دیتے ہیں۔ مراکز افتاء میں علماء اور مفتیان کرام فتوی نویسی کا عمل ہمیشہ سے خالصاً رضائے الٰہی کیلئے اور بغیر کسی معاوضے کے سرانجام دیتے رہے ہیں۔ یہ عمل دینی خدمات کا ایک اہم حصہ ہے جس کے ذریعے لوگوں کی روحانی رہنمائی کیجاتی ہے اور دین اسلام کے اصولوں کی روشنی میں انکے مسائل حل کیے جاتے ہیں۔

اس طرح سے یہ ادارے اور مراکز افتاء ملکی قوانین اور عوامی مسائل کی رہنمائی کے لیے ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں، جس کا مقصد اسلامی اصولوں کے مطابق ایک بہترین معاشرتی نظام قائم کرنا ہے۔

---

[1] ۔ **اسلامی نظریاتی کونسل کا تعارف:**

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کا ایک آئینی ادارہ ہے جو دستورِ پاکستان کے تحت قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے تمام موجودہ قوانین اور مجوزہ بلز کا قرآن و سنت کی روشنی میں جائزہ لے اور حکومت کو سفارشات دے کہ ان قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق کیسے بنایا جائے۔

آئینی بنیاد

اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کی بنیاد دستورِ پاکستان 1973ء کا آرٹیکل 228 تا 231 ہے۔ دستور کے مطابق": صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک کونسل تشکیل دیں گے جسے اسلامی نظریاتی کونسل کہا جائے گا۔ یہ کونسل صدر، گورنر یا اسمبلیوں کی طرف سے بھیجے گئے کسی بھی بل، قانون یا مسئلے پر قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی رائے دے گی اور اس امر کی سفارش کرے گی کہ پاکستان میں موجودہ قوانین کو کس طرح اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے۔"

مقاصد و فرائض:

1. تمام قوانین کا قرآن و سنت سے مطابقت کا جائزہ لینا۔
2. ایسے قوانین کی نشاندہی کرنا جو قرآن و سنت کے منافی ہوں۔
3. اسمبلیوں کو سفارش کرنا کہ متنازعہ قوانین میں ترمیم یا تنسیخ کی جائے۔
4. حکومت کو نئے قوانین کی تیاری میں شرعی رہنمائی فراہم کرنا۔
5. عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی کے مسائل پر رہنمائی دینا۔

ساخت:

- کونسل میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء، ماہرینِ قانون، اور محققین شامل ہوتے ہیں تاکہ اسے نمائندہ ادارہ بنایا جاسکے۔
- آئین کے مطابق کونسل کے اراکین کی تعداد 8 سے 20 کے درمیان ہوسکتی ہے اور ان کا تقرر صدرِ پاکستان کرتے ہیں۔

اہمیت:

اسلامی نظریاتی کونسل وہ ادارہ ہے جو پاکستان میں قرآن و سنت کی بالادستی اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے فکری و قانونی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

پاکستان فتاویٰ کو جمع کرنے کی ابتداء کب سے ہوئی؟

پاکستان میں آزادی کے بعد فتاویٰ کو جمع کرنے کا عمل ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اس حوالے سے حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے، مگر یہ بات واضح ہے کہ 1951ء کے بعد علماء کرام اور مفتیان عظام نے فتاویٰ کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ مختلف علما اور فقہانے بعض مسائل پر طویل اور مستقل فتاویٰ دیے ہیں، جو بعض اوقات موضوع کی مناسبت سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ فتویٰ نویسی کے اس عمل میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اگرچہ لوگ نئے مسائل اور حالات کے بارے میں مراکز افتاء سے رہنمائی لیتے ہیں۔

مجموعی طور پر قیام پاکستان کے بعد فتاویٰ کا جمع کیا جانا، نہ صرف دینی رہنمائی کی ضرورت کو پورا کرتا ہے بلکہ ایک نظام فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے اسلامی تعلیمات اور جدید مسائل کے درمیان توازن قائم کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں فتاویٰ جمع کرنے کا عمل تیزی سے جاری رہا، اور اس حوالے سے ایک اہم پیشرفت دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء کے ذریعے ہوئی۔ دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء نے فتاویٰ جاری کرنے کا عمل شروع کیا اور ان فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ رکھنا بھی باقاعدہ طور پر شروع کیا۔ ابتدائی طور پر، دارالافتاء میں دیے گئے فتاویٰ کا ریکارڈ لکھا جاتا تھا، تاہم 1951ء کے بعد فتاویٰ کو جمع کرنے کا عمل باقاعدہ طور پر شروع کیا گیا۔ اس دوران مختلف دینی اداروں اور مدارس نے اپنے دارالافتاء میں دیے گئے فتاویٰ کو محفوظ کرنے کی اہمیت کو محسوس کیا، تاکہ لوگوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق رہنمائی فراہم کی جاسکے۔

دور حاضر میں فتوی نویسی کے حوالے سے علماء کو کئی جدید چیلنجز کا سامنا ہے، جن میں سے چند یہ ہیں:

1۔ **عقائد و عبادات:** قادیانیت، رویئت ہلال، توہین رسالت کی سزا اور ان جیسے معاملات سے متعلق فتاوی

2۔ **طبی و سائنسی مسائل:** خاندانی منصوبہ بندی، اعضاء کی پیوندکاری، ٹیسٹ ٹیوب بے بی اور کلوننگ، ایڈز اور ان جیسے سے دیگر مسائل سے متعلق احکام وغیرہ۔

3۔ **قانون سازی:** ملکی قوانین کو اسلامی قانون سے ہم آہنگ کرنا، مثلاً حدود اور قصاص و دیت کے مسائل اور ان جیسے سے دیگر مسائل سے متعلق احکام۔

4۔ **جدید ایجادات:** ٹی وی، انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور دیگر جدید ایجادات کی شرعی حیثیت اور ان کے استعمال اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کے حدود و قیود کا تعین کرنا۔

5۔ **اقتصادی مسائل:** انشورنس، اسٹاک ایکسچینج، کریڈٹ کارڈ، زکوۃ کسی ادائیگی کا مسئلہ، سود اور بینکاری اور ان جیسے دیگر امور کی شرعی حیثیت کا تعین کرنا۔

6۔ **عائلی زندگی:** عائلی زندگی سے متعلق احکام یعنی نکاح، طلاق، خلع، وراثت اور والدین کے حقوق و اولاد کے

حقوق کے مسائل، اس سلسلے میں پاکستانی قانون کا نفاذ اور پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے متعلق مسائل و احکام اور ان مسائل کا شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے آسان اور قابل عمل حل۔

فصل سوم

منتخب کردہ پاکستانی مراکز افتاء کا تعارف

پاکستان کے مختلف مراکز افتاء دینی و شرعی رہنمائی کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ ادارے نہ صرف عوام کے شرعی مسائل کا حل فراہم کرتے ہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کو عام کرنے اور معاشرتی اصلاح میں بھی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس فصل میں چار نمایاں مراکزِ افتاء : جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، جامعہ نعیمیہ لاہور اور جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا تعارف زیرِ بحث لایا جائے گا، جو اپنے اپنے دائرہ کار میں ملت اسلامیہ کی رہنمائی میں مصروفِ عمل ہیں۔

مرکز افتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ (بنوری ٹاؤن کراچی) کا تعارف

بانی جامعہ کا مختصر تعارف

جامعہ کے بانی، محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ ہیں، جنکی ولادت بروز جمعرات 6 ربیع الثانی 1326ھ بمطابق 1908ء، ضلع مردان کے شیخ ملتون ٹاؤن کے مغرب میں واقع "مہابت آباد" نامی بستی میں ہوئی۔[1]

محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا نسب نامہ

آپ کا شاندار سلسلہ نسب خاندانِ نقشبندیہ کے جلیل القدر شیخ حضرت سید آدم بنوری رحمہ اللہ سے جا ملتا ہے، جو اس طرح ہے: سید محمد یوسف بن سید محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ بن میر موسیٰ بن غلام حبیب بن رحمت اللہ بن عبد الاحد بن حضرت محمد اولیاء بن سید محمد آدم بنوری۔ یہ سلسلہ نسب حضرت سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما تک پہنچتا ہے، جس کے باعث آپ کو ساداتِ حسینی میں شمار کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد اور ماموں سے حاصل کی، پھر پشاور، کابل اور دیوبند میں مزید تعلیم حاصل کی۔ آپ نے دار العلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل[2] سے علم کی تکمیل کی، جہاں آپ نے حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کا علامہ کشمیری سے خاص علمی اور روحانی تعلق تھا، اور آپ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت شاہ اشرف علی

---

[1] ۔ محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، جمع تالیف، عمر انور بدخشانی، زمزم پبلشرز، ص 24

[2] ۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات، بھارت) 1908ء میں قائم ہوا، جو برصغیر کی نمایاں دینی درسگاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ادارہ دیوبندی مکتبِ فکر سے وابستہ ہے اور دینی علوم خصوصاً حدیث و تفسیر کی تعلیم میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتا ہے۔ معروف محدثِ کبیر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ (بانی جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی) نے بھی کچھ عرصہ یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس ادارے نے برصغیر میں دینِ اسلام کی خدمت کے لیے کئی جید علماء تیار کیے۔ (جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل، گجرات کے اساتذہ حدیث، مرتب، مفتی عبد القیوم اچکوٹی، صفحہ 30)

تھانوی اور حضرت مولانا محمد زکریا رحمہم اللہ سے بھی تصوف اور تزکیہ میں فیض حاصل کیا۔

1937ء میں مصر کے سفر کے دوران آپ نے "نصب الرایۃ" اور "فیض الباري" جیسی علمی کتابوں پر کام کیا اور حرمین شریفین میں علماء سے استفادہ کیا۔ آپ نے ڈابھیل میں شیخ الحدیث کے منصب پر کچھ سال گزارے اور تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آکر جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کی بنیاد رکھی۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ کو دینی خدمات میں بے شمار کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ آپ نے تحریکِ ختم نبوت کی قیادت میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور فتنۂ پرویزیت کا علمی طور پر تعاقب کیا۔ آپ نے متعدد دینی اداروں میں صدر یا رکن کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں۔

آپ کی تصنیفی خدمات میں "معارف السنن"، "بغية الأريب" اور "نفحة العنبر" جیسی کتابیں شامل ہیں۔ آپ نے علمی کتابوں پر مقدمات اور تعلیقات بھی لکھیں، جیسے "عوارف المنن" اور "مقدمة اللامع الدراري"۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ 13 اکتوبر 1977ء کو اسلام آباد میں وفات پاگئے۔ آپ کی نماز جنازہ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں ادا کی گئی اور آپ کو جامعہ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

جامعہ بنوریہ کی تاسیس

3 محرم الحرام 1374ھ مطابق 1953ء میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کی بنیاد رکھی۔ یہ جامعہ "علامہ بنوری ٹاؤن" (سابق نیو ٹاؤن) کراچی کی جامع مسجد میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے شروع کیا گیا۔ اس وقت نہ تو جامعہ کی کوئی عمارت تھی اور نہ ہی اس کے لیے وسائل اور انتظامات موجود تھے۔ جامعہ کی موجودہ عمارتوں کی جگہ کانٹے دار جھاڑیوں، گڑھوں اور پتھروں سے بھری ہوئی تھی۔ طلبہ مسجد میں ہی پڑھتے تھے اور وہیں رہتے تھے، جبکہ رہائش اور تعلیم کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ نے مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل دس فضلاء سے کام کا آغاز کیا اور انہیں اسلامی علوم میں تکمیل کیلئے ایک درجہ قائم کیا۔ اس کام کو شروع کرنے کیلئے آپ نے اپنے ایک دوست سے قرض لے کر طلبہ کو ماہانہ وظیفہ اور اساتذہ کرام کو تنخواہیں فراہم کیں۔ اس ابتدائی مرحلے میں حضرت بنوریؒ کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جنہیں آپ نے صبر و تحمل سے برداشت کیا، جو علماء حق کی ہمیشہ سے خاصیت رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور آپ کے صبر و اخلاص کی بدولت ان مشکلات کو دور کیا اور آپ کے کام میں برکت ڈال دی۔ آپ نے تدریسی اور رہائشی انتظامات کیلئے ایک ایک یا دو دو کمرے بنانا شروع کیے، یہاں تک کہ حضرت بنوریؒ کے دور میں تین عمارتیں مکمل ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بعد جامعہ میں دوسرے درجات کا آغاز بھی ہوا اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی ایک بڑے تعلیمی ادارے کے طور پر ترقی کرنے لگا۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ ایک بین الاقوامی علمی شخصیت تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتوں اور اخلاص سے نوازا تھا۔ آپ کی محنت اور وژن کی بدولت جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن بہت جلد ایک عالمی سطح کا ادارہ بن گیا۔ پاکستان کے ہر کونے اور دنیا بھر سے طلبہ علم دین حاصل کرنے کے لیے یہاں آنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت بنوری رحمہ اللہ کی زندگی میں ہی اس جامعہ کو علمی اور انتظامی اعتبار سے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔

جامعہ بنوریہ کے شعبہ جات

جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں مختلف تعلیمی شعبے اور کورسز کا اہتمام کیا جاتا ہے، جن میں ناظرہ، تحفیظ قرآن، تجوید، درس نظامی، تخصصات اور عصری تعلیم شامل ہیں۔ شعبہ ناظرہ میں بچوں کو قرآن پاک کی تلاوت اور اسلامی عقائد سکھائے جاتے ہیں، جبکہ تحفیظ قرآن میں بچوں کو قرآن حفظ کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جامعہ میں تجوید پر بھی توجہ دی جاتی ہے تاکہ قرآن کو صحیح طریقے سے پڑھا جاسکے۔ اس کے علاوہ، بنوری ایجوکیشن سسٹم میں میٹرک تک عصری تعلیم فراہم کی جاتی ہے، اور درس نظامی میں دینی علوم کی تدریس کی جاتی ہے۔ جامعہ میں طلبہ و طالبات کیلئے مختلف تخصصات جیسے تخصص فی الفقہ، حدیث اور دعوۃ بھی فراہم کیے جاتے ہیں، اور خواتین کے لیے علیحدہ تعلیمی نظام قائم ہے۔

دارالافتاء

جامعہ کی تاسیس کے بعد، محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تدریس کے ساتھ ساتھ خود فتاویٰ بھی تحریر فرماتے تھے۔ بعد میں، انہوں نے 1381ھ مطابق 1961ء میں 'دارالافتاء' کا شعبہ مستقل کر دیا، اور حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ (سابق مفتی اعظم پاکستان) کو اس کا رئیس بنایا۔[1]

یہ جامعہ کا وہ شعبہ ہے جس پر مسلمانوں کو اپنے شرعی مسائل کے حل کے لیے مکمل اطمینان و اعتماد ہے۔ مفتیان کرام شرعی فتاویٰ صادر فرما کر، ان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا جواب تحریری صورت میں دیتے ہیں۔ اسی طرح، یومیہ کثیر تعداد میں لوگ خود حاضر ہو کر زبانی مسائل بھی پوچھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، ملک و بیرون ملک سے ڈاک کے ذریعے آنے والے سوالات کے جوابات بھی ارسال کیے جاتے ہیں۔ نیز، مسلمان ذاتی، خانگی اور اجتماعی معاملات میں بذریعہ فون بھی مسائل دریافت کرتے ہیں۔

دار الافتاء سے سالانہ ہزاروں فتاویٰ جاری ہوتے ہیں، اور جن کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس وقت تک تقریباً تین لاکھ سے زائد فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں۔

[1] ایضاً20

جو غیر مسلم برضا ورغبت اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں، انہیں دار الافتاء میں کلمہ کی تلقین کی جاتی ہے اور "سند اسلام" بھی جاری کی جاتی ہے۔ اب تک تقریباً ساڑھے چھ ہزار غیر مسلم دار الافتاء آکر اسلام قبول کر چکے ہیں۔ نیز اگر ان کے نام میں شریعت محمدی کے مطابق درست نہ ہو یا اس کا معنی درست نہ ہو تو اس کا نام بھی تبدیل کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق ان کا نام رکھا جاتا ہے۔[1]

دارالافتاء کے ذیلی شعبہ جات

جامعہ بنوری ٹاؤن پاکستان کے دینی وعلمی اداروں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے، جو امت مسلمہ کی فکری، علمی اور تحقیقی ضروریات کو پورا کرنے میں پیش پیش ہے۔ اس ادارے نے اسلامی علوم کی اشاعت، تحقیق، اور تصنیف کے میدان میں بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔

جامعہ کے دارالافتاء میں دینی وشرعی مسائل پر فتاویٰ جاری کیے جاتے ہیں، جنہیں مزید ترتیب و تدوین کے مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ اس کام میں مفتیان کرام کی زیر نگرانی متخصص علماء مصروف عمل ہیں، جو علمی معیار کو یقینی بناتے ہیں۔

جامعہ کا کتب خانہ ایک عظیم علمی خزانہ ہے، جہاں طلبہ و اساتذہ اسلامی علوم اور دیگر موضوعات پر تحقیق کے لیے ہزاروں اہم کتب سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ کتب خانہ صبح وشام کھلا رہتا ہے، تاکہ علم کی روشنی عام ہو سکے۔ تصنیف و تالیف کے لیے جامعہ نے ایک مستقل شعبہ قائم کیا ہے، جو امت کی ضروریات کے مطابق علمی کتب کی تصنیف اور تراجم پر کام کرتا ہے۔ اس شعبے سے علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی تصنیف "معارف السنن" سمیت کئی اہم کتب اور تراجم شائع ہو چکے ہیں۔[2]

جامعہ کی ایک اور بڑی خدمت مجلس دعوت و تحقیق اسلامی کا قیام ہے، جہاں نایاب کتب اور مخطوطات کو محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ لائبریری نہ صرف مطبوعہ کتب بلکہ قدیم مخطوطات کا بھی قیمتی ذخیرہ رکھتی ہے، جس سے علماء اور محققین استفادہ کرتے ہیں۔ اسلامی ثقافت اور دینی مسائل کی اشاعت کے لیے جامعہ سے "ماہنامہ بینات" شائع کیا جاتا ہے۔[3] یہ علمی رسالہ نہ صرف اردو بلکہ عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع ہوتا ہے، تاکہ مختلف زبانوں میں دینی رہنمائی فراہم کی جا سکے۔[4]

جامعہ کے زیر انتظام علامہ بنوری ٹرسٹ مساجد و مدارس کی رجسٹریشن، الحاق، اور انتظامی امور میں تعاون

---

[1]. ماہنامہ بینات، شعبان 1430ھ - اگست 2009ء، جلد 72، شمارہ 8، ص 9

[2] ایضاً، ص:10

[3] ۔ایضاً ص 21

[4]. ایضاً، ص:9

فراہم کرتا ہے۔ یہ ٹرسٹ مساجد و مدارس کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی ترقی کے لیے خدمات انجام دیتا ہے۔ جامعہ کی یہ تمام خدمات اسلامی علوم کی ترقی اور امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ یہ ادارہ اپنی علمی اور تحقیقی خدمات کے ذریعے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں اسلامی علوم کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔[1]

فتوی کا طریقہ کار

جامعہ کے فتوی پر کم از کم تین مفتیان کرام کے سائن ہوتے ہیں اور ہر ایک مفتی با قاعدہ فتوی کو دیکھتا ہے اسکے بعد اس کا اندراج کرنے اس پر نمبر لگا کر شائع کرتے ہیں تاہم جامعہ سے فتوی حاصل کرنے کے درج ذیل ذرائع ہیں:

1۔ دار الافتاء میں حاضر ہو کر اپنا سوال کاغذ پر لکھ کر جمع کروائے۔ اس صورت میں فتوی لینے کے لیے اوقات کار صبح 9 بجے سے عصر تک ہے۔

2۔ دار الافتاء کے ای میل (darulifta@banuri.edu.pk) پر سوال بھیج کر۔

3۔ جامعہ کے پتے پر بذریعہ ڈاک سوال بھیج کر۔

4۔ جامعہ کی ویب سائٹ یا ایپلی کیشن پر دار الافتاء کے سیکشن میں جا کر اپنا سوال لکھ کر۔

باقی اداروں کا تعارف آئندہ صفحات میں سامنے لایا جارہا ہے تاہم یہ بات قابل ذکر ہے اور یہاں اس کا اظہار مناسب معلو ہوتا ہے کہ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن کراچی کا مرکز افتاء دووجوہات سے باقی مراکز افتاء کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔

پہلی وجہ: چونکہ عمومی معاشرتی اور ملکی سطح پر اس مرکزِ افتاء پر عوام کا اعتماد زیادہ ہے، اس لیے اس کا کردار دیگر مراکز کی بنسبت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آرہا ہے۔ مزید یہ کہ عوام کی اس مرکز تک رسائی ہر لحاظ سے نہایت آسان ہے، خواہ وہ بذاتِ خود وہاں حاضر ہوں یا آن لائن سوالات اور رہنمائی کے ذریعے رابطہ کریں۔

دوسری وجہ: اس مرکزِ افتاء کا نظم وضبط دیگر اداروں کے مقابلے میں زیادہ منظم اور مربوط ہے، جو اس کی علمی و سماجی فعالیت کو مزید مؤثر بناتا ہے۔

[1] ۔ محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، جمع تالیف، عمر انور بدخشانی، ص۔ 21

مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا مختصر تعارف

جامعہ سلفیہ فیصل آباد پاکستان کی معروف دینی درس گاہوں میں سے ایک درس گاہ ہے۔ یہ مرکزی دارالعلوم عرصہ 69 سال سے تعلیمی، تربیتی، دعوتی و اصلاحی خدمات سرانجام دے رہا ہے جہاں آغاز سے لے کر اب تک سینکڑوں طلباء حصول علم کر چکے ہیں۔

جامعہ میں آغاز تعلیم

جامعہ کے قیام کے لیے اس کے بانی و قائدین نے سخت جدوجہد کی۔ جب تک جامعہ کے نام قیام فیصل آباد میں نہیں ہوا اس وقت مولانا سید محمد داؤد غزنوی ؒ کے مدرسہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ آغاز میں جن طلباء نے داخلہ لیا ان کی علمی قابلیت نہ ہونے کے برابر تھی جامعہ میں ان کے لیے سپیشل کلاسز کا اجراء کر دیا گیا۔ جامعہ کے موسسین نے جامعہ کے طلباء کے لیے مفید ادارہ بنانے کے لیے بے انتہا محنت کی۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جامعہ میں ہزاروں طلباء تعلیم حاصل کر کے علماء کرام کی جماعت میں داخل ہو چکے ہیں جبکہ جامعہ کے قیام کے وقت ان کے جو اہداف اور مقاصد متعین کیے تھے ان پر کافی حد تک عمل ہو چکا ہے جامعہ سلفیہ جید علماء کرام کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ تقسیم ملک کے وقت علماء کرام کے خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ شیخ الحدیث اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے ان علماء کرام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے ایک جماعت بنائی اور اس جماعت کی ترجمانی اور بہترین مقررین اور مبلغین کی تیاری کے لیے جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا سنگ بنیاد

3 یا 4 اپریل 1955ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی تیسری سالانہ کانفرنس لائل پور (موجود فیصل آباد) میں مولانا محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی زیر صدارت ہوئی اسی کانفرنس میں 4 اپریل 1955ء کو جامعہ سلفیہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا اس تقریب میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی جس میں مرکزی جمعیت کے صدر محترم ناظم اعلی اور ارکان عامہ کے علاوہ بہت سے نامور علماء شریک تھے سنگ بنیاد فیصل آباد کے مشہور بزرگ میر حکیم نور الدین (مرحوم) نے رکھی اس کے بعد ضلعی دو معروف شخصیتیں صوفی عبداللہ رحمہ اللہ اور میاں باقر رحمہ اللہ نے ایک ایک اینٹ نصب کی۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلی محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے اس موقع پر تقریر فرمائی۔ یہ جگہ شیخوپورہ روڈ پر اس وقت فیصل آباد سے تین میل کے مسافت پر ہے اس کے مقام بالمقابل کوٹ امین ہے اس کے ارد گرد کوئی خاص آبادی اس وقت نہیں تھی کہیں کہیں کوئی گھر نظر آتا تھا۔

جامعہ سلفیہ شیخوپور روڈ محلہ حاجی آباد میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ساڑھے چار ایکڑ پر مشتمل ہے۔ ساڑھے

تین ایکڑ پر جامع مسجد، دفاتر، کلاس رومز طلبہ کی رہائش گائیں، لائبریری ہاں، فیصل ہال، طعام گاہ مہمان خانہ، ڈسپنسری، درجہ تخصص کی عمارت بنی ہوئی ہیں۔ جبکہ ایک ایکڑ رقبہ خالی ہے۔

جامعہ کے نام کی تجویز؟

جماعت کے قابل فخر محقق عالم دین مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کی تجویز سے اس کا نام "الجامعۃ السلفیہ" قرار پایا انہوں نے فرمایا کہ یہ نام آسان بھی ہے اور ہمارے مسلک سے ہم آہنگی بھی ہے اسی طرح جامعہ سلفیہ سے فارغ التحصیل ""سلفی" کہلائیں گے۔ یہ ان کے مسلک کی ترجمانی بھی کرے گا اور ان کی تعلیمی اداروں کے مقاصد کی وضاحت کا باعث بھی ہو گا۔

موسسین جامعہ

مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ, شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ, میاں محمد باقرؒ,امیر المجاہدین صوفی محمد عبد اللہؒ, حکیم نورالدین مرحوم و مغفور شامل ہیں۔

جامعہ میں موجود شعبہ جات

جامعہ کے معیار کو بہتر بنانے کیلئے شعبہ ناظرہ قرآن، شعبہ تحفیظ القرآن، شعبہ تجوید و قرأت، شعبہ علوم اسلامیہ (درس نظامی)، شعبہ عصری علوم، شعبہ دارالافتاء، شعبہ دعوت و تبلیغ، شعبہ ووکیشنل تعلیم، مرکزی لائبریری مجلہ ترجمان الحدیث، شعبہ النادی الاسلامی، المصباح سٹوڈیو (سوشل میڈیا)، شعبہ خدمت خلق (میاں فضل حق فری ڈسپنسری)، إدارۃ البحوث العلمیۃ والترجمۃ والتألیف (ریسرچ سنٹر)، المعهد العالي لإعداد الدعاۃ والائمۃ والخطباء (درجہ تخصص)، شعبہ صلاۃ کمیٹی (رضاکار)، شعبہ خطاطی، شعبہ دارالامتحانات۔[1]

المعهد العالي لإعدادالدعاة والائمة والخطباء (درجہ تخصص)

یہ جامعہ سلفیہ کا امتیازی شعبہ ہے۔ جس کا آغاز 5 سال قبل کیا گیا۔ اس میں فضلاء جامعہ شریک ہوتے ہیں۔ جنہیں دعوت وارشاد کے ساتھ افتاء میں تخصص کرایا جاتا ہے۔ بہترین اور قابل ترین اساتذہ تدریسی فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عتیق الرحمن حفظہ اللہ مدیر ہیں اور ممتاز محقق و مصنف فضیلۃ الشیخ خالد سیف حفظہ اللہ فضیلۃ الشیخ سعید مجتبی سعیدی حفظہ اللہ فضیلۃ الشیخ مولانا ادریس سلفی حفظہ اللہ

جامعہ کے فتویٰ کا طریقہ

جامعہ میں فتویٰ جاری کرنے کا نظام نہایت باقاعدہ، منظم اور مکمل طور پر قرآن و سنت کی روشنی میں قائم

---

[1] ۔ام المدارس جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا مختصر تعارف-العلماء،2024-12-16

ہے۔ فتویٰ کے اجرا سے قبل ہر مسئلہ ایک علمی و شرعی عمل سے گزرتا ہے تاکہ سائل کو مستند اور معتبر رہنمائی فراہم کی جا سکے۔ جب کسی فرد کو کوئی دینی یا شرعی مسئلہ درپیش ہو، تو وہ بذاتِ خود یا اس کے متعلقین میں سے کوئی شخص جامعہ میں تشریف لاتا ہے اور اپنا سوال مفتی صاحب کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تاہم نکاح، طلاق اور خاندانی نوعیت کے پیچیدہ مسائل میں اگر ضرورت محسوس ہو تو میاں بیوی دونوں کو طلب کیا جاتا ہے، تاکہ مسئلے کی بہتر تفہیم ہو اور فتویٰ مکمل تحقیق و بصیرت کے ساتھ جاری کیا جا سکے۔ یہ طریقہ کار ماضی میں رائج نہ تھا، لیکن وقت کی ضرورت اور مسائل کی نزاکت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد جامعہ میں مفتی کورس کرنے والے طلبہ اس سوال پر تحقیق کر کے اس کا ابتدائی مسودہ تیار کرتے ہیں، جو مفتی صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ مفتی صاحب اس جواب کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد اسے جامعہ کی فتویٰ کمیٹی میں پیش کرتے ہیں۔ یہ کمیٹی دس جید علماء پر مشتمل ہوتی ہے، اور کوئی بھی فتویٰ اس وقت تک جاری نہیں کیا جاتا جب تک تمام ارکان اس پر متفق نہ ہو جائیں۔ کمیٹی کی متفقہ رائے کے بعد فتویٰ پر جامعہ کی مہر اور مفتی صاحب کے دستخط ثبت کیے جاتے ہیں، اور اسے باقاعدہ طور پر سائل کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس پورے عمل کو مکمل ہونے میں عام طور پر کم از کم دو دن اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ درکار ہوتا ہے۔

فی الحال جامعہ آن لائن فتویٰ کی سہولت فراہم نہیں کر رہا، تاہم موجودہ تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آن لائن فتویٰ سسٹم اور دیگر ڈیجیٹل نظامات پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ جامعہ کے اوقاتِ کار صبح 9 بجے سے نمازِ عصر تک مقرر ہیں، اور تمام فتویٰ سے متعلق امور انہی اوقات میں انجام دیے جاتے ہیں۔

جامعہ کی طرف سے اب تک کوئی مکمل فتویٰ مجموعہ باقاعدہ طور پر طبع نہیں ہوا ہے، البتہ مختلف موضوعات پر جاری کیے گئے بعض فتاویٰ مخصوص رسائل میں مضمون کی صورت میں ہر ماہ شائع ہوتے ہیں۔ یہ مضامین عمومی طور پر کسی خاص دینی یا فقہی موضوع پر مبنی ہوتے ہیں اور علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور کا مختصر تعارف

لاہور جسے علم و فضل کی روایات کے سبب "عروس البلاد" کہا جاتا ہے، دینی علوم کے فروغ میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہاں کے در و دیوار علم دین اور روحانی افکار کی خوشبو سے مہکتے ہیں۔ اس علمی اور روحانی شہر میں دارالعلوم جامعہ نعیمیہ پاکستان کے مشہور شہر کے گنجان آباد علاقے گڑھی شاہو میں واقع ایک اسلامی تعلیمی گہوارہ قائم کیا۔ اس ادارے کی بنیاد حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمہ اللہ نے 1372ھ مطابق 1953 میں رکھی[1]، جو اپنے وقت کے بلند پایہ علماء اور دین اسلام کے روشن ستاروں میں سے ایک ستارہ تھے۔ جامعہ نعیمیہ، اس کے بانی کے عزم، علمی وابستگی اور اصلاحی مقاصد کا عملی نمونہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی عظیم علمی شخصیت اور اسلامی خدمات نے جامعہ نعیمیہ کو نہ صرف پاکستان بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک نمایاں مقام عطا کیا۔ آپ ماہنامہ "مجلہ عرفات "[2] کے مدیر اعلیٰ تھے جو آج تک جامعہ سے جاری ہوتا ہے۔

1998ء میں ان کی وفات کے بعد سر فراز احمد نعیمی شہید جامعہ نعیمہ کے پرنسپل (مہتمم) بن گئے[3] جو کہ 2009ء تک مہتمم تھے 12 جون 2009ء کو جامعہ میں ایک خودکش بم حملے میں سر فراز احمد نعیمی شہید ہو گئے[4] اور ان کے بعد ان کے بیٹے راغب حسین نعیمی جامعہ کے پرنسپل (مہتمم) بنے جو کہ تاحال مہتمم ہیں۔

2021ء میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن (HEC) نے جامعہ کو ڈگری ایوارڈنگ دینی انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دیا گیا ہے

ڈاکٹر راغب حسین نعیمی مہتمم (پرنسپل)

ڈاکٹر راغب حسین نعیمی جامعہ نعیمیہ لاہور کے موجودہ مہتمم ہیں، اور انہیں اس ادارے کی قیادت میں قابل قدر خدمات انجام دینے کا شرف حاصل ہے۔ ان کا تعلق ایک مشہور علمی خاندان سے ہے، جو دین اسلام کی خدمت اور تعلیم و تعلم میں مشہور ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے خاندان کے علمی ماحول میں حاصل کی، جہاں انہوں نے دینی علوم کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں، انہوں نے مختلف دینی اداروں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، خاص طور پر فقہ، اصول فقہ، تفسیر اور دیگر اسلامی علوم میں مہارت حاصل کی۔ ان کی علمی قابلیت اور تحقیق کی مہارت نے انہیں دینی حلقوں میں ایک معتبر شخصیت کے طور پر اُبھارا۔

---

1. افراد سازی میں دارالعلوم جامعہ نعیمیہ لاہور کا کردار - ہم سب، تاریخ: 17/07/2025۔

2. ،اس مجلہ میں جامعہ کے تعارف اور بانی کے متعلق کوئی مضمون ابھی تک شائع نہیں ہو چکا ہے۔ مذکورہ تفصیلات ماہنامہ العرفات کے ایڈیٹر راشد علی، استاد جامعہ ھذا نے دی ہے۔

3. ۔ ڈاکٹر سر فراز احمد نعیمی، نشان راہ، فکریہ پبلیشر، لاہور، 2009، ج1 ص 11

4. ۔ دلیل ویب، 5 مئی 2022

ڈاکٹر نعیمی کی قیادت میں جامعہ نعیمیہ نے تعلیمی اور اصلاحی منصوبوں میں نمایاں ترقی کی ہے۔ جامعہ کا مقصد طلباء کو قرآن و سنت کی تعلیم دینا اور ان کی شخصیتوں کو اسلام کے حقیقی نمائندے بنانا ہے۔ جامعہ کے اغراض و مقاصد میں قرآن و سنت، فقہ حنفی، اور مسلک اہل سنت کی اشاعت شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، جدید اور قدیم فنون میں مہارت دلانے کے ساتھ طلباء کو اسلامی اخلاقیات اور خدمتِ ملک و قوم کا جذبہ دینا، اس درسگاہ کا خصوصی ہدف ہے۔ اس کے علاوہ، الحاد اور دیگر فتنوں کو روکنا اور معاشرتی اصلاح کے لیے جلسے اور کانفرنسیں منعقد کرنا جامعہ کی دیگر سرگرمیوں میں شامل ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے، ڈاکٹر نعیمی نے اسلامی اصولوں کی روشنی میں معاصر مسائل پر غور و فکر کیا اور ان کے حل کے لیے مؤثر اقدامات اٹھائے۔ ان کا مقصد اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح کو عوام تک پہنچانا اور اسلامی اصولوں کے مطابق ایک مضبوط معاشرتی ڈھانچہ قائم کرنا تھا۔ ان کے تحقیقی منصوبے اور فتاویٰ جات نے عوام کے دینی مسائل کے حل میں معاونت فراہم کی۔

ڈاکٹر نعیمی کی خدمات میں شامل ہیں: تحقیقی منصوبوں پر کام، جدید نصاب کی تیاری، دینی اور عصری علوم کا امتزاج، اور دارالافتاء کی قیادت کرتے ہوئے عوام کے لیے فتاویٰ جاری کرنا۔ ان کی قیادت میں جامعہ نعیمیہ علم و عمل کا مرکز بن چکا ہے اور یہ ادارہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہے۔

جامعہ نعیمیہ میں موجود شعبہ جات

جامعہ نعیمیہ میں مختلف شعبہ جات طلبہ کی دینی اور عصری تعلیم میں معاون ہیں۔ شعبہ علوم دینیہ میں تحفیظ القرآن، تجوید و قراءت اور درس نظامی کے کورسز شامل ہیں، جن میں اولیٰ سے عالمیہ تک کی کلاسز اور تخصص فی الفقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شعبہ علوم عصریہ میں مڈل، ایف اے، بی اے اور ایم اے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نعیمیہ انسٹیٹیوٹ آف کمپیوٹر سائنسز میں مختلف ڈپلومے اور کورسز کرائے جاتے ہیں۔ شعبہ دارالافتاء میں عوامی مسائل کے حل کے لیے علماء کرام موجود ہیں۔

شعبہ علوم اللغۃ میں انگریزی، عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شعبہ نشر و اشاعت میں ماہنامہ "عرفات" شائع کیا جاتا ہے، جو تحقیق اور رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ جامعہ کی لائبریری میں 60 ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں، جن میں مختلف دینی اور عصری موضوعات شامل ہیں، اور اسے "محدث اعظم کچھوچھوی ہال" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان تمام شعبہ جات کا مقصد طلبہ کی جامع تربیت ہے تاکہ وہ دینی و عصری علوم میں مہارت حاصل کر سکیں۔

دار الافتاء

دارالافتاء جامعہ نعیمیہ، اس ادارے کے بنیادی اور اہم شعبوں میں سے ایک ہے۔ اس شعبے کا قیام جامعہ نعیمیہ کی ابتدا سے ہی عمل میں آیا، جہاں روزانہ درجنوں فتویٰ جات تحریر کیے جاتے ہیں اور سینکڑوں سوالات کے جوابات فراہم کیے جاتے ہیں۔ دارالافتاء کا قیام، اس ادارے کی علمی عظمت اور شرعی مسائل کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے عائلی سائلی مسائل میں رہنمائی فراہم کرنے کی علامت ہے۔ دار الافتاء کے ذریعے عائلی، تجارتی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اسلامی مسائل کا حل فراہم کیا جاتا ہے۔

دار الافتاء کی تاریخی حیثیت

دارالافتاء جامعہ نعیمیہ کا قیام، مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمہ اللہ کے دور میں ہوا۔ ابتدا میں تمام فتاویٰ ہاتھ سے لکھے جاتے تھے اور ان کی نقول ریکارڈ کے طور پر محفوظ کی جاتی تھیں۔ وقت کے ساتھ، جب علامہ ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی شہید نے ادارے کی ذمہ داریاں سنبھالیں، دار الافتاء کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس سلسلے میں 2009ء میں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ کا آغاز ہوا، جس کے ذریعے ہزاروں فتاویٰ جات کا اندراج کیا گیا۔ اس وقت دارالافتاء میں تقریباً 25,500 سے زائد فتاویٰ کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ کے ساتھ موجود ہیں، جبکہ پرانے ہاتھ سے لکھے فتاویٰ جات کی تعداد الگ ہے۔

دار الافتاء میں سوال وجواب کا نظام

دارالافتاء میں سوال و جواب کا سلسلہ انتہائی منظم انداز میں کیا جاتا ہے۔ سوال پوچھنے والا پہلے اپنا سوال تحریری صورت میں پیش کرتا ہے، جس کے بعد دار الافتاء کے مفتیانِ کرام ہر پہلو سے اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس دوران فریقین سے سوالات کیے جاتے ہیں اور معاملے کی گہرائی میں جاکر حتمی رائے ترتیب دی جاتی ہے۔ اگر مسئلہ پیچیدہ ہو تو دونوں فریقوں کو باقاعدہ طور پر دارالافتاء میں مدعو کیا جاتا ہے، جہاں تفصیلی گفتگو اور شرعی رہنمائی فراہم کی جاتی ہے۔

روزمرہ مسائل پر فتاویٰ جات

دار الافتاء میں عمومی طور پر روزانہ 14 سے 20 مسائل پر فتاویٰ جات تحریر کیے جاتے ہیں، تاہم بعض اوقات یہ تعداد بڑھ کر 30 تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ مسائل عموماً عائلی، معاشرتی، معاملاتی، اخلاقی، اقتصادی اور بین الاقوامی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ عوام الناس کو ہر سوال کا جواب شرعی دلائل کے ساتھ فراہم کیا جاتا ہے، جس سے ان کے مسائل کا جامع اور تسلی بخش حل دیا جاتا ہے۔ دار الافتاء کے ذریعے دیے جانے والے فتاویٰ جات کو نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک بھی ذرائع ابلاغ کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔ ماہانہ بنیاد پر دار الافتاء میں طلاق کے تقریباً 30 سے

35 مسائل اور خلع کے 8 سے 10 جبکہ اسی تناسب سے وراثت اور دیگر عائلی مسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے، اور ان پر تفصیلی فتاویٰ جاری کیے جاتے ہیں۔

دار الافتاء میں فتاویٰ تحریر کرنے کا نظام

دار الافتاء جامعہ نعیمیہ میں فتاویٰ جات کے تحریر کرنے کا نظام انتہائی مرتب اور منظم ہے۔ سوالات کا جواب دینے کے دوران مفتیانِ کرام پہلے سوال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر دلائل اور براہین کے ساتھ فتویٰ تحریر کیا جاتا ہے۔ فتوے کے لیے خاص شرعی اصول وضوابط کو مد نظر رکھا جاتا ہے تاکہ فیصلہ مبنی بر حقیقت اور عدل پر ہو۔ ہر فتویٰ کو کمپیوٹرائزڈ کر کے محفوظ کیا جاتا ہے، جس سے مستقبل میں ریفرنس کے طور پر کام لیا جاسکتا ہے۔

دار الافتاء جامعہ نعیمیہ پر عوام الناس کا بے حد اعتماد ہے۔ یہاں سے جاری کیے گئے فتاویٰ جات کو ملک کے علاوہ بیرون ملک میں بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سائلین، دار الافتاء کی طرف رجوع کرتے ہیں اور مسائل کے بہترین اور شرعی حل سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ اعتماد دار الافتاء کے مفتیانِ کرام کی علمی و فکری صلاحیتوں اور فتاویٰ جات کی شرعی سچائی پر مبنی ہے۔

دار الافتاء کے شعبے اور اوقات کار

دار الافتاء جامعہ نعیمیہ میں متعدد مفتیان کرام صبح اور شام کے اوقات میں موجود رہتے ہیں۔ وہ مختلف موضوعات پر مہارت رکھتے ہیں اور عائلی، شرعی اور فقہی مسائل پر مکمل شرعی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ دار الافتاء کے مفتیانِ کرام کا طرز عمل انتہائی سنجیدہ اور عمیق ہے، جو عوام الناس کے لیے آسانیاں اور مسائل کا جامع حل فراہم کرتے ہیں۔

جامعہ نعیمیہ اور اس کا دار الافتاء علمی و دینی دنیا میں عظیم مقام رکھتے ہیں۔ اس ادارے کی کاوشیں اور خدمات نہ صرف دینی علوم کے فروغ بلکہ عوام الناس کی زندگیوں میں شرعی رہنمائی کے ذریعے آسانیاں پیدا کرنے میں بھی معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ دار الافتاء جامعہ نعیمیہ، ملت اسلامیہ کے علمی و فکری ورثے کا امین ہے [1]

[1] ۔ سروے جامعہ نعیمہ 15-11-2024۔ جامعہ نعیمیہ لاہور کے بارے میں اکثر معلومات، جامعہ سے شائع ہونے والا ماہنامہ "العرفات" کے ایڈیٹر اور جامعہ کے مدرس راشد علی نے دیئے۔ کافی تلاش کے باوجود بھی کسی کتاب یا رسالے میں نہیں ملے،

مرکز افتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا تعارف

انسانی معاشرت کے عروج و زوال کا تعلق تعلیم کے فروغ کی کاوشوں سے جڑا ہوا ہے۔ اسلامی تاریخ کے سنہری ادوار اور موجودہ دور میں مسلمانوں کی بدحالی اس حقیقت کی واضح مثال ہے۔ یہ بات قابلِ حیرت ہے کہ جب مسلمان علم اور سائنس میں عروج پر تھے، مغربی دنیا تاریکی کے دور سے گزر رہی تھی۔ تاہم، آج کی صورتحال بالکل الٹ ہے؛ مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں اور تحقیق و جستجو کے دروازے بند کر چکے ہیں جس کے نتیجے میں پسماندگی، عدم برداشت، انتہاپسندی اور تنگ نظری مسلم معاشروں میں پیدا ہو چکی ہے۔

اس صورتحال کا تقاضا ہے کہ مسلمان دوبارہ الٰہی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کریں اور عصری علوم میں وہی جوش اور جستجو پیدا کریں جو پہلے اسلامی ادوار کی خصوصیت رہی ہے۔ مسلمانوں کی سابقہ شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کرنے کا واحد راستہ جدید سوچ اپنانا اور تحقیق کا فروغ ہے۔

جامعہ کی تاسیس

ان مذکورہ مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے، ایک جدید دینی تعلیم کا مرکز، جامعہ الکوثر، 1992 میں الخوئی فاؤنڈیشن کے زیر سرپرستی قائم ہوا[1]۔ یہ ادارہ اسلام آباد، پاکستان کے قلب میں واقع ہے۔ 2002 میں جامعہ نے باقاعدہ تعلیمی اور تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا[2]۔ جہاں محسن علی نجفی[3] کی سربراہی میں 20 سے زیادہ لائق اور فرض شناس اساتذہ درس و تدریس کا مقدس فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔[4]

جامعہ میں موجود شعبہ جات

جامعۃ الکوثر کا نظام تعلیم تین اہم مراحل پر مشتمل ہے جو نو سال کے تعلیمی کورسز کا احاطہ کرتا ہے۔ اس جامعہ میں مختلف شعبہ جات شامل ہیں، جن میں فقہ جعفریہ، علوم قرآنی، حدیث و رجال، مبلغین، اقتصادیات، انگریزی زبان، ہادی ہیلپ لائن (دار الافتاء) اور دیگر شامل ہیں۔

شعبہ فقہ جعفریہ میں طلبہ کو قرآن و سنت سے مسائل کا حل سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ اجتہاد کی سطح تک پہنچ سکیں۔ شعبہ فقہ و اجتہاد میں طلبہ کو اسلامی قوانین کے استنباط کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔ شعبہ علوم قرآن میں

[1] ۔ خبرگزاری خبر آنلاین - آخرین اخبار ایران و جهان | Khabaronline ، بتاریخ۔2025-06-20

[2] ۔ از اولین دانشگاه شیعی در پاکستان چه می دانیم؟ »، خبر آنلاین. ، جامعة الکوثر از افتخارات شیعه در پاکستان

[3] ۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات اسکردو بلتستان کی تحصیل کھرمنگ کے گاؤں منٹھوکھا میں 1940ء کو پیدا ہوئے۔ اور ان کا انتقال 9 جنوری 2024ء کو اسلام آباد جامعۃ الکوثر میں ہوا، فقہ جعفری کے مجتہد تھے۔(Jamiatu Al Kauthar – Premium Islamic Education Institution)

[4] ۔ خبرگزاری خبر آنلاین - آخرین اخبار ایران و جهان | Khabaronline ، بتاریخ۔2025-06-20

قرآن کی تفسیری اصولوں اور تفسیر کے مختلف پہلوؤں پر تدریس کی جاتی ہے، جبکہ شعبہ مبلغین دین کے پیغام کو مؤثر انداز میں پھیلانے کے لیے تربیت فراہم کرتا ہے۔

شعبہ ہادی ہیلپ لائن (دار الافتاء) میں عوام الناس کو شرعی رہنمائی فراہم کی جاتی ہے۔ اس شعبہ کا مقصد لوگوں کے مسائل کو حل کرنا اور ان کی اسلامی طریقے سے رہنمائی کرنا ہے۔ فیکلٹی آف حدیث و رجال میں حدیث اور رجال کے علوم کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے، اور طلبہ کو ان موضوعات میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا مقصد نہ صرف تعلیم دینا ہے بلکہ معاشرتی و دینی مسائل کے حل کے لیے تربیت یافتہ افراد تیار کرنا بھی ہے۔

هادي هيلپ لائن (دار الافتاء) کا تعارف

اہلِ تشیع کے مرکزِ افتاء کا جائزہ لینے کے لیے باحث نے مرکزِ افتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا انتخاب کیا۔ اس سلسلے میں شائع شدہ اور آن لائن دستیاب حوالہ جات کے ساتھ ساتھ تحقیقی کام کو مزید مؤثر بنانے کے لیے جامعۃ الکوثر کے مرکزِ افتاء کا باقاعدہ دورہ کیا گیا، اور مورخہ 26 جون 2025ء کو مرکزِ افتاء کے رئیس کے ساتھ تفصیلی انٹرویو بھی منعقد کیا گیا۔ اس انٹرویو اور دیگر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں، جامعۃ الکوثر کے طریقہ کار اور جدید مسائل میں اس کی جانب سے سوسائٹی کے لیے انجام دی گئی خدمات کا جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

یہ مرکز، جامعۃ الکوثر کے شعبہ "فیکلٹی آف اسلامک لاء اینڈ فقہ و اجتہاد" کا ایک ذیلی ادارہ ہے، جہاں عوام الناس کو ان کے فقہی مسائل کے شرعی حل فراہم کیے جاتے ہیں۔

فقہی و شرعی مسائل کے حل کے لیے پہلے یہاں جامعۃ الکوثر میں لوگ آتے تھے اور علماء سے اپنے مسائل کا حل کروا جاتے تھے۔ چونکہ یہ طریقہ مشکل تھا اس لیے مسائل دریافت کرنے سے عوام کی بڑی تعداد یہاں یا کسی دوسرے مرکز کی طرف رجوع کرنے سے محروم رہتی تھی۔ محسنِ ملّت نے فقہی، شرعی مسائل کی اہمیت اور عوام الناس کو درپیش مشکلات کو پیش نظر رکھ کر دورِ جدید کے سہولیات سے استفادہ کرتے ہوئے ایک پلیٹ فارم ترتیب دینے کا سوچا تاکہ اپنے دینی مسائل کے سلسلے میں جو لوگ ادارہ میں تشریف لانا چاہتے ہیں وہ یہاں آکر اپنے مسائل کا حل دریافت کرے اور مصروفیات و دیگر مسائل کے سبب کوئی ادارہ رجوع نہیں کر سکتے وہ دورِ جدید کے رابطہ کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے مستند علماء سے استفادہ کرے۔ فقہی مسائل کے حل کے سلسلے میں جو شعبہ کھولا گیا تھا وہ آج ہادی ہیلپ لائن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بذریعہ فون کال، مسیج، ای- میل، ویب سائٹ اور واٹساپ مؤمنین و مؤمنات اپنا شرعی سوال ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اور یہاں موجود علماء ان کا جواب دیتے ہیں۔

ہادی ہیلپ لائن یا دار الافتاء

فقہ جعفریہ میں تعلیماتِ اہل بیت کی روشنی میں ایک شخص مرجعِ تقلید اس وقت بنتا ہے جب وہ خاص علمی سطح عبور کر لے اور اپنے علمی مقام کے مطابق فقہی مسائل میں فتویٰ صادر کرنے کا اہل ہو۔ ہادی ہیلپ لائن، جو کہ ایک جدید دار الافتاء کا پلیٹ فارم ہے، سائلین کو ان کے مرجعِ تقلید کے فتاویٰ کی روشنی میں شرعی مسائل کا حل فراہم کرتا ہے۔ یہ پلیٹ فارم عوام کے پوچھے گئے سوالات اور ان کے جوابات کو محفوظ رکھنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔ ہادی ہیلپ لائن کی ویب سائٹ (www.hadihelpline.com) پر یہ معلومات دستیاب ہیں۔

ہادی ہیلپ لائن کا قیام 2013ء میں محسن ملت الشیخ محسن علی نجفیؒ کی ہدایت پر عمل میں آیا۔ اس کا مقصد جدید ذرائع، جیسے واٹس ایپ، ای میل، اور ویب سائٹ، کا مثبت استعمال کرتے ہوئے عوام الناس کو شرعی رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ اس پلیٹ فارم کے بنیادی اہداف میں مؤمنین کے شرعی مسائل، خصوصاً عبادات اور معاملات سے متعلق مسائل، کا ان کے مرجعِ تقلید کے فتاویٰ کی روشنی میں حل فراہم کرنا شامل ہے۔ یہ سہولت خاص طور پر عائلی مسائل، نکاح وطلاق، اور دینی رہنمائی کے دیگر موضوعات پر مرکوز ہے۔

ہادی ہیلپ لائن پر خدمات فراہم کرنیوالے علماء میں جامعۃ الکوثر کے فاضل اساتذہ کرام شامل ہیں۔ ابتدا میں علامہ زاہد حسین زہدی، علامہ احمد حسین فخر الدین، اور علامہ غلام محمد شریفی اس خدمت کا حصہ رہے۔ ان کی معاونت کیلئے مولانا ڈاکٹر شریف نفیس، مولانا مرزا صابری، مولانا غلام علی مقدسی، مولانا ساجد نعیمی، مولانا عابدین ہاشمی، اور اصغر علی ناصری نے خدمات انجام دیں۔ موجودہ وقت میں علامہ غلام محمد شریفی مؤمنین کی رہنمائی کرتے ہیں، جبکہ اصغر علی ناصری سوالات اور جوابات کو ویب سائٹ پر محفوظ رکھنے کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔

سال بھر مؤمنین و مؤمنات دینی معلومات اور شرعی مسائل کے حل کے لیے ہادی ہیلپ لائن سے رجوع کرتے ہیں۔ تاہم، ماہِ مبارک رمضان، ذی الحجہ، محرم الحرام، اور صفر المظفر کے دوران عوام کا رجحان خاص طور پر بڑھ جاتا ہے۔ ان مواقع پر نکاح، طلاق، روزہ، اور عبادات سے متعلق سوالات کی تعداد میں نمایاں اضافہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ہادی ہیلپ لائن جدید دور میں شرعی مسائل کے حل کے لیے ایک مؤثر اور قابل اعتماد ذریعہ ہے۔ یہ پلیٹ فارم نہ صرف عوام کو ان کے مسائل کا حل فراہم کرتا ہے بلکہ دین کی تعلیمات کو عام کرنے میں بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے یہ ادارہ ایک ماڈل دار الافتاء کی حیثیت رکھتا ہے جو اسلامی رہنمائی کو ہر مؤمن کی دسترس میں لانے کا عزم رکھتا ہے۔

خدمات اور استفادہ

ہادی ہیلپ لائن مؤمنین ومؤمنات کے شرعی مسائل کو ان کے مرجعِ تقلید کے فتاویٰ کی روشنی میں حل فراہم کرنے والا ایک مؤثر پلیٹ فارم ہے۔ یہ عائلی مسائل، نکاح و طلاق، میراث، اور بینکنگ جیسے موضوعات پر رہنمائی فراہم کرتا ہے اور بوقتِ ضرورت تحریری طور پر بھی جوابات پیش کرتا ہے، جو عدالتوں اور قانونی معاملات میں دلیل کے طور پر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

ماہِ مبارک رمضان اور دیگر مواقع پر گوگل میٹ یا زوم کے ذریعے فقہی مسائل پر درسِ اخلاق کا انعقاد کیا جاتا ہے، جہاں علماء مؤمنین کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ اب تک تقریباً بیس ہزار افراد اس سہولت سے مستفید ہو چکے ہیں، اور 70,000 سے زائد سوالات موصول ہو چکے ہیں، جن میں زیادہ تر نماز، روزہ، غسل، نکاح، طلاق، اور میراث جیسے موضوعات شامل ہیں۔ یہ پلیٹ فارم عدالتی اور قانونی مسائل میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے، خاص طور پر نکاح، طلاق، اور میراث کے معاملات میں۔ مجتہد کے فتاویٰ کی غیر موجودگی میں ان کے دفتر یا وکیل سے رابطہ کر کے مستند حل پیش کیا جاتا ہے۔ ہادی ہیلپ لائن جدید ذرائع کے استعمال اور مستند علماء کی خدمات کے ذریعے مؤمنین کو ان کے شرعی مسائل کے حل میں معاونت فراہم کر رہا ہے۔

طریقہ کار

ہادی ہیلپ لائن کا عمومی طریقہ کار یہ ہے کہ سائلین اپنے سوالات واٹس ایپ، ای میل، کال یا ویب سائٹ کے ذریعے بھیجتے ہیں، اور آفس اوقات میں علامہ صاحب ان کا جواب دیتے ہیں۔ لائیو کال کے ذریعے روزانہ 5 سے 10 افراد براہِ راست سوالات کرتے ہیں، جبکہ زیادہ تر افراد آن لائن رابطہ کرتے ہیں اور ہفتے میں 10 سے 15 افراد ادارہ آکر ملاقات کرتے ہیں۔ ہادی ہیلپ لائن سے رجوع کرنے والے افراد دنیا بھر سے، خصوصاً پاکستان، ہندوستان، سعودی عرب، ایران، عراق، بنگلہ دیش اور یورپی ممالک سے ہوتے ہیں۔ اس کے طویل مدتی اثرات میں، سوالات اور جوابات ویب سائٹ پر محفوظ کیے جاتے ہیں تاکہ لوگ مستقبل میں بھی استفادہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ، اس پلیٹ فارم کے ذریعے عوام دینی درسگاہوں سے جڑتے ہیں، جس سے دینی تبلیغ اور دین شناسی میں اضافہ ہوتا ہے۔

تاہم جامعۃ الکوثر کے دارالافتاء تحریری فتوی شائع نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے باب سوم اور چہارم میں جامعۃ الکوثر کو فتاوی جات کو شامل نہیں گیا ہے۔

دیگر خدمات

جامعۃ الکوثر کا قیام ایک منفرد تعلیمی نظام کے تحت دینی اور عصری علوم کا امتزاج فراہم کرتا ہے۔ اس کا مقصد طلبہ کی اخلاقی تربیت اور تحقیق کو فروغ دینا ہے، اور نصاب کو جامع اور مؤثر بنانا ہے۔

جامعہ کی خدمات میں وسیع مسجد، 20000 کتب پر مشتمل کتب خانہ، المصطفیٰ آڈیٹوریم، 350 طلبہ کی گنجائش والا ہاسٹل، فاصلاتی تعلیم، اور ہادی ٹی وی شامل ہیں۔ ہادی ٹی وی کا مقصد رسول ﷺ اور ائمہ کا پیغام عالمی سطح پر پھیلانا ہے۔ جامعہ سالانہ فہم دین سمپوزیمز بھی منعقد کرتی ہے، جن میں عقائد، اخلاقیات، اور اسلامی قوانین پر سیمینارز ہوتے ہیں۔ ان خدمات کے ذریعے جامعہ دینی تعلیم میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

باب سوم: معاصر عائلی مسائل سے متعلق پاکستانی ور شرعی قوانین کا جائزہ

فصل اول

کتاب و سنت کی روشنی میں معاصر عائلی مسائل کی اہمیت

فصل دوم

پاکستان کے عائلی قوانین کا جائزہ

فصل سوم

عائلی مسائل سے متعلق بنیادی شرعی احکام

فصل اول

کتاب وسنت کی روشنی میں معاصر عائلی مسائل کی اہمیت

عائلی مسائل انسان کی زندگی کے بنیادی اور اہم پہلو ہیں جو فرد اور معاشرتی سطح پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ان مسائل میں نکاح، طلاق، خلع، وراثت اور خاندان کی تنظیم شامل ہیں، جو نہ صرف فرد کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتے ہیں بلکہ پورے معاشرتی توازن اور استحکام کے لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں ان مسائل کے حوالے سے واضح رہنمائی فراہم کی گئی ہے، جس سے ہمیں اپنی زندگیوں کو بہتر اور متوازن بنانے کی راہنمائی ملتی ہے۔

اس فصل میں ان اہم عائلی مسائل کا تعارف پیش کیا جائے گا اور ان کی قرآن وحدیث کی روشنی میں اہمیت کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ ہم ان مسائل کو سمجھ کر اپنے عائلی تعلقات میں بہتری لا سکیں۔ مزید برآں، ان عائلی مسائل کے بڑھنے کی وجوہات پر بھی تفصیل سے بات کی جائے گی، جیسے معاشی دباؤ، ثقافتی تبدیلیاں، تعلیم کی کمی، اور جدیدیت کے اثرات، جو ان مسائل کے بڑھنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں

خاندانی نظام کسی بھی معاشرے کی بنیاد اور استحکام کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ نظام نہ صرف انسانی زندگی کے سکون اور توازن کا ذریعہ ہے بلکہ ایک مضبوط اور پرامن معاشرے کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معاصر دور میں، جہاں جدیدیت، اقتصادی دباؤ، اور سماجی تبدیلیوں نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کیا ہے، وہیں عائلی نظام بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔

معاشرتی رویوں میں تبدیلی، ازدواجی زندگی میں بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں، طلاق کی شرح میں اضافہ، اولاد کی تربیت کے مسائل اور خاندانی تعلقات میں عدم توازن جیسے مسائل نے خاندانی نظام کو کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ مسائل نہ صرف انفرادی زندگی کو متاثر کرتے ہیں بلکہ پورے معاشرے کے سکون اور استحکام کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

قرآن وسنت میں خاندانی نظام کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ نکاح کو محبت، سکون اور رحمت کا ذریعہ قرار دیا گیا، جب کہ خاندانی تعلقات میں عدل، محبت اور ذمہ داری کو بنیادی اصولوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ ان الٰہی تعلیمات کی روشنی میں معاصر عائلی مسائل کا جائزہ لینا اور ان کے حل کے لیے رہنمائی فراہم کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس فصل میں معاصر عائلی مسائل کا تعارف اور ان کی اہمیت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں زیرِ بحث لایا جائے گا، تاکہ ان مسائل کے اسلامی حل کو واضح کیا جا سکے اور خاندانی نظام کی مضبوطی کے لیے رہنمائی فراہم کی جا سکے۔

معاصر عائلی مسائل کا مفہوم

عصر سے مراد زمانہ ہے۔ اسی سے عصری یا معاصر نکلا ہے۔[1] جس کو انگریزی میں "Contemporary" کہا جاتا ہے۔[2] عصری یا معاصر سے مراد کسی شخص کے عہد کے واقعات وحالات یا اشخاص مراد لیے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ اضافی اصطلاح ہے لہذا معاصر یا عصری مسائل سے مراد وہ مسائل ہیں جو دور حاضر میں دنیا کو درپیش ہیں۔

جب ہم اقوام وملل کی تاریخ اور اس کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہر واقعہ اور حادثہ دیرپا اثرات رکھتا ہے اس کا اثر بھی ایک دور پر محیط ہوتا ہے اگر اس سلسلے میں ہم مغربی معاشرہ کو مدنظر رکھیں تو 1789ء میں انقلاب فرانس کے بعد عورت کا کردار بدلنے کی بناء پر عائلی مسائل نے ایک خاص نہج اختیار کی۔ برصغیر پاک وہند اور مسلم معاشرے کو دیکھیں تو مغربی استعمار کے بعد کا دور تقریباہر علاقے میں نتائج کے اعتبار سے کچھ مشترک اثرات رکھتا ہے جس کی بناء پر معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل میں بھی تقریباً یکسانیت ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد ان مسائل میں شدت آتی چلی گئی۔ بیسویں صدی کے آواخر میں جدید ٹیکنالوجی کے انقلاب نے زمان ومکان سمیٹ کے رکھ دیا۔ اب آنکھ صرف اپنا گرد وپیش نہیں بلکہ پوری دنیا دیکھتی ہے۔ لہذا عصری عائلی مسائل سے مراد موجودہ دور کے مسائل ہیں خواہ ان کے وجوہ واسباب صدیوں پر محیط ہوں۔

عائل کی لغوی تعریف

عائل عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے "ضرورت مند" یا "محتاج" شخص[3]۔ عائل وہ فرد ہوتا ہے جو مالی یا معاشرتی طور پر کسی دوسرے فرد یا ادارے پر انحصار کرتا ہے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے اس کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں بھی عائل کا ذکر آیا ہے،۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" ﴿ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ﴾[4]"

ترجمہ " :اور اُس نے تمہیں ضرورت مند پایا تو غنی کر دیا۔[5]"

یہاں عائل کا مطلب ضرورت مند ہے، اور اللہ نے آپ ﷺ کی مدد کی اور اسے بے نیاز کر دیا۔

عائل کا تصور اسلامی معاشرت میں یہ بھی بتاتا ہے کہ جو لوگ مالی یا سماجی مدد کے محتاج ہوں، ان کی مدد کرنا

1- محمد بن مکرم بن علی، أبو الفضل، جمال الدین ابن منظور الأنصاري الرويفعى الإفريقي، لسان العرب، الناشر: دار صادر – بیروت، 1414ھ، ج4، ص575

2- Oxford Advanced learners Dictionary,p421

3 ۔ أحمد مختار عبد الحميد عمر (ت 1424ھ) بمساعدة فريق عمل، معجم اللغة العربية المعاصرة، الناشر: عالم الکتب، 2008، ج1 ص91

4 ۔ سورۃ الضحیٰ، 8

5 شفیع، مفتی، معارف القرآن، مکتبہ معارف القرآن کراچی، 2008،، ج8 ص، 767

ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔

جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «الْخَلْقُ عِيَالُ اللَّهِ فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللَّهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلَى عِيَالِهِ))[1]

ترجمہ " : تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور اللہ کے نزدیک سب سے محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے۔"

مسند أبو یعلی کے محقق حسین سالم أسد[2] کے نزدیک اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔[3]

یعنی تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ یہ تصور اسلامی تعلیمات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور رحم دلی سے پیش آنے کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے محبت ہے، اور جو شخص اللہ کے قریب ہونا چاہتا ہے، اسے اللہ کی مخلوق سے محبت کرنی چاہیے اور ان کی مدد کرنی چاہیے۔ اس فرمان کے تحت، ہمیں دوسروں کے ساتھ ہمدردی، محبت، اور انصاف کے ساتھ پیش آنا چاہیے، چاہے ان کا مذہب، رنگ، نسل یا قومیت کچھ بھی ہو۔

یہ بات انسانیت کی خدمت کو اسلام میں ایک عبادت کی طرح پیش کرتی ہے۔ اس قول سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ اللہ کے قریب ہونے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے کنبے، یعنی تمام مخلوقات کی خدمت اور مدد کریں۔

"الخلق عيال الله" کا یہ پیغام دراصل انسان کو دوسروں کی مدد اور خدمت کا درس دیتا ہے، اور معاشرتی فلاح و بہبود کو اہمیت دیتا ہے۔

اور عائلی بھی اس سے ماخوذ لفظ ہے جو "عائلہ" سے نکلا ہے جس کی جمع عیائل آتی ہے، اس کا مطلب "خاندان" یا "گھرانا" یا "گھر کے لوگ" یا "گھریلو افراد جن کا نان و نفقہ واجب ہو" ہے[4]۔

عائلی مسائل کا اصلاحی تعریف

عائلی مسائل سے مراد گھریلو خاندانی اور زوجین کے باہمی مسائل ہے۔ خاندان ایک بنیادی اور اہم سماجی ادارہ ہے جو دو یا دو سے زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن کا بنیادی مقصد بچے پیدا کرنا اور انکی اس طرح پرورش کرنا ہے کہ معاشرے کا کارآمد فرد بن سکیں۔ گویا ان احکام میں سے اہم حصہ الأحوال الشخصیہ یا عائلی احکام ہیں۔ ألأحوال

---

[1] ۔ التبریزی، شیخ ولی الدین الخطیب، مشکوۃ المصابیح، کتاب الادب، مکتبہ الشیخ، 2005ء رقم الحدیث: 4998

[2] ۔ حسین سالم اسد الدارانی (1351ھ بمطابق 1931ء - 25 ربیع الاول 1443ھ / 31 اکتوبر 2021ء) ایک حدیث کے عالم اور شامی ورثہ کے محقق ہیں انہوں نے سنت نبوی پر کتابوں کی تصدیق کی۔ (ترجمة الشيخ المحدث حسين سليم أسد الداراني رحمه الله، ص3)

[3] ۔ الکتاب: مسند أبي يعلى، المؤلف: أبو يعلى أحمد بن علي (المتوفى: 307ھ)، المحقق: حسين سليم أسد الناشر: دار المأمون للتراث - دمشق، 1984، ج6 ص 194

[4] ۔ ابو الفضل مولانا عبد الحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات، حقانیہ، ملتان، 1999۔ ص 588

شخصیہ یعنی شخصی اور عائلی قانون(Personal law; Family Law)عائلی قوانین واحکام میں نکاح وطلاق سے لے کر حقوق اولاد حقوق اقارب افراد خاندان اور صلۂ رحمی وغیرہ سب شامل ہیں۔ سماجی نظام کی تمام تر بنیاد یہی اسی شخصی قوانین پر ہوتی ہے۔ فرد کی تعلیم وتربیت، افرادِ خاندان کے تعلق کی نوعیت، گھر کا اندرونی نظم وضبط، خاندان کی تشکیل وتربیت یعنی ایک چھوٹی سی دنیا کی داغ بیل انہی قوانین سے پڑتی ہے۔ جو آگے چل کر ایک محلہ، ایک شہر، ایک قوم اور ایک ملک بن جاتی ہے۔

احوالِ شخصیہ سے مراد وہ قوانین ہیں جو انسان کے ذاتی اور عائلی معاملات، جیسے نکاح، طلاق، وراثت، وصیت، اور حضانت سے متعلق ہیں۔ اس تعریف کو مختلف فقہاء اور مفسرین نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ ذیل میں چند اہم فقہی کتب سے احوال شخصیہ کی تعریف دی گئی ہے:

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے احوال شخصیہ کی تعریف یوں کی ہے:

((الأحوال الشخصيةهي القوانين المتعلقةبالحالةالشخصية للفرد مثل الزواج، الطلاق، الحضانة، والميراث وما شابه))[1]".

ترجمہ: "احوال شخصیہ سے مراد وہ قوانین ہیں جو فرد کی ذاتی حیثیت سے متعلق ہوتے ہیں جیسے شادی، طلاق، بچوں کی پرورش، وراثت اور اس جیسے دیگر معاملات۔"

علامہ ابن عابدین شامی[2] نے "رد المحتار" میں احوال الشخصیہ کے امور پر روشنی ڈالی ہے، جہاں انہوں نے ان معاملات کو ذاتی حیثیت کے مسائل کے طور پر بیان کیا ہے۔

((الأحوال الشخصيةتشمل مايتعلق بالأسرة من زواج وطلاق و نسب ونفقة،وهي مسائل تتعلق بالحياة الشخصية للفرد في ظل أحكام الشريعة))[3]".

ترجمہ: "احوال شخصیہ میں خاندان سے متعلق معاملات شامل ہیں جیسے شادی، طلاق، نسب، اور نفقہ۔ یہ وہ مسائل ہیں جو فرد کی ذاتی زندگی سے متعلق ہیں اور شریعت کے احکام کے تحت ہیں۔"

"الموسوعة الفقهية" میں الاحوال شخصیہ کی تعریف اس طرح بیان کیا گیا ہے:

((هي الأحكام التي تنظّم علاقة الفرد بأسرته كعقد الزواج وآثاره، والطلاق،والميراث،و النفقة، وما يتعلق بحقوق الأفراد الشخصية في دائرة الأسرة".))[4]

ترجمہ: "یہ وہ احکام ہیں جو فرد کے اپنے خاندان کے ساتھ تعلقات کو منظم کرتے ہیں جیسے عقد نکاح اور اس کے اثرات، طلاق، وراثت، نفقہ، اور خاندان کے دائرے میں انفرادی حقوق سے متعلق امور۔"

---

[1] ۔ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، باب فی الاحوال الشخصیۃ، جلد9،، ص695

[2] ۔علامہ ابن عابدین کی پیدائش 1198ھ بمطابق 1783ء میں ہوئی۔ ان کی ولادت شام کے دار الحکومت دمشق میں ہوئی والد بچپن میں انتقال کر گئ ے شروع میں والد کے کاروبار میں مصروف رہے بعد میں علمی شغف میں مصروف ہو گئے۔ محمد شاکر السالمی العمری العقاد سے علوم عقلیہ حدیث اور تفسیر پڑھی انہی کی ترغیب سے مسلک حنفی اختیار کیا اور اپنے دور کے بہت بڑے عالم و مرجع خلائق بن گئے

[3] رد المحتار علی الدر المختار، باب فی الاحوال الشخصیۃ، ج2،

[4] ۔وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ، الکویت، الموسوعۃ الفقھیۃ، 1983، مادۃ الاحوال الشخصیۃ، ج1ص212

شرح مختصر الطحاوی میں ابن ہمام نے احوال شخصیہ کو خاندانی زندگی کے احکام کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

((يطلق لفظ الأحوال الشخصية على كل مايتعلق بأمورالأسرة،ويندرج فيه مسائل النكاح والطلاق والميراث وغير ها))[1]"

ترجمہ: "احوال شخصیہ کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو خاندان کے امور سے متعلق ہو، اور اس میں نکاح، طلاق، وراثت اور اس جیسے دیگر مسائل شامل ہیں۔"

عائلی مسائل کی جامع تعریف

احوال الشخصیہ ان قوانین کا مجموعہ ہے جو فرد کی ذاتی اور عائلی زندگی سے متعلق ہیں، اور یہ قوانین اسلامی شریعت کے احکام کے تحت فرد اور اس کے خاندان کے معاملات کو منظم کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر عائلی امور یا عائلی مسائل سے مراد وہ مسائل اور معاملات ہیں جو خاندان یا گھرانے کے افراد کے درمیان تعلقات، حقوق و فرائض، اور ذمہ داریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں:

1. **شادی اور ازدواجی تعلقات**—(نکاح، مہر، نان نفقہ، طلاق، خلع اور دیگر میاں بیوی کے حقوق و فرائض۔
2. **رضاعت**—بچے کی نشو نما کے لیے ماں کا اس کو دودھ پلانا یا کسی بچے نے ایک ایسی عورت کا دودھ پیا ہو جس کی نسبت سے وہ عورت اس کے لیے ماں کے درجے میں آجاتی ہے۔
3. **بچوں کی پرورش اور تربیت**—بچوں کی اخلاقی، تعلیمی اور دینی تربیت۔
4. **والدین کے حقوق**: والدین کی خدمت، احترام، اور ان کی ضروریات کا خیال۔
5. **وراثت اور مالی ذمہ داریاں**—خاندان میں جائیداد کی تقسیم اور مالی کفالت کی ذمہ داری۔
6. **وصیت اور وقف**: وفات کے وقت اپنے مال میں سے کسی کے لیے وصیت کرنا اور زندگی میں ثواب کی نیت سے مال کو بطور وقت عام لوگوں کی بھلائی کے لیے دینا۔ چنانچہ موسوعۃ المفاہیم الاسلامیۃ العامۃ نے احوال الشخصیہ میں مندرجہ ذیل امور شامل کئے ہیں:

((هى الأحكام والمبادئ والمسائل المنظمة للعلاقات داخل الأسرة، بمايشمل أحكام الخطبة والزواج،والمهر ،ونفقةالزوجةو واجباتها تجاه زوجها،والطلاق وتفريق القاضى بين الزوجين والخلع و النسب والرضاع وحضانة الأولاد والميراث والوصية والوقف و تتضمن مسائل الأحوال الشخصي الشخصيةبعض الأمورالمالية كالميراث والوصية والوقف))[2]

اسلامی تعلیمات میں عائلی نظام کو خاص اہمیت دی گئی ہے تاکہ معاشرے میں استحکام، عدل، اور محبت کو فروغ دیا جاسکے۔ قرآن و سنت نے عائلی معاملات کو منظم کرنے کے لیے بنیادی اصول اور احکامات فراہم کیے ہیں تاکہ ہر فرد کے حقوق محفوظ رہیں اور گھرانے میں امن و سکون کا ماحول قائم ہو۔

---

[1] ۔ابن الھمام شرح مختصر الطحاوی، کتاب النکاح، ص45

[2] ۔موسوعۃ المفاھیم الإسلامیۃ العامۃ، المجلس الأعلی للشئون الإسلامیۃ—مصر، ص8

معاصر مسائل کی نوعیت اور دائرہ کار کا تعین

اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ گھر سب افراد انسانی کی "ارضی جنت" جائے سکون و محبت، تعمیر افراد کا مرکز اور معاشی و معاشرتی جائے پناہ ہے تو انسان خواہ مغرب کا ہو یا مشرق کا، مسلم ہو یا غیر مسلم سب کا دُکھ مشترک اور مسائل یکساں ہیں یہ مسئلہ سب کا مشترک ہے کہ ایک پر سکون گھر اور اس میں موجود افراد خانہ سب دکھوں کا مداوا ہیں کرہ ارض کے کسی بھی کونے پر آباد انسان کو آج بھی گھر کو جانے والے سارے رستے اچھے لگتے ہیں۔ گویا مشترک مسئلہ یہ ہے کہ گھر ہونا ضروری ہے، اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مکان بن جائے تو اس کو گھر کیسے بنایا جائے۔ شادی کا ادارہ اس سوال کا جواب فراہم کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان قدیم دور سے تعلق رکھتا ہو یا جدید سے چڑھتے سورج کی سرزمین کا باسی ہو یا ڈوبتی کرنوں کو الوداع کہنے والا ہو شادی کا ادارہ اس کے ہاں موجود رہا اور اگر زندگی کا تسلسل برقرار رکھنا ہے تو اس ادارہ کو دوام وانضباط عطا کرنا ہوگا۔ یوں یہ سب مسائل مشترکہ ہوں گے کہ شادی کا مقصد کیا ہے؟ کب؟ اور کیوں اور کیسے منعقد ہونا چاہیے؟ شادی فریقین پر کیا ذمہ داریاں عائد کرتی ہے؟ بہترین شادی کن اصول وضوابط کی پابندی پر منحصر ہے۔ ایک اور مسئلہ جو صفحہ ہستی کے ہر خطے پر مشترک موجود ہے وہ ہے اندورون خانہ اور بیرون خانہ ذمہ داریوں کی تقسیم، مشرق تو پہلے ہی متفق ہے کہ عورت کی توجہ محنت، محبت اور شفقت ہی گھر کی اندرونی فضاء کو مزین کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربات سے گزرنے کے بعد آج مغرب بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ خاتون ہی "Homemaker" ہو سکتی ہے۔ سو یہ مسئلہ بھی مشترکہ ہے۔

شادی فریقین پر جو ذمہ داریاں عائد کرتی ہے ان کی ادائیگی میں ہی اس ادارے کی بقاء مضمر ہے۔ عصر حاضر میں پورا کرہ عالم نفسا نفسی کی لپیٹ میں ہے اور عائلی زندگی بھی اس کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ خواتین پر بڑھتا ہوا گھریلو تشدد اور معمولی معمولی باتوں پر اس زندگی کا ختم ہو جانا لمحہ فکریہ ہے۔ اگر حالات ناگزیر ہو جائیں، فریقین کا ایک چھت تلے نباہ ناممکن ہو جائے تو علیحدگی کا سفر کن اصولوں کو مد نظر رکھ کر کرنا ہوگا کہ شادی کے ادارہ سے وجود پانے والی اولاد ہلاکت و تباہی سے ممکنہ حد تک محفوظ رہ سکے۔ چونکہ ہر قوم اور معاشرہ اپنے عائلی مسائل کو اپنے مخصوص نظریہ اور طرز زندگی کے مطابق ہی حل کرتا ہے۔ ان مسائل میں بطور مسلم معاشرہ ہمارے مسائل مغرب سے کچھ معاملات میں الگ ہونگے۔ چونکہ امت مسلمہ بھی مختلف خطے، جغرافیائی مزاج اور علاقائی نسبتوں سے کچھ رسوم ورواج میں باہم مختلف ہے اس لیے امکان ہے کہ نوعیت کے اعتبار سے پاکستان کے معاصر عائلی مسائل دیگر اسلامی معاشروں سے کچھ حد تک متفرق ہوں۔ اس تحقیق کے دوران عمومی طور پر دائرہ تحقیق پوری عصری دنیا اور امت مسلمہ کی بجائے بالخصوص پاکستان کے عصری عائلی مسائل تک محدود ہوگا۔

عائلی زندگی کی تشکیل سے متعلقہ مسائل

اس ضمن میں جو مسائل ہیں وہ شادی اور نکاح کی حیثیت سے متعلقہ مسائل ہیں مثلاً نکاح سے گریز کے رجحانات کا فروغ، عائلی ذمہ داریوں سے فرار، بے نکاح ازدواجی زندگی سے معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ اور نئی نسلوں کا گھر کی چار دیواری کے تحفظ سے محروم ہو جانا، ہم جنس پرستی کا رُجحان کا پروان چڑھنا، اور اس کو قانونی تحفظ ملنے سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں، تاخیر نکاح کے اسباب، مثلاً جہیز کے مسئلہ پر افراد، ذات برادری، وٹہ سٹہ، لڑکیوں کی ملازمت اور اعلیٰ تعلیم اور نکاح کی تقریب میں سادگی کو چھوڑ کر بے شمار رسوم ورواج کی پیروی کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ معاہدہ نکاح سے متعلقہ مسائل مثلاً والدین اور لڑکیوں کے اختیارِ نکاح کی حدود، فرار کی شادیاں، جبری نکاح، قرآن سے شادی، ونی کی رسم اور مہر سے متعلقہ مسائل ہیں۔

عائلی نظام زندگی سے متعلقہ مسائل

دیگر معاشرتی اداروں کی طرح عائلی زندگی کا ادارہ بھی اپنی تنظیم کے لیے کچھ قواعد وضوابط کا محتاج ہے ان قواعد وضوابط سے روگردانی کی بناء پر عائلی زندگی اندرونی طور پر بے شمار مسائل کا شکار ہے۔ مثلاً بیوی کی کفالت کی حدود، ان سے روگردانی، عورت کا کسب معاش کا حق، نکاح کے بعد عورت کی حیثیت اور دائرہ کار، عورت کی ملکیت پر اس کا حق استعمال، عورت کا سکونت کا حق، شوہر کی عدم موجودگی میں منکوحہ کی سکونت، سسرال کی خدمت کی شرعی حیثت، عورت کا الگ سکونت کا حق، مشترکہ خاندانی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل، خواتین پر تشدد کا بڑھتا ہوا رجحان اور قتل غیرت وغیرہ مسائل اس ضمن میں شامل ہیں۔

زوجین کی علیحدگی سے متعلقہ مسائل

طلاق کا بڑھتا ہوا رجحان، اس کے محرکات واثرات، مرد کا حق طلاق کا بے جا استعمال، طلاق ثلاثہ کا روز بروز فروغ پاتا ہوا رجحان، طلاق مغلظہ اور سکنیٰ کے احکام اور طلاق تفویض وغیرہ کے ساتھ ساتھ فیملی کورٹس کی کارگردگی بھی شامل ہے۔ طلاق اور خلع سے پیدا ہونے والے معاشی ومعاشرتی مسائل اور زوجین کی علیحدگی کی صورت میں بچوں کی حضانت وغیرہ کے مسائل بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

معاصر عائلی صورتحال

عائلی زندگی، اجتماعی زندگی کا بنیادی عنصر ہے۔ اجتماعی زندگی اس وقت ترقی کرتی ہے جب زوجین کا سماجی رشتہ ٹھیک ہو اور جنسی تعلق بھی صحیح ہو۔ بدقسمتی سے، عائلی زندگی کا یہ خوبصورت قصر، جو بنی نوع انسان کے لیے سائبان کا کام دیتا ہے، اس میں دراڑیں پڑتی جارہی ہیں۔ مغرب کی اباحیت پسندی اس کو ٹوٹ پھوٹ سے دوچار کر رہی ہے، تو مشرقی روایات کی آڑ میں گھر اُجڑتے اور ویران ہوتے جارہے ہیں۔

مسلم معاشرہ اور عائلی حالات

صرف مغرب ہی مادر پدر آزادی اور عائلی نظام کی تباہی سے دوچار نہیں ہوا بلکہ مشرق بھی اس کے مضر اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا، گذشتہ چند صدیوں میں استعماری پنجہ نے عالم اسلام کی اکثریت کو جکڑ لیا اور اپنے نظریات سے امت مسلمہ کی سماجی و معاشرتی زندگی کو متاثر کیا۔ پچھلی صدی میں اکثر اسلامی ممالک نے آزادی حاصل کرلی لیکن یہ حقیقی آزادی نہ تھی۔ برطانیہ، جرمنی، فرانس اور اس کے بعد امریکہ، روس کے اثرات نے عالم اسلام کا نقشہ بدل کے رکھ دیا۔ اور مسلمانوں کو آزاد ہونے کے باوجود بھی کسی نہ کسی مغربی ملک کا دستِنگر رہنا پڑا کیونکہ برسوں کی غلامی نے ان کی فکر اور مالیات کو اس قابل ہی نہیں رہنے دیا کہ آزادنہ سوچ کے مالک رہتے۔ "بیسویں صدی کی دنیا مسلمانوں کی دُنیا نہ تھی بلکہ امریکہ اور روس کی دنیا تھی۔ مسلمانوں کو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ مسلمان دنیا چونکہ مغربی استعماری طاقتوں کی دستِنگر رہی تھی۔ اس لیے وہاں پالیسی سازی میں ایسے لوگ تھے یا پھر اسی مقصد کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔ جن کا جھکاؤ مغربی دُنیا کی طرف زیادہ تھا۔ اس لیے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہونے والی صف آرائی میں مسلمانوں کی اکثریت امریکہ کی اتحادی بن گئی۔ بیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ان کے معاشروں میں کسی قسم کی منصوبہ بندی کا نام تک نہ تھا۔ تحصیل علم کا جنون، نہ سائنس و ٹیکنالوجی میں مہارت کی تمنا، ادب اور دوسرے فنون کا بھی یہی عالم تھا۔[1]

سستی، مداہنت اور دین سے دوری کی بناء پر مسلمان حقیقی اسلامی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے اور مغربی استعمار کی نئی صورت گلوبل مدینہ اپنے دائرہ کار کو وسیع کرتی چلی گئی۔ مغربی افراد اور افواج تو واپس چلی گئیں لیکن مغربی افکار امت مسلمہ کے گھروں کو متاثر کرنے لگے۔ فواحش و منکرات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ڈِش، کیبل، اور انٹرنیٹ کی صورت میں مسلم عائلی قصر کی بنیادوں کو بھی ہلانا شروع کر دیا۔ ذرائع ابلاغ کی جدت سے زمان و مکان سکڑ گئے اور مشرق و مغرب ہتھیلی پر رکھی ہوئی تصویر کی مانند ہو گئے۔ مشرق بھی مغربی افکار و انداز و اطوار سے متاثر ہوا اور عائلی حالات ابتری کا رخ کرنے لگے۔ اسباب رزق و وسائل معیشت کی تلاش میں مسلمانوں کی کثیر تعداد مغربی معاشروں کا رُخ کرنے لگی اگر وہ اپنے وطن واپس آئے تو مغربی اطوار کا اثر ساتھ واپس آیا۔ اگر وہاں آباد ہو گئے تو بھی عائلی محل پوری طرح محفوظ نہ رہ سکا۔ انہی حالات کے بارے میں جان ایل ایسپوزیٹو لکھتے ہیں:

> "حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی زیادہ بڑی بڑی آبادیاں پاکستان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش، انڈیا اور نائیجیریا میں ہیں۔ دنیا میں اس وقت مجموعی طور پر 1.3 ارب کے لگ بھگ مسلمان ہیں۔ اور اس میں صرف 20 فیصد عرب باقی 80 فیصد غیر عرب ہیں۔ جبکہ یہ بھی یاد رہے کہ تمام نا مساعد

---

[1]۔ برناڈ لیوس، اسلام کا بحران، جہاد اور دہشت گردی، ص132

حالات اور غلط عکاسی کے باوجود اسلام یورپ کا دوسرا اور امریکہ کا تیسرا بڑا مذہب ہے۔ اسلام کے حوالے سے مسلمان عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ بھی مختلف ممالک میں مختلف نوعیت کا ہے۔ جیسے سعودی عرب میں عورتوں کیلئے لازم ہے کہ وہ عوام میں مکمل طور پر ڈھکی ہوئی ہوں۔ وہ وہاں پر گاڑی نہیں چلا سکتی اور نہ ہی اپنے ووٹ کے حق کیلئے کسی قسم کی جدوجہد کر سکتی ہیں۔ لیکن دیگر مقامات پر مسلمان عورتیں آزادی کیساتھ ملکی سیاست میں حصہ لیتی ہیں، موٹر سائیکلیں چلاتی ہیں۔ اور حسب خواہش بغیر کسی روک ٹوک کے ساڑھی سے لے کر پینٹ، سوٹ تک جو چاہیں پہنچ سکتی ہیں، مصر، شام، ایران، ترکی، ملائیشیا، پاکستان، انڈونیشیا، میں عورتیں ملک کی سربراہ تک بن چکی ہیں، جہاں عورت کی حیثیت متاثر ہوئی وہاں عائلی نظام بھی متاثر ہوا۔[1]

پاکستان اور معاصر عائلی صورتحال

عائلی نظام کی تخریب کی وہ لہر جو سارے عالم میں پھیلتی جارہی ہے ارض پاکستان کی حدود بھی اس سے محفوظ نہیں۔ محمد اقبال کیلانی ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے معاشرے میں چادر و چار دیواری کے اندر کی زندگی کس قدر المناک بن چکی ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد ،دانشور اور پڑھے لکھے مرد وخواتین اسلامی تعلیمات سے رجوع کرتے۔ ازدواجی زندگی میں اسلام نے مرد و عورت کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں ان کا تحفظ کیا جاتا۔ ہمیں اعتراف کرنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ چادر وچار دیواری کے اندر عورت مجموعی طور پر بہت مظلوم ہے۔ اس کی دادرسی ہونی چاہیے، معاشرے میں اسے عزت اور باوقار مقام ملنا چاہیے۔"[2]

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

"یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کا پلڑا ہلکا ہو گیا ہے، شوہر اپنی قوامیت کے مظاہر کے لیے ہر وقت آمادہ نظر آتے ہیں لیکن حسن سلوک کے معاملے میں تہی دست ہیں۔[3]

یہی وجہ ہے کہ عائلی زندگی سنگین مسائل سے دوچار ہے، اور وہ زندگی جو مہر و محبت اور سکون و اطمینان کا

---

[1]۔ جنگ سنڈے میگزین، 2، ستمبر 2007ء، ص 14

[2]۔ کیلانی، محمد اقبال، نکاح کے مسائل، ناشر: مکتبہ بیت السلام، ریاض، ص 12

[3]۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، اسلام میں عورت کا مقام، ناشر: انجمن خدام القرآن لاہور، ص 42

باعث ہونا چاہیے تھی، نفرتوں، عداوتوں اور رنجشوں کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہے۔ حالات گھمبیر صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ خواتین فیملی عدالتوں میں الگ الگ تنسیخ نکاح، حق مہر، نان و نفقہ، جہیز کے سامان کی واپسی کے دعوے دائر کرتی ہیں۔ خواتین ان دعووں کا سبب شوہروں سمیت، ساس، سسر اور نندوں کا طعنہ دینا، تشدد کرنا، خرچہ نہ ملنا، منفی سرگرمیوں میں شامل ہونے کے لیے دباؤ ڈالنا قرار دیتی ہیں۔ پہلے فیملی کورٹس میں گنتی کے چند لوگ اپنے مسائل لے کر آتے تھے، مگر جب سے حکومت نے روشن خیالی جیسے نقطہ نظر کو اٹھایا ہے اور حقوق نسوان کا بل پاس کیا ہے، اس کے بعد سے یہ تعداد سینکڑوں سے ہزاروں تک پہنچ گئی ہے، جو کہ معاشرے کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

عائلی مسائل میں روز افزوں اضافہ

شادی ایک ایسا بندھن ہے جو مرد اور عورت کو پاکیزہ رشتہ میں باندھتا ہے۔ اس بندھن کو قائم رکھنے کے لیے میاں بیوی دونوں میں ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ در اصل، شادی ایک درسگاہ ہے جہاں دو افراد ایک دوسرے کا ساتھی بن کر جینا سیکھتے ہیں، اور جب بچے ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے ایثار و قربانی کرنا سیکھتے ہیں۔ اپنی شخصیت کے نوکیلے چبھتے کونوں کو گول کرنا سیکھتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کے درمیان چھوٹے موٹے اختلافات بڑھ کر انا کا مسئلہ بن جائیں تو شادی کا رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور برداشت کا فقدان ہو جائے، تو چھوٹی چھوٹی باتیں اس مضبوط قصر میں دراڑیں ڈالنے کا باعث بن جاتی ہیں۔ معمولی اختلافات بڑھتے بڑھتے میدان جنگ کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اگر یہ جنگ جاری رہے، تو اکثر اس کا اختتام شکست پر ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی شکست اور بچوں کی ریخت۔ دو خوبصورت دل رکھنے والوں کی شکست، جو کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم ملا کر سفر کرنے کے ارادے سے نکلے تھے، اور زیادہ افسوس اس لیے ہوتا ہے کہ اکثر جوڑوں کی جدائی کا سبب کوئی سنگین وجوہات نہیں، بلکہ معمولی مسائل تھے، اور دونوں یا ان میں سے کوئی ایک رائی کو پہاڑ بنانے کا سبب بنا۔

عصر حاضر میں مفتیان کرام سے پوچھیں ان کے پاس آنے والے مسائل کا تقریباً 80 فیصد اسی شعبہ زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ ماضی میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں خاندان کی عزت کو بچانا ہے، اس لیے سمجھوتا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور انتہائی ناگزیر حالات میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے۔ لیکن آج کل، جبکہ لوگوں میں اسلامی اقدار کا فقدان ہے، ہماری عدالتیں عائلی جھگڑوں سے بھری پڑی ہیں، اور ان میں سے بہت سے جھگڑے معمولی نوعیت کے ہیں جو گھروں پر طے کیے جا سکتے ہیں۔

عائلی مسائل میں اضافہ کی وجوہات

میاں بیوی کے درمیان طبائع کے اختلاف کی بناء پر معمولی شکر رنجیوں کا پیدا ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں ہے لیکن ان اختلافات کا بڑھ جانا اور عائلی عمارت کا زمین بوس ہو جانا اور ان حادثات کی تعداد کا بڑھتے چلے جانا ایک

لمحہ فکریہ ہے ان اسباب و علل کو دور کرنے کی ضرورت ہے جو اس خوبصورت رشتے کے المناک انجام کا باعث بن رہے ہیں، ذیل میں ان اسباب و وجوہ کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں ملاحظہ کیجیے۔

1۔ اسلامی تعلیمات سے بے نیازی

حیات انسانی کا ایک اہم شعبہ ازدواجی زندگی ہے جس میں مرد اور عورت کو ہمدردی، مروت اور محبت کے ساتھ نفع و نقصان کا ساجھی بن کر شریک حیات بننا پڑتا ہے۔ مرد اور عورت کے اس خاص جوڑ اور ملاپ کا اسلامی نام نکاح ہے جو کسی نہ کسی شکل میں ہر ملک اور ہر نسل میں ہمیشہ سے جاری ہے اور انسان جب تک آباد ہے انسانی معاشرت کا یہ سلسلہ بری یا بھلی صورت میں قائم ہے اور رہے گا۔ زندگی کے اس اہم شعبہ میں جس قدر خرابیاں اور نقائص اور بدمزگیاں پیدا ہوتی ہیں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ شادی کرنے والا جوڑا اپنے ازدواجی تعلقات و معاملات میں حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پیغام رحمت اور انکے بتلائے ہوئے نقوش سے مستغنی اور بے نیاز ہو کر اپنی ماری تاری چلانے لگتا ہے جس کے نتائج دونوں یا ایک کی زندگی کے لیے تباہ کن اور دو گھروں کی بربادی کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

شریعت اسلامی نے مسلمانوں کی ازدواجی زندگی کے لیے ایک ایسا نظام عطا کیا جو سادہ اور پاکیزہ ہونے کے علاوہ تمام سابقہ نظاموں سے بہتر تھا۔ ابتدائی اسلامی دور میں اس نظام پر صدق دل سے عمل کیا گیا اور اسلامی معاشرہ ساری دنیا میں ایک اعلیٰ معاشرہ شمار ہونے لگا بعد میں مسلمان عیش و عشرت میں پڑ کر اسلامی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے اور وہ دینی تعلیمات سے غفلت برتنے لگے اس تبدیلی سے اسلامی معاشرے میں بہت سے گھرانوں کا سکون برباد ہونے لگا۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نماز، روزہ کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن اسلامی تعلیمات کے بنیادی تصور تقویٰ سے ناواقف ہوتے ہیں باہم ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی پر توجہ نہیں دیتے۔ طارق رمضان اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’There is an urgent need for education and training not only of girls and women, but also of fathers and all of men , The worst enemy of the rights of woman is not Islam but ignorance and illiteracy, to which we may add the determining role of traditional pregudice[1]
>
> ’’خواتین کے حقوق کے حصول کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ باپوں اور تمام مردوں کی تعلیم و تربیت کی بھی اشد ضرورت ہے۔ عورتوں کے حقوق کا سب سے بڑا دشمن اسلام نہیں بلکہ

[1]۔Islam ,the west and the chellenges of modernity , P:54

جہالت اور ناخواندگی ہے، جس میں ہم روایتی تعصبات کے فیصلہ کن کردار کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔"

منیر احمد خلیلی لکھتے ہیں:

"اسلامی تحریکوں سے وابستہ ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی ہے جن کے افکار و نظریات جن کے اخلاق و کردار اور جن کے عقائد کا ہلکا سا رنگ بھی ان کے خاندان پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ اولاً ایسے گھرانے جہاں صاحب خانہ تحریک و تنظیم کی سرگرمیوں میں گم رہتا ہے اس کے بیوی، بچے، دین کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہیں کرتے، دوسرا یہ کہ ایسے گھرانے جہاں میاں بیوی اور اولاد اور والدین کے اندر ربط و تعلق، ہم آہنگی اور خوشگواری کا فقدان ہے۔ خانگی فضا، درگرمی، جوش باہمی احترام و محبت اور شفقت و پیار سے خالی ہے۔ تیسرا یہ کہ ایسے گھرانے ہیں جہاں مرد جاہلی روایات کے تحت سمجھ بیٹھا ہے کہ محض مرد ہونے کی وجہ سے وہ جابرانہ اور آمرانہ اختیارات کا مالک ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بدو اور بڑھیا کے سوالات کو آزادی رائے کی مثال قرار دینے والا گھر کے اندر اپنی رائے اور اپنے فیصلے سے اختلاف کو سنگین جرم سمجھتا ہے اور ایسے مجرم کو خواہ وہ اس کی بیوی ہو، یا بیٹا، بیٹی سخت سزا کا موجب گردانتا ہے، مذکورہ بالا تینوں رجحان اسلامی تقاضوں اور تعلیمات کے منافی اور خاندانی نظام و استحکام کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔[1]

2۔ عائلی فرائض سے عدم توجہی

اسلام نے ازدواجی زندگی کو مضبوط اور پُر سکون بنانے، اور اختلافات و نزاعات سے بچانے کے لیے زوجین میں سے ہر ایک کے فرائض بیان کیے ہیں۔ اگر ان فرائض کو توجہ اور دل جمعی سے ادا کیا جائے، تو محبت خود بخود بڑھتی چلی جاتی ہے، لیکن اگر ان سے صرفِ نظر کیا جائے، تو باہم نفرت اور کراہت کا رویہ جنم لیتا ہے۔ نفرت کی یہ لہریں نہ صرف زوجین اور اولاد بلکہ دونوں خاندانوں تک محدود نہیں رہتیں، بلکہ بڑھتے بڑھتے پورے معاشرے میں بے سکونی پھیلا دیتی ہیں۔ آج کل مسائل کی کثرت کا ایک سبب زوجین کی ان فرائض سے عدم توجہی بھی ہے۔ اسلام نے عائلی زندگی کی برقراری کے لیے کچھ قواعد و ضوابط دیئے ہیں، اور اگر کسی معقول سبب کی بنا پر زوجین کو علیحدگی کا راستہ منتخب کرنا پڑے، تو بھی "امساک بالمعروف" یا "تسریح بالاحسان "کا حکم دیا اور ان سے منہ پھیرنے والے کو﴿وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾کی وعید سنائی ہے۔[2]

3۔ حسن سلوک کا فقدان

زوجین کے درمیان حسن سلوک ہی اس رشتہ میں مؤدت و رحمت کا باعث بنتا ہے۔ آج کل، اس حسن سلوک کا فقدان ہو گیا ہے، جس کی بناء پر دلوں کی دوری کا سفر تیزی سے جاری ہے۔ عورت مال و دولت سے زیادہ

---

[1]۔ خلیلی، منیر احمد، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، 2004ص245

[2]۔ الطلاق:1

خاوند کی محبت، حسن سلوک اور دلجوئی کی خواہش مند ہوتی ہے۔ شوہر کی جانب سے اگر اس کو محبت کے پھول ملتے رہیں اور نرم و نازک باتوں سے اس کی دلجوئی ہوتی رہے، تو وہ غربت و افلاس میں بھی اپنی زندگی کے دن ہنسی خوشی گزار دیتی ہے۔ لیکن اگر شوہر کی جانب سے اسے ترش روئی اور جھڑکیوں کے طمانچے ملیں، تو مال و دولت کے ڈھیر بھی اس کے لیے کانٹوں کا بستر بن جاتے ہیں۔۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ.))[1]

البانی اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے: قال الشيخ الألباني: حسن، وقال الترمذي: حسن صحيح.[2]

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قید ہیں۔

یہاں تک کہ اگر بیوی ناپسند ہو تو بھی حسن معاشرت کا حکم دیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾[3]

''عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور اگر کسی وجہ سے تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت بھلائیاں رکھ دی ہوں۔''

محمود مہدی لکھتے ہیں:

''بعض لوگ اس لیے گمراہ ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو جنسی ملاپ کی خاطر رکھتے ہیں اس طرح اپنی اہلیہ کی زندگی کو ویران واجیرن بنادیتے ہیں اسے بے نتیجہ اور تنگ و تاریک کر دیتے ہیں، نیک بخت خاوند وہ ہوتے ہیں جو اپنی بیوی کو دوسرے مقاصد کے حصول کیساتھ ساتھ اپنا دوست اور رفیق حیات تصور کرتے ہیں، ہر معاملہ میں اچھا برتاؤ کرتے ہیں جو شادی میاں بیوی کو جنسی ملاپ کے سوا کوئی فائدہ نہ دے اس شادی کو شادی کا نام دینا بھی درست نہیں ہے۔ یہ حسن سلوک محض مرد ہی نہیں عورت کی طرف سے بھی ہونا چاہیے، بیوی بھی شوہر کی طرح اس کے دکھ سکھ، صحت و بیماری، خوشحالی و بدحالی اور جوانی و بڑھاپے میں بھلے سلوک کی کوشش کرے۔[4]

4۔ قوامیت کا نامناسب استعمال

اللہ تعالیٰ نے عائلی نظام کی استواری اور پختگی کے لیے مرد کو قوامیت کا درجہ عطا کیا۔[5] لیکن مردوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنے منصب قوامیت کو عورت کے استحصال کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ قوام کی حیثیت سے وہ یہ معنیٰ نکال لیتے ہیں کہ ان کو حاکم مطلق، اور ڈکٹیٹر کے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ عورت کو اپنی رفیقہ حیات قرار دینے کے

---

[1]۔ القزويني، أبو عبد الله محمد بن يزيد بن ماجة، سنن ابن ماجه، دار الرسالة العالمية، -2009م، ج3، ص57، رقم الحديث: 1851

[2] وقال الترمذي: كتاب الرضاع كتاب: رضاعت کے احکام و مسائل، باب ماجاء في حق المرأة على زوجها، حسن صحيح. رقم الحديث 1163

[3]۔ النساء: 19

[4]۔ خاندانی نظام، اس نشیمن کو بچانے کی فکر کیجیے، ص26۔

[5]۔ النساء: 34

بجائے اپنی لونڈی سمجھنے لگتے ہیں۔ زبان اور ہاتھ کے نارواستعمال کو اپنا حق گردانتے ہیں۔

قوامیت کا مطلب عورت پر حکمرانی نہیں بلکہ اس نگہبانی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک قوامیت کی حدود پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"لوگ بالعموم قوام کا ترجمہ "ایک درجہ برتر" کرتے ہیں حالانکہ قوام کا لفظ اقامہ سے نکلا ہے۔ اقامہ کے معنیٰ ہیں کھڑے ہو جانا، جہاں تک قوام کے معنیٰ کا تعلق ہے تو اس لفظ کے معنیٰ یہ نہیں کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ برتری یا فضیلت حاصل ہے، بلکہ یہ ہیں کہ مرد کی ذمہ داریاں ایک درجہ زیادہ ہیں۔"[1]

قوامیت کے اس غلط تصور نے عورت کی حیثیت کو تباہ کن حد تک متاثر کیا، جس کا اثر عائلی زندگی کی شکستگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جبری شادیاں، عورتوں پر ناروا تشدد، غیر انسانی سلوک، حقوق مثلاً حق مہر، وراثت اور جائیداد سے جبری محرومی کی صورت میں رونما ہوا۔

5۔ بلاوجہ غیرت اور اشتعال

غیرت ایک عمدہ جذبہ جو عزت وعصمت کی حفاظت کے لیے ضروری ہے لیکن دیگر تمام جذبوں کی طرح اگر یہ حد سے بڑھ جائے تو برائی بن جاتا ہے۔ خاوند کی اپنی بیوی کے معاملے میں غیرت متوازن ہونی چاہیے نہ حد سے بڑھ جائے اور نہ حد سے کم پڑ جائے۔ نہ تو عزت وغیرت کے معاملے میں اتنا ڈھیلا پڑ جائے کہ کسی بات کی کوئی پرواہ نہ ہو تو بے غیرت کہلائے دیوث بن جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((ثلاثةٌلايَدخلُونَ الجنةَأبدًا:الدَّيُّوثُ،والرَّجلةُمن النِّساءِ،ومُدمِنُ الخَمرِ))[2]

امام البانی نے اسے صحیح الجامع میں صحیح کہا ہے۔[3]

"تین آدمی کبھی جنت میں داخل نہیں ہوں گے: مردوں میں سے دیوث، عورتوں میں سے جو مرد کی مشابہت اختیار کرے اور دائمی نشہ میں مبتلا رہنے والا شخص۔"

دیوث اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے عزت کی کوئی پرواہ نہ ہو گھر والوں کو بے غیرتی میں مبتلا پائے اور خاموش رہے۔ نہ یہ جذبہ اتنا بڑھ جائے کہ بلاوجہ بیوی پر شک کرنے لگے حد سے بڑھی ہوئی غیرت بھی ازدواجی جھگڑوں کا سبب بنتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مِن الغَيرةِمايحبُّ اللهُ،ومنهامايُبغِضُ اللهُ:فأماالتي يُحبه الله ﷻ فالغَيرةُفي الرِّيبةِ،وأماالتي يُبغِضُهافالغَيرةُفي غيرِريبةٍ))[4]

"غیرت کی ایک صورت وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور ایک صورت وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا

---

[1]۔ ذاکر نائیک، ڈاکٹر، مترجم: سید امتیاز احمد، اسلام میں خواتین کے حقوق جدید یا فرسودہ، دار النوادر لاہور، ص 38

[2]۔ البیهقي، أبو بکر أحمد بن الحسین، شعب الإیمان، مکتبۃ الرشد للنشر والتوزیع بالریاض، 2003، ج7، د412، رقم الحدیث: 10799

[3]۔ صحیح الجامع، رقم الحدیث: 3061

[4]۔ سنن أبي داود، کتاب الجهاد، باب في الخیلاء في الحرب، ج4، ص294، بیروت، رقم الحدیث: 2659

ہے، جس غیرت کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ شک کے موقع پر غیرت ہے اور جس غیرت کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے وہ شک کے بغیر غیرت کرنا ہے۔"

البانی نے صحیح الجامع میں اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔[1]

لہٰذا، حد سے بڑھی ہوئی غیرت ہی ہے جس کی وجہ سے ذرا سی شک پر خواتین کو قتل کر دیا جاتا ہے، اور کاروکاری کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ بعض معاملات میں عورتیں اپنی عزت و عصمت کی حفاظت سے غافل ہو جاتی ہیں، جو نیک عورت کی بنیادی صفات میں سے ہے۔ یہ بات بھی عائلی مسائل کا سبب بن جاتی ہے۔ میڈیا کی وجہ سے معاشرے میں اخلاقی کرپشن بڑھ گئی ہے خواتین مردوں پر ایسے ایسے الزام لگاتی ہیں کہ سنتے ہوئے شرم آجاتی ہے۔

6۔ازدواجی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی

نکاح کے وقت جب ایک جوڑا رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتا ہے تو ان کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ اب انہوں نے زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ ملازموں کی طرح مل جل کر کام کرنا ہے، اور زندگی کی گاڑی کو جیسے تیسے بن پڑے گھسیٹتے ہوئے دن پورے کرنے ہیں۔ بلکہ مرد و عورت کا آپس میں ایک جسمانی رشتہ بھی ہوتا ہے۔ جب تک میاں بیوی ایک دوسرے کے جسمانی حقوق ادا کرتے رہیں، ایک دوسرے کے جذبات کی تسکین ہوتی رہے گی۔ اگر ان حقوق کی ادائیگی میں کسی فریق کی حق تلفی ہو تو یقین کر لیں، دلوں میں دراڑ پڑنے لگ جائے گی۔ کیونکہ شادی کا ایک بنیادی مقصد باہم زوجین کی جنسی ضرورت کا پورا ہونا بھی ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک بیوہ عورت سے شادی کر لی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((فَهَلَّا جَارِيَةً تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ)) [2]

"نوعمر لڑکی سے شادی کیوں نہ کرلی کہ تم اس کے ساتھ کھیلتے اور وہ تمہارے ساتھ کھیلتی"۔

مرد کی فطری ضرورت کو پورا کرنا بیوی کیلئے ضروری ہے اور بیوی کی ضرورت کو پورا کرنا مرد کیلئے ضروری ہے، کیونکہ فطری حقوق میں کوتاہی میاں بیوی کو آپس میں متنفر کر دیتی ہے۔ ان کی ایک دوسرے سے دلچسپیاں ختم ہونے لگتی ہیں۔ ان حقوق میں کوتاہی اگر مرد کی طرف سے ہو تو عورت کے دل میں بدگمانیاں کیساتھ ساتھ مرد سے نفرت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مرد کے بھی بیوی پر کچھ حقوق ہیں، اگر بیوی انہیں پورا نہ کرے تو مرد کے دل میں نفرتوں کا الاؤ پکنے لگتا ہے۔ مرد اپنی بعض مصروفیات کی بناء پر عورتوں کی طرف توجہ کم کر دیتے ہیں، حالانکہ بیوی کو مسلسل توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھریلو امور، بچوں کی پرورش و تربیت میں پڑ کر یا بعض اوقات ملازمت کے مسائل میں الجھ کر، بیوی میاں سے اعراض کا رویہ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح گھریلو سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے۔

---

[1] ۔ صحیح الجامع-رقم الحدیث:2221

[2] ۔ صحیح البخاري، کتاب النکاح، باب: تستحد المغیبة و تمتشط، ج7 ص66،، رقم الحدیث:5247

7۔ عورت کی گھریلو ذمہ داریوں سے لاپرواہی

اسلام نے اندرون خانہ کام کی ذمہ داری عورت پر ڈالی ہے کہ عورت کو ان ذمہ داریوں کا شعور ہونا چاہیے۔ ان کاموں کی ادائیگی کی تربیت حاصل کرنا بھی اس پر لازم ہے۔ بعض اوقات خواتین کا اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے منہ موڑنا عائلی جھگڑوں اور مسائل کا سبب بن جاتا ہے۔ لڑکیوں کی اس انداز میں تربیت ضروری ہے کہ وہ گھریلو امور کو بہتر طریقے پر سر انجام دے سکیں، اور افراد خانہ کے ساتھ مضبوط روابط قائم کر سکیں۔

شادی کے بعد عورت نے خود کو اس نئے ماحول میں ڈھالنا ہوتا ہے، بہت سی باتوں کو فراموش کرکے نئ چیزوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اس انقلاب کو قبول کرنے کی تیاری دراصل والدین کے گھر ہوتی ہے، لیکن جو والدین اس نہج پر اپنی لڑکی کی تربیت نہیں کرتے، سسرال اس کے لیے ذہنی وجذباتی لحاظ سے اذیت گاہ بن جاتا ہے۔ آج اگر سروے کیا جائے تو مثالی گھرانے شاید چراغ لے کر بھی نہ ڈھونڈے جا سکیں۔ متعدد گھرانے ایسے ہیں کہ ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی میاں بیوی اجنبی ہیں۔ ایک ساتھ کھانے کے باوجود دل پھٹے ہوئے ہیں۔ میاں بیوی میں ذہنی طور پر بعد المشرقین ہے، لیکن مجبوریاں ہیں جنہوں نے ایک کو دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ میاں بیوی اور بچوں کے حقوق کی ادائیگی تو دور کی بات، ان کے بارے میں اثریت سے نابلد و ناآشنا ہیں۔

8۔ عورت کی ملازمت

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عورتوں کی طبعی ذمہ داریاں یا فطری وظائف اندرون خانہ سے متعلق ہیں، اسی لیے اسے ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾[1] کا حکم دیا ہے۔ انسان کی عائلی زندگی میں سب سے بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب عورت اپنے فطری مقصد تخلیق سے بے نیاز ہو کر اور اپنے جگر گوشے کو اپنے دل میں سموئی ہوئی موسیقی سے محروم کرکے گھر سے باہر قدم نکالتی ہے اور مرد کے ساتھ کسب معیشت میں شریک ہو جاتی ہے۔[2]

زینب الغزالی[3] لکھتی ہیں:

---

[1]۔ الأحزاب:33

[2]۔ مظہر علی ادیب، خاتون خانہ، ناشر: مکتبہ ذکریٰ، رامپور، 1979، ص 91

[3]۔ سیدہ زینب الغزالی (1917ء-2005ء) ۸۸ سال کی عمر میں ایک پُر آشوب' ابتلاو آزمایش سے بھرپور' عزیمت و عظمت سے مالامال اور ہر لحاظ سے سعید و کامیاب زندگی گزار کر 8 اگست 2005ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملیں ___ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

زینب الغزالی مصر کے ایک گائوں میتِ عمر میں ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد بہت نیک نہاد مسلمان اور تاریخِ اسلام سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ بچپن ہی سے زینب کے سامنے تاریخِ اسلام اور سیرتِ صحابیاتؓ کے زریں واقعات کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ انھوں نے آنحضور ﷺ کی مجاہد صفت صحابیہ نُسیبہ بنتِ کعبؓ کو ان کے جہادی کارناموں کی وجہ سے اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا۔ زینب الغزالیؒ کے عنفوانِ شباب میں مصر میں اخوان المسلمون کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ نوجوان زینب نے امام حسن البنّاؒ کی دعوت کو اپنے دل کی آواز جانا اور اس دعوت کا حصہ بن گئیں۔ امام حسن البنّاؒ سے اپنے بھائی

"آزادی اور ملازمت کا شوق آج عورت کو اسکے اصل مرکز عمل اور حقیقی کارگاہ حیات یعنی اس کے گھر سے اسے باہر نکال کر لے گیا ہے۔ یہ خود عورت کیلئے اور مجموعی طور پر مسلم معاشرے اور ملت کیلئے سب سے بڑا گھمبیر مسئلہ بن گیا ہے، اسکا حل یہ ہے کہ عورت پلٹ کر اپنی قلمرو میں آجائے اور باہر کے مسائل مرد پر چھوڑ دے۔ ناگزیر حالات کے سوا گھر سے باہر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنائے۔ نسلوں کو چند ٹکوں کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے اس طرح اولاد ہی ضائع نہیں ہو رہی بلکہ ازدواج کے وظائف بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی عمارت بدم وشکست اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہے۔ خاندانی نظام استحکام سے متزلزل ہو رہا ہے۔[1]

منیر احمد خلیلی لکھتے ہیں:

"جدید دور میں شیطانی نظام کے اندر عورت نے گھر سے نکل کر خود کمائی کرنے اور خود کفالتی کا درجہ پانے کے لیے جدوجہد شروع کی تو اس کا سب سے بڑا اثر خاندانی نظام، ازدواجی رشتے اور کانگی ماحول پر پڑا عورت نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب وہ شوہر کی محتاج نہیں رہی جب اپنی معاش خود کما رہی ہو تو شوہر کی اطاعت اس پر کہاں لازم رہی ہے۔ یہی سوچ آزادی نسواں کے نظریے کی بنیاد بنی۔ اسی نے خاندانی نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اسی وجہ سے شادی ایک کھیل بن گئی۔ اور طلاق ایک معمول۔ اسلام کی اپنی تعلیمات ہیں اور زندگی کے بارے میں اپنے خاص اصول ہیں، اسلامی نظام میں رشتہ ازدواج کی استواری پاکیزہ معاشرے کی تعمیر کا ذریعہ، ایک سماجی ذمہ داری، ایک شرعی تقاضا اور نبوی سنت ہے۔"[2]

9۔ زوجین کے انتخاب کے غیر مناسب معیار

زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے اخلاق و کردار سے متاثر ہوتا ہے، اس لیے زوجین کے انتخاب میں دینداری اور تقویٰ کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے حسب نسب، مال، جمال، اور دینداری میں سے دین کو ترجیح دینا کا حکم دیا۔[3]

عصر حاضر میں یہ رجحان چل نکلا ہے کہ لوگ دین دار رشتے تلاش نہیں کرتے، بلکہ اکثر تو دینداری کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے۔ حسن و جمال، دولت و شہرت، نوکری، کاروبار، زمین و جائیداد اور دنیاوی علم و ہنر ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے، اور اس میں بھی معیار اتنا اونچا رکھا جاتا ہے کہ تلاش کرتے کرتے عمر ہی گزر جاتی ہے۔ بالخصوص امارت

کی معیت میں ملاقات کی اور انھی کی ہدایت پر 1947ء میں خواتین کو منظم کرنے کا کام جاری رکھا جو امام البنّا سے ملاقات سے قبل بھی وہ کر رہی تھیں۔ مردوں میں امام البنّا نے تحریک کی بنیاد رکھی تو خواتین میں یہ کارنامہ زینب الغزالی کے حصے میں آیا۔ (زینب الغزالی۔ ایام من حیاتی۔ قاہرہ: دار الشروق، 1987، ص 15)

[1] ۔ مسلمان عورت کا اصل مسئلہ، ص 9۔

[2] ۔ منیر احمد خلیلی، خاندانی نظام، اس نشیمن کو بچانے کی فکر کیجیے، ص 33

[3] ۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب مایؤمر بہ من تزویج ذات الدین، ج 1، ص 295، رقم الحدیث: 2047

کو بہت زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن جب انسان گھروں کو بساتے وقت صرف ظاہری شان و شوکت اور نمود و نمائش کو مد نظر رکھتا ہے، تو گھر بنتے نہیں، ٹوٹتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں رشتے طے کرتے وقت حسب نسب کیساتھ ساتھ لڑکی کی سیرت اور صورت کو پرکھا جاتا تھا، اور جس گھر میں سگھڑپن، اخلاق و اطوار اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی ہوتی، چاہے مالی حیثیت میں کم ہوتی، ہر ایک کی خواہش ہوتی تھی کہ اس کو بہو بنا کر گھر لائے تاکہ گھر جنت کا نمونہ بن جائے۔(1)

جس طرح بیوی کا اچھا ہونا ضروری ہے، اسی طرح شوہر کے انتخاب میں بھی اخلاق و کردار، دینداری اور تقویٰ کو معیار بنانا چاہیے۔ بعض لوگ اپنی بیٹی کا رشتہ اس طرح کر دیتے ہیں جیسے کوئی بکری کسی کو بیچی جا رہی ہو۔ اب بکری لینے والے کی مرضی ہے، اسے گھاس کھلائے یا اسے ذبح کرے۔ کتنے بے رحم اور ظالم ہوتے ہیں وہ ماں، باپ جو اپنی بچی کا رشتہ کسی نالائق اور بد فطرت انسان سے صرف مالی لالچ کی بنیاد پر کر دیتے ہیں۔ پھر بیٹی کو دنیا میں ہی جہنم مل جاتی ہے۔[2]

اسی طرح رشتوں کے انتخاب میں بعض اوقات لڑکی یا لڑکے کی پسند کو مد نظر نہیں رکھا جاتا۔ جبری، بے جوڑ اور ناپسند کی شادیاں بھی مسائل کے انبار میں اضافے کا باعث بن رہی ہیں کیونکہ شادی صرف جسم کا ہی نہیں بلکہ روح اور دل کا تعلق بھی ہے۔ ناپسندیدہ ماور میں بدن تو مجبوراً اطاعت کر ہی لیتا ہے جبکہ دل اور روح کو اطاعت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا یوں بے دل، بے روح رشتہ فریقین کے لیے مؤدت اور رحمت اور سکون و اطمینان کی بجائے نفرتوں، کراہتوں اور شکر رنجیوں کا باعث بن جاتا ہے۔

10۔ علاقائی رسوم و رواج کی پیروی

اسلامی تعلیمات سے دوری اور بے نیازی کے باعث مسلمانوں نے ازواجی معاملات کے بارے میں علاقائی رسوم و رواج کا اثر قبول کیا۔ اسلام مختلف علاقوں میں پھیلا، اور جغرافیائی حالات و زمانی تغیرات کی بناء پر ہر علاقے کے رسوم و رواج میں فرق ہوتے ہیں۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے بے نیازی کی وجہ سے ہر شعبہ زندگی میں رسوم و رواج نے اثر ڈالا، اور ازدواجی زندگی کی تشکیل و تنظیم اور تفریق سے متعلقہ معاملات پر بھی اثر پڑا۔ بطور خاص عورت کی حیثیت اور اس کے بارے میں علاقائی رسوم و رواج نے عائلی زندگی میں بے شمار مسائل کو جنم دیا ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> "The second cause is the influenced of non-Muslim Culture.Due to this influence several customs and superstitions that are opposed to the Muslim marital Law and its sprit , have found their way into the martital relations of Muslims. The result is the Islamic concept of marital

---

1۔ منیر احمد خلیلی، خاندانی نظام، ص34۔

2۔ ابو یاسر، الشیخ، ہماری شادیاں ناکام کیوں؟ ناشر: نعمانی کتب خانہ لاہور، 2006ء ص13

relationship has been wiped off the minds of a great majority. in many cases the Hindu concept prevails reducing the wife to the status of a slave and elevating the husband to status of lord or a God[1]

انگلینڈ کی ایک خاتون محترمہ عائشہ لیمو لکھتی ہیں:

"عورت کی حیثیت کے بارے میں ہر ملک میں جو تصورات موجود ہیں ان کا انفرادی طور پر الگ الگ جائزہ لینا چاہیے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں اسلام سے پہلے جو تہذیبی اثرات کارفرما تھے، ان کے زیر اثر یا اسی طرح جدید ثقافتی عوامل کے تحت جو علاقائی رسوم ورواج بروئے کار آئے ان کی وجہ سے یہ تصورات ہر دور اور ہر ملک میں ایک دوسرے سے بہت مختلف رہے۔[2]

ڈاکٹر علی شریعتی[3] ان رسوم ورواج سے ہمارے عائلی معاملات کے متاثر ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مذہب کا تعلق وحی والہام سے ہے، جبکہ اجتماعی روایات کا تعلق اجتماعی نظام سے ہوتا ہے اور مختلف ادوار میں قوموں اور قبیلوں کے رسم ورواج بدلتے رہے ہیں۔ ہم نے ان متضاد حقیقتوں کو مخلوط کر کے ایک آمیزہ تیار کر لیا ہے اور اس کو ایسے قالب میں ڈھالا ہے جس کا تعلق قبائلی اور موروثی رسوم ورواج سے ہے اور ہم ان رسوم ورواج کو مذہب کے نام پر تحفظ دینا چاہتے ہیں۔"[4]

11۔ دیگر اقوام کے ساتھ معاشرت کے اثرات

عمر احمد عثمانی، احمد امین مصری کی کتاب "ضحیٰ الاسلام" کے ترجمہ "اسلام پر کیا گزری" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ پر طائرانہ نگاہ ڈالیے۔ یہاں کچھ تو ہندوستان کے قدیم باشندے تھے جو پہلے سے یہاں بود و باش رکھتے تھے، جن کی تہذیب وثقافت تھی اور اپنی رسوم وتقلیدات تھیں، محمد بن قاسم کے حملے کے ساتھ عرب اقوام نے ادھر کا رخ کیا اور وہ یہاں آکر آباد ہو گئیں، ان کی بھی اپنی زبان اور اپنی ثقافت اور اپنی رسوم وتقلیدات تھیں۔ اس کے بعد ایرانی، افغانی، ترکی اور تاتاری قوموں نے ادھر کا رُخ کیا اور ہر قوم اپنے ساتھ اپنی زبان، ثقافت، اور اپنی رسوم وتقلیدات لے کر آئیں۔ یہاں کے قدیم باشندوں میں سے ایک جم غفیر اسلام میں داخل ہوتا رہا۔ اس کے بعد اختلاط وامتزاج کا عمل شروع ہوا اور اثر اندازی اور اثرپذیری سے کچھ عرصہ کے بعد ہندی مسلمانوں کی جو مرکب زبان، مرکب ثقافت، مرکب رسوم وتقلیدات تیار ہوئیں وہ ہمارے سامنے ہیں کہ ان کی زبان ان تمام زبانوں کا مجموعہ اور ان کی تہذیب تمام

---

[1]-The Laws of Marriage and Divorce in Islam,P:3.

[2]-Aysha Lemu, woman in islam,P:26

[3] ۔ عالم اسلام کے مشہور دانشور اور انقلابی مفکر ڈاکٹر علی شریعتی کی تاریخ پیدائش 23 نومبر 1933ء ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی ایران میں مشہد کے مضافات میں میزنن کے مقام پر پیدا ہوئے تھے۔ 18 برس کی عمر میں انھوں نے تدریس کے پیشے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ 1964ء میں انھوں نے فرانس کی مشہور سوربون یونیورسٹی سے سوشیولوجی میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وطن واپسی پر وہ دوبارہ مشہد یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔

[4] ۔ علی شریعتی، ڈاکٹر، مسلمان عورت اور دور حاضر کے تقاضے، مترجم: پروفیسر سردار نقوی، ادارہ احیائے تراث اسلامی، 1988ء، ص 47۔

تہذیبوں کا ایک معجون مرکب ہے۔[1]

مولانا محمد تقی عثمانی انہی اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"ہندوستان میں مغربی تسلط کا دور اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کے لیے تاریک ترین دور تھا، ایک طرف تو غیروں کے تسلط کی وجہ سے ان کے عائلی قوانین ٹھیک ٹھیک قرآنی ہدایات کے مطابق نہ رہے۔ دوسری طرف ہندوؤں کے ساتھ شب وروز اختلاط نے ان کی معاشرے میں بے شمار ایسی رسمیں پیدا کر دی جو نہ صرف اسلامی اصولوں کے بالکل خلاف تھیں، بلکہ بڑی انسانیت سوز، انتہائی وحشیانہ، اور سخت ظالمانہ تھیں۔ اس طرح اس قوم نے جس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ایک بڑا متوازن اور سو فیصد فطری نظام موجود تھا، غیروں کے طور طریق اختیار کر کے اپنے آپ کو تباہ کن رسموں میں جکڑ لیا۔ حلالات کی اس تبدیلی کا سب برا اثر بیچاری عورت پر پڑا اور اس تمام عرصہ میں یہ غریب ظلم و ستم کے دہکتے الاؤ میں پڑی سسکتی رہی۔[2]

12۔ حقوق نسواں سے متعلق خواتین کی ناواقفیت

مسلمانوں میں رفتہ رفتہ حقیقی اسلامی تعلیمات سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور اسلام محض نماز، روزہ، زکوۃ اور قرآن کی تلاوت تک محدود ہو گیا۔ خواتین کی اکثریت اپنے ان حقوق و فرائض سے ناواقف رہی جو عائلی زندگی اس کو عطا کرتی ہے۔ اس کے فرائض تو طاقتور طبقہ (مرد) اسے یاد دلاتے رہے لیکن اکثر اس کے حقوق سے روگردانی کی گئی۔ دیگر اقوام کے ساتھ معاشرت نے اس کی حیثیت کو بہت متاثر کیا۔ نکاح کے معاہدہ میں برابر حیثیت کی رکن ہونے کے باوجود نکاح کے بعد اکثر اس کی زندگی لونڈی جیسی رہی۔[3]

عام مسلمان اپنے اس یقین اور ایمان کا زبان سے اظہار تو کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں، وہ خدا تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں۔ یہ حقوق لازماً ادا ہونے چاہئیں۔ ان میں ترمیم و تنسیخ کو وہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں براہ راست مداخلت تصور کرتے ہیں، اور اسے روکنے اور اس قانون کی صحیح شکل میں باقی رکھنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں، لیکن عملاً وہ ان احکام کے پوری طرح پابند نہیں ہیں، بلکہ قدم قدم پر ان کی خلاف ورزی ان سے ہوتی رہتی ہے۔ باپ بیٹی کے حقوق ادا نہیں کرتا، اس کی تعلیم و تربیت کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنی کہ لڑکوں کی طرف دی جاتی ہے۔ لین دین میں دونوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ مختلف بہانوں سے وہ حق وراثت سے محروم رکھی جاتی ہے۔ ماں اور باپ کے ساتھ اولاد کا رویہ عموماً شادی اور گھر بسانے کے بعد بہت غلط ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہوتا، ان کے قانونی حقوق ادا نہیں کیے جاتے ہیں۔ اگر ان کے پاس کوئی

---

[1]۔ احمد امین، پروفیسر، اسلام پر کیا گزری، مترجم: مولانا عمر احمد عثمانی، مقدمہ، ناشر: دوست ایسوسی ایٹس، لاہور، ص 2۔

[2]۔ عثمانی، محمد تقی، مفتی، ہمارے عائلی مسائل، ناشر: دار الاشاعت کراچی، ص 11۔

[3]۔ عمری، سید جلال الدین، اسلام میں عورت کے حقوق، ناشر: اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ص 13۔

ذریعہ معاش نہ ہو تو وہ عسرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بیوی کو شوہر سے محبت نہیں ملتی، سسرال میں اس کے ساتھ ملازمہ کی طرح سلوک ہوتا ہے، وہ اپنے بہت سے حقوق سے محروم رہتی ہے۔ بات بات پر سختی شروع ہو جاتی ہے، معمولی اختلافات طلاق کا بہانہ بن جاتے ہیں، مہر کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وہ طلاق کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ طلاق نہ ہو تو اس کے ادا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

13۔ پیچیدہ عدالتی نظام

نکاح دو مختلف مزاج، طبائع اور دلچسپیاں رکھنے والے افراد کے درمیان معاہدہ ہے۔ طبائع کے اختلاف کی بناء پر چھوٹی چھوٹی شکر رنجیوں کا امکان تھا۔ اسلام نے اس رشتہ کو پائیداری بخشنے کیلئے اخلاقی تعلیمات فراہم کیں۔ آپس میں حُسن سلوک، درگزر، عفو، خیر خواہی، محبت اور ہمدردی کا سبق دیا۔ ان عائلی معاملات میں ''احسان'' اور "معروف'' کو اختیار کرنے کی تاکید کی۔ ان معاملات کو تقویٰ سے وابستہ کر دیا، لیکن اگر اختلافات بڑھ کر نزاعات کی صورت اختیار کر لیں، باہمی معاملات، شقاق، نفرت، عداوتوں کا شکار ہو جائیں، تو محض اخلاقی تعلیمات ہی کافی نہیں ہوتیں، بلکہ قانون اور عدالت کا موجود ہونا بھی ضروری ہے، جو فریقین میں کمزور کا تحفظ کر سکے اور ان کو ان کا حق دلا سکے۔ اس لیے اسلام نے ''قضائے شرعی'' کا ہموار اور واضح رستہ عطا کیا۔ سیرت طیبہ اور اسلامی تاریخ میں بے شمار مثالیں موجود ہیں، جہاں لوگوں نے عائلی دکھ درد کی دوا حاصل کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے مسائل کا قانونی حل حاصل کیا۔[1]

عصر حاضر میں اخلاقی تعلیمات کا اثر بھی انسانی طبائع پر بہت کم ہو گیا ہے۔ باہم خیر خواہی اور احساس جوابدہی کم ہو گیا ہے۔ معمولی معاملات، جن کا علاج محض صبر، درگزر، حسن سلوک اور عفو درگزر سے ہی ہو سکتا تھا، بڑھ کر نزاعات کی صورت اختیار کرنے لگ گئے ہیں۔ اس لیے عدالتوں میں عائلی جھگڑوں کے انبار لگے ہیں۔ عمومی عدالتوں کے علاوہ فیملی کورٹس بھی قائم کی گئی ہیں، لیکن جھگڑوں کی کثرت اور عدالتوں کے پیچیدہ اور سست نظام کی بناء پر عائلی مسائل کا جلد اور بروقت مداوا ممکن نہ ہو سکا۔ غیر ضروری تاخیر اور انصاف کے تقاضے مکمل طور پر بجالانے میں ناکامی کے باعث عوام میں یہ تاثر فروغ پا رہا ہے کہ فیملی کورٹس لوگوں کو تاریخوں کا ایک لامتناہی سلسلے میں الجھا کر شدید ذہنی اور مالی مسائل سے دوچار کر دیتی ہیں۔ ان عدالتوں سے زیادہ تر شکایات خواتین کو ہیں، لیکن مرد حضرات بھی خوش دکھائی نہیں دیتے ہیں۔

14۔ دونوں خاندانوں کا معاندانہ رویہ

شادی محض دو افراد کے عقد نکاح میں بندھنے کا نام نہیں بلکہ دو خاندانوں کے ملاپ کا نام ہے اس اس رشتہ

[1]۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الخلع، الطاف اینڈ سنز، کراچی، ج 3، ص 1509 رقم الحدیث: 5273

اور تعلق کو اتنی زیادہ اہمیت دیتا ہے کہ صہری رشتوں کو اپنی نشانی قرار دیا ہے۔[1] مرد کے لیے عورت کے خاندان کے کچھ رشتے اور عورت کے لیے مرد کے خاندان سے کچھ رشتے حرام ہیں۔[2]

یعنی اس تعلق کو نسبی تعلق کی طرح شرف و احترام بخشا ہے۔ یہی دونوں طرف کے رشتے اصل میں اس نئے تعلق اور رشتے کو بنانے اور برقرار رکھنے کا باعث بنتے ہیں، بیوی اپنے والدین، بہن بھائی، اور بے شمار دلچسپیاں اور روابط چھوڑ کر سسرال میں جا آباد ہوتی ہیں۔ اگر یہ گھر اس کے لیے ٹھنڈی چھاؤں بن جائے تو وہ خوش ہوتی ہے اور یہ خوشی اس کی آبادی کا باعث بن جاتی ہے، لیکن اگر یہ سرزمین اس کے لیے گرم اور خشک ہو جائے تو وہ جلد ہی نازک پودے کی مانند کملا جاتی ہے۔ اس لیے سسرال کو خوش دلی سے اس نئے فرد کے اپنے خاندان میں اضافے کو برداشت کرنا چاہیے اگر اس کی عادت میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ہوں تو اس کو حسن سلوک سے دور کرنا چاہیے اور عورت کو بھی چاہیے کہ وہ اعلیٰ ظرفی اور حُسن خلق کا ثبوت دے۔ اگر لڑکے کے انداز و اطوار میں کوئی کمی ہو یا حسن سلوک کا فقدان ہو تو اس کے اپنے خاندان والے اس کی اصلاح کر سکتے ہیں جبکہ لڑکی کی خامیوں کو اس کے اہل خانہ دور کر سکتے ہیں، لیکن عصر حاضر میں عائلی نظام کی ناکامی کا ایک بڑا سبب دونوں خاندانوں کا نامناسب رویہ ہے، دونوں خاندان ایک دوسرے کو محبت سے نہیں ملتے بلکہ تنقید اور اعتراضات کی دو دھاری تلوار چلتی ہے اور ساری محبتوں کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ بعض گھرانوں میں ساس بہو کے اختلافات کی وجہ سے بہت سے مسائل پیش آتے ہیں۔ کئی وجوہات اس کا باعث بنتی ہیں بعض اوقات ساس کا کردار ایسا مثالی ہوتا ہے جس تک پہنچنا بہو کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ اس لیے شوہر اس کو پسند نہیں کرتا۔ شوہر اور بیوی ہر معاملے میں ساس کو ملامت کا نشانہ بناتے ہیں مثلاً اگر بیوی شام کا کھانا تیار کرنے میں تاکیر کرتی ہے تو شوہر اس کو اسکی والدہ کی عدم تربیت کا طعنہ دیتا ہے۔ اس طرح اس کے دل میں ساس کے ساتھ نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اولاد ایک بہت بڑا نفسیاتی سرمایہ خیال کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے ساس موما فرد کے اپنے دل میں محبت کے جذبات نہیں رکھتی جس نے اس کی اولاد چھین لی ہو، وہ ساس جس نے سال ہا سال تک اپنا وقت اولاد کی تربیت اور نگرانی کے لیے وقف کیا ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ بات تسلیم کرنی مشکل ہو جاتی ہے کہ ایک نئی خاتون اس کے سارے معاملات سنبھال لے۔[3]

عائلی بگاڑ اور شیطانی حربے

ابتدائے آفرینش سے ہی شیطان انسان کا دشمن بن گیا اور اس نے گمراہ کرنے کے لیے چہار اطراف سے

---

[1] ۔الفرقان:25

[2] ۔النساء:123

[3] ۔ابو یاسر، الشیخ، ہماری شادیاں ناکام کیوں؟ ناشر: نعمانی کتب خانہ لاہور، 2006ء، ص44

انسان کو اپنے دام میں پھانسنے کے لیے کوشش جاری رکھیں۔ اسی لیے قرآن نے انسان کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾ [1]

اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

شیطانی کوششوں کا ہدف ابتداءہی سے عائلی زندگی کا بگاڑ رہا ہے کیونکہ عائلی زندگی ہی انسانی اجتماع کی خشت اول ہے۔ اگر اجتماع میں بگاڑ پیدا کرنا ہو تو عائلی زندگی کو خراب کر دو، قرآن کریم نے اسی ہدف کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾ [2]

اس سے وہ میاں اور بیوی کے درمیان جدائی ڈلواتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے لشکر بھیجتا ہے، اس کے نزدیک اس شیطان کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ فتنہ پرور ہو۔ ایک شیطان ابلیس کے پاس آتا ہے اور اس کو اطلاع دیتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کیا ہے۔ ابلیس کہتا ہے ہے تونے کچھ نہ کیا، اس کے بعد ایک شیطان آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں شخص کی جان نہ چھوڑی یہاں تک اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔" [3]

آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان کو اس کو اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے تونے اچھا کام کیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ شیطان کے اس حربے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس میں راز یہ ہے کہ اگر دوسروں سے عداوت ہو تو اس اس کا اثر دوسروں تک نہیں پہنچتا اور میاں بیوی میں لڑائی وطلاق ہو جائے تو دونوں خاندان میں جنگ ہوتی ہے۔ دو لوگوں کی عداوت پیدا کرے بس وہ دو میاں بیوی میں عداوت کروادیتا ہے اس سے خود بخود دور تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔" [4]

شیطان کے عائلی زندگی پر اثر انداز ہونے کی کئی صورتیں ہو سکتیں ہیں، ایک تو وہ شیطان جو ہر انسان کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ بعض اوقات رشتہ داروں، عزیزوں میں سے کوئی رشتہ دینا یا لینا چاہتا ہے ناکامی کی صورت میں انتقاما جادو کروادیا جاتا ہے تاکہ میاں بیوی کے دل جڑے نہ رہیں اور شادی ناکام ہو جائے۔ ساس بہو کے جھگڑے میں بھی اس کا سہارا لینے کا رواج بڑھتا جارہا ہے کبھی ساس کی طرف سے بیٹے کو صرف اپنا مطیع بنانے کے لیے اور کبھی بہو کی طرف سے صرف اپنا غلام بنانے کے لیے اسے سحر تفریق کہا جاتا ہے۔

---

[1] ۔البقرۃ:168

[2] ۔البقرۃ:102

[3] ۔ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری، صحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب تحریض الشیطان وبعثہ سرایہ، رقم الحدیث:2812

[4] ۔تھانوی، اشرف علی، تحفہ زوجین، ناشر: مکتبہ عمر فاروق، کراچی، ص129

میاں بیوی کے درمیان اکثر و بیشتر اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن بہت جلد ختم بھی ہو جاتے ہیں اور زندگی فطری انداز کے مطابق رواں دواں رہتی ہے مگر کچھ عورتیں بے صبری کا مظاہرہ کرتی ہیں اور بہت جلد جادو گروں کا رخ لیتی ہیں، کبھی خاوند اس کیوجہ سے بیمار پڑ جاتا ہے، بعض اوقات کانو دبیوی سے محبت کی بجائے نفرت وبغض کرنے لگتا ہے، اسلامی تعلیمات سے دوری کی بناء پر لوگ شیطان کے شر سے بچنے کیلئے مسنون دعائیں اکثر لوگ نہیں پڑھتے۔ ایمان کی کمزوری کی بناء پر اختلافات کے حقیقی اسباب وعلل پر غور کرنے اور انہیں دور کرنے کی بجائے اکثر لوگ جھوٹے پیروں، فقیروں کے دربار پر حاضری دیتے ہیں اور ایمان کے یہ سوداگر عمل سے بے بہرہ، ایمان سے کورے لوگ گلی گلی گھات لگائے بیٹھے ہیں، کمزور اعتقاد عورتیں ان کے دام فریب میں پھنس کر نہ صرف مالی خسارہ برداشت کرتی ہیں بلکہ آپس کے معمولی اختلافات کو ہوا دے کر نزاعات اور مجادلات بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

15۔ذرائع ابلاغ کے اثرات

شادیوں کی ناکامی اور ازدواجی اختلافات میں ٹی وی، فلموں، ڈراموں، فضول افسانوں، اور ناولوں پر مبنی رسالوں نے بھی بہت اہم کردار اور تربیت کا معاملہ ہو۔گھر کے اندر ماں اور باپ کے درمیاں مکالمہ ہو، میاں بیوی کے تعلقات کا معاملہ ہو، گھر کی خواتین کے رویے کا معاملہ ہو، ان میں سے ہر چیز آج براہ راست مغربی حملے کی زد میں ہے، تاتاریوں نے شاید کبھی یہ پوچھا ہو گا کہ جامعہ ازہر میں پڑھایا جارہا ہے۔ آج خواتین کے حقوق، آزادی نسواں تحفظ نسواں، بہبود آبادی، ہو یا مدارس کی تعلیم ہر معاملہ پر عصری سامراج اثر انداز ہونے کی کوشش میں ہر لمحہ مصروف ہے۔

ملکی ذرائع ابلاغ بھی فرد کے ذہن پر اثر دالنے میں کچھ پیچھے نہیں ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں تیز رفتار، ترقی نے عائلی زندگی کو بے حد متاثر کیا ہے۔ مختلف گھروں کا رہن سہن میں فرق ہوتا ہے، سہولتیں اور نعمتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میڈیا خوبصورت اور امیر ترین گھروں کا ماحول عموماً دکھاتا ہے۔ نگاہیں دیکھتی ہیں اور دل خواہشوں کے تانے بانے بننے لگتے ہیں۔ ہر انسان سہولتیں مہیا نہین کر سکتا خواہشات آسودہ نہیں ہوتیں تو رویے متاثر ہوتے ہیں، ماحول میں کھچاؤ اور تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ضروریات زندگی کی کثرت کی طلب بے شمار مسائل کو جنم دیتی ہے جو میاں بیوی کے باہمی رویے پر بہت حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ مرد وزن کا اختلاط عورتوں کی بے پردگی۔ ٹیلی میڈیا میں کام کرنے والے مرد وخواتین بھی شہوتوں کی کثرت کو فروغ دینے میں معاون بن رہے ہیں۔ ہر شخص کے دل میں ٹی وی، فلم وغیرہ دیکھ کر خواہش کروٹیں لیتی ہے کہ اس کی بیوی مرقع حسن ہو اور خواتین تمنا کرنے لگتی ہیں کہ شوہر جمال یوسفی رکھتا ہو۔ اگرچہ اسلام نے حسن کو شادی کے اسباب میں شامل کر کے فطرت کی تصدیق کی تاہم اس کو سب کچھ قرار نہیں دیا۔ اور حسن محض ظاہری ہی نہیں۔ حسن ویسے بھی ہیشگی نہیں رکھتا۔ ذرا ساز کام و بخار چہرے بشاشت کو

منٹوں میں غائب کر دیات ہے ۔ میڈیا حسن کو کچھ زیادہ ہی حسین بنا دیتا ہے۔ کیونکہ تصویر حقیقت سے اکثر خوبصورت ہوا کرتی ہیں، وہی تصویر آنکھوں میں بسی رہ جاتی ہے اور زوجین میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کو اعلیٰ ترین معیار پر پرکھتا ہے۔ یوں وہ تصویریں نظروں سے دل میں اُتر کر دونوں کو اپنے ساتھی سے بیزار کرنے کا باعث بن رہی ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو منع کیا کہ وہ اپنے شوہر کے سامنے دوسری عورتوں کی صفات بیان نہ کریں۔ کہیں اس عورت کی خوبصورتی کی بناء پر اس کا شوہر اس سے متنفر نہ ہو جائے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُبَاشِرْ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ حَتَّى تَصِفَهَا لِزَوْجِهَا كَأَنَّمَا يَنْظُرُ إِلَيْهَا))[1]

”کوئی عورت دوسری عورت سے اس طرح نہ ملے کہ اسے اپنے شوہر کے سامنے یوں بیان کرے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔“

اب تو خود عورت ہی نہیں بلکہ پورا معاشرہ مرد کے سامنے عورت کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ عصر حاضر میں خواہ مرد ہو یا عورت، گھریلو خاتوں ہو یا ملازمت پیشہ اس کی آنکھ کا فق اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اس میں ساری دنیا نظر آرہی ہے۔ سو وہ دونوں ساری دنیا کی خوبصورتیاں، رعنائیاں، رنگینیاں سمیٹنا چاہتے ہیں اور یہ اثرات باہم فریقین کے تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

عائلی قوانین کی اہمیت وضرورت

ہر قوم کی تعمیر وترقی اور خوش حالی میں اس کے عائلی قوانین بڑااہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ قوم ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہے جس کے افراد عائلی الجھنوں میں گرفتار ہوں۔ عائلی قوانین کے اثرات اگرچہ افراد ہی پر پڑتے ہیں، کیونکہ افراد ہی قوم کی بنیاد ہیں، افراد سے گھر، گھر سے خاندان اور خاندان سے قبیلے بنتے ہیں اور اسی بنیاد پر تمدن کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس لئے عائلی قوانین صرف چند خاندانوں کو متاثر نہیں کرتے، بلکہ ان کے اثرات پوری قوم کی زندگی کے لئے بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے عائلی قوانین مذہبی سطح پر بناتی ہے اور اپنے عائلی قوانین کو اپنا مذہبی شعار سمجھتی ہے، کیونکہ یہ عائلی مسائل اس قدر نازک ہوتے ہیں کہ اکثر و بیشتر انہیں حل کرنے میں انسانی عقل ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ اگر کسی ایک مشکل کا حل نکالتی ہے تو دوسری طرف اور بہت سی مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانی عقل اپنی تمام توانائیاں صرف کرنے کے بعد ایک مسئلہ کا حل نکالتی ہے اور یہ سمجھ بیٹھتی ہے کہ مسئلہ کا صحیح حل دریافت ہو گیا اور اب کوئی خرابی رونما نہیں ہوگی، لیکن آگے چل کر تجربہ بتلاتا ہے کہ انسانی عقل کا یہ خیال محض ایک فریب تھا اور اس سے بے شمار خرابیاں جنم پا گئیں اور بات ابھی تک وہیں کی وہیں ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے جو پوری نوع انسانی کیلئے زندگی کے ہر شعبہ میں صلاح و

[1]۔ صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لاتباشر المراۃ، ج3ص1497، رقم الحدیث، 5240

فلاح کا دل نواز پیغام لے کر آیا تھا، ان عائلی مسائل کو محض انسانی اجتہاد کے بھروسے نہیں چھوڑا، اسکے بجائے قرآن کریم نے عائلی مسائل میں بڑی وسیع اور واضح ہدایات دی ہیں اور اپنی عام عادت کے خلاف عائلی مسائل کے ایک ایک جزئیہ کو خوب کھول کھول کر بیان کیا ہے، تاکہ ان مسائل میں کوئی الجھن اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔ تاریخ پر ایک سرسری نظر ہی ڈال لیجئے تو آپ پر یہ بات روز روشن کی طرح آشکار ہو جائیگی کہ جب تک انسان ان ہدایات کی حدود میں رہ کر زندگی بسر کرتے رہے جو قرآن کریم نے انہیں دی تھیں، اس وقت تک ان کا عائلی ماحول بڑا خوشگوار رہا، وہ خانگی پیچیدگیوں میں اُلجھنے کے بجائے قوم کی تعمیر کیطرف متوجہ رہے، اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے اوقات گھریلو جھگڑے نمٹانے میں صرف کرتے، وہ شب وروز اس پیغام کو دنیا تک پہنچانے میں مشغول رہے جو اُنکے آقا ﷺ نے نہیں، اللہ کی طرف سے دیا تھا۔ پھر جب سے انہوں نے ان قرآنی ہدایات کو پشت ڈال دیا یا اس پر عمل کرنے میں کمزوری نے راستہ پایا، اس وقت سے انکی عائلی زندگی ناہمواریوں اور مشکلات ومصائب کا مجموعہ بن گئی۔

ہندوستان میں مغربی تسلط کا دور اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کے لئے تاریک ترین دور تھا، ایک طرف تو غیروں کے تسلط کی وجہ سے ان کے عائلی قوانین ٹھیک ٹھیک قرآنی ہدایات کے مطابق نہ رہے، دوسری طرف ہندوؤں کے شب وروز اختلاط نے ان کے معاشرے میں بے شمار ایسی رسمیں پیدا کر دیں جو نہ صرف اسلامی اصولوں کے بالکل خلاف تھیں، بلکہ بڑی انسانیت سوز، انتہائی وحشیانہ اور سخت ظالمانہ تھیں۔ اس طرح اُس قوم نے جس کے پاس زندگی گزارنے کے لئے ایک بڑا متوازن اور سو فیصد فطری نظام موجود تھا، غیروں کے طور طریقے اختیار کر کے اپنے آپ کو تباہ کن رسموں میں جکڑ لیا۔ حالات کی اس تبدیلی کا سب سے بڑا اثر بیچاری عورت پر پڑا اور اس تمام عرصہ میں یہ غریب ظلم وستم میں پڑی سسکتی رہی۔

اگرچہ اس زمانے میں بھی بیدار مغز اور روشن خیال علماء نے ان رسموں کے خلاف آواز بلند کی، مگر نہ اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا، نہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ وہ راس کماری سے درہ خیبر تک پھیلی ہوئی گندگیوں کو دور کر سکتے، اسلئے ان کی یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا ثابت ہوئی اور ان مظالم کا کوئی اطمینان بخش مدعانہ ہو سکا۔ لیکن دو سو سال کی طویل جدوجہد اور جان ومال کی بیش بہا قربانیوں کے بعد مسلمانوں نے اپنے لئے ایک آزاد اسلامی مملکت حاصل کر لی۔ جن انگوں اور ولولوں سے ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا، ان کا تقاضا یہ تھا کہ ہم پہنچ کر زندگی کے ہر شعبے میں ان آلائشوں سے اپنے دامن جھاڑ لیں جو غیروں کیساتھ میل جول کے سبب ہم پر مسلط ہو گئی تھیں اور اسی ضمن میں ان تمام گندگیوں سے بھی اپنے آپ کو پاک کر لیں جو ہماری عائلی زندگی میں بری طرح گھس آئی تھیں اور پھر از سر نو اپنی زندگیوں کو اسلامی نظام حیات کے اُس دلکش سانچے میں ڈھالیں جو ہمیشہ ہماری کامیابی کا ضامن رہا ہے۔

عائلی مسائل کی اہمیت (قرآن کی روشنی میں)

قرآن وحدیث میں عائلی مسائل (خاندانی معاملات) کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کیونکہ یہ اسلامی معاشرت کی بنیادی اکائی اور انسان کی اخلاقی و سماجی تربیت کا پہلا ذریعہ ہے۔ عائلی نظام کے مستحکم ہونے سے معاشرہ مضبوط ہوتا ہے، جبکہ اس نظام کی کمزوری سے معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ قرآن وسنت میں مختلف آیات واحادیث کے ذریعے عائلی زندگی کے حقوق و فرائض کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں اس کی اہمیت کو قرآن کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

خاندان کی تعریف

خاندان کی تعریف اہل علم یوں کرتے ہیں:

((العائلة: شاع كثيرا إطلاقها على من يعولهم الرجل ويقوم بأمرهم من أهله)).[1]

"لفظ "خاندان" اس کا استعمال عام طور پر ان لوگوں پر کیا جاتا ہے جن کی کوئی شخص کفالت کرتا ہے اور ان کے معاملات سنبھالتا ہے۔"

ایک اور مقام پر خاندان کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

((العائلة: من يعولهم الشخص من يضمهم بيت الرجل وينفق عليهم من زوجة وأقارب)).[2]

"خاندان: وہ لوگ جن کی کفالت ایک شخص کرتا ہے، جو اس کے گھر میں رہتے ہیں اور جن پر وہ خرچ کرتا ہے، جیسے بیوی اور رشتہ دار۔"

خاندان کی بنیاد

خاندان انسانی زندگی کا ایک بنیادی جزو ہے۔ خاندان کا مطلب محض ایک بایولوجیکل یا خونی رشتہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ یہ محبت، قربانی، تعلق اور سپورٹ کا مجموعہ بھی ہوتا ہے۔ خاندان ایک ایسی جگہ ہے جہاں فرد کو محبت حفاظت اور اعتماد ملتا ہے اور وہ اپنے جذبات اور مسائل کو کھل کر بیان کر سکتا ہے۔

خاندان ایک مضبوط سماجی نظام ہے، جس میں ہر فرد کا ایک مخصوص کردار اور ذمہ داری ہوتی ہے۔ والدین بچوں کو زندگی کے اصول اور اقدار سکھاتے ہیں، اور بچے والدین سے سیکھتے ہیں۔ اسی طرح بہن بھائیوں کے درمیان محبت اور سپورٹ کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا، مشکلات میں ساتھ دینا، اور کامیابیوں کا جشن منانا خاندان کو مزید مضبوط بناتا ہے۔

لیکن خاندان صرف خوشی اور آرام کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں قربانی اور سمجھوتے کی بھی بہت بڑی اہمیت

---

[1]۔ أحمد رضا، معجم متن اللغة، الناشر: دار مكتبة الحياة– بيروت: 1380ھ، ج4، ص 251۔

[2]۔ قلعجي، محمد رواس، قنيبي، حامد صادق، معجم لغة الفقهاء، الناشر: دار النفائس للطباعة والنشر والتوزيع- 1988م، ص299

ہے۔ اکثر خاندان کے افراد اپنے ذاتی مفادات کو ترک کرتے ہیں اور دوسرے افراد کی خوشی کیلئے اپنی خواہشات کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ نیز وقت کیساتھ ساتھ خاندان کا دائرہ اور طرز زندگی بدلتا رہتا ہے۔ جدید دور میں کئی خاندانوں میں رشتوں میں دوری یا تناؤ دیکھا جاتا ہے، لیکن اصل میں خاندان کا مطلب ہی ایک دوسرے کا خیال رکھنا اور ہر مشکل گھڑی میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا رہنا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو خاندان کو مضبوط اور پائیدار بناتی ہے۔

اسلام نے خاندان کی بنیاد محبت، احترام، اور حقوق و فرائض کے توازن پر رکھی گئی ہے۔ قرآن و حدیث میں خاندان کو ایک مضبوط معاشرتی اکائی کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس کا مقصد افراد کو محبت اور سکون فراہم کرنا اور نسلوں کی تربیت کو یقینی بنانا ہے۔ اور عائلہ (کنبہ، خاندان) کے افراد کے درمیان محبت اور رحمت کو اپنی ایک نشانی قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ ﴾۔[1]

"اور اسکی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنادیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو انکے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار و مہربانی، البتہ اسمیں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کیلئے جو دھیان کرتے ہیں"[2]

اس آیت سے عائلی زندگی میں محبت اور سکون کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ محبت اور رحمت خاندانی مسائل کے حل کے لیے کلیدی کردار ادا کرتی ہے، کیونکہ باہمی محبت کی بنیاد پر افراد ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں۔ خاندان کا نظام انسان کے لیے ایک سکون و تسکین کا ذریعہ ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ایک عظیم نعمت ہے۔

شادی اور ازدواجی تعلقات

نکاح کی لغوی تعریف

معجم اللغة العربية المعاصرة میں ہے:

((اقتران الذكر بالأنثى أو الرجل بالمرأة بعقد شرعيّ)) (3)

"نر کا مادہ سے یا مرد کا عورت سے عقد شرعی کے ذریعے مل جانا۔"

یہی تعریف المعجم الوسیط میں بھی کی گئی ہے (4) جس سے معلوم ہوتا ہے شادی ایک بندھن اور ایک تعلق کا نام ہے جو مرد اور عورت کے درمیان ایک عقد کے ذریعے قائم ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان پر ایک دوسرے کے بہت سے حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

---

[1] ۔ الروم: 21

[2] ۔ محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 2010ء، ج6، ص730

[3]- أحمد مختار، عبد الحميد الدكتور، معجم اللغة العربية المعاصرة، عالم الكتب، 2008م، ج2، ص1006

[4]۔ نخبة من اللغويين، المعجم الوسيط، مجمع اللغة العربية القاهرة، 1972م، ج1، ص405

نکاح کی اصطلاحی تعریف

نکاح ایک ایسا شرعی عقد ہے جس کے ذریعے ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان زوجیت کا تعلق قائم ہوتا ہے، جس کا مقصد عفت و پاکیزگی، نسل کی بقا، اور باہمی حقوق و فرائض کی ادائیگی ہوتا ہے۔" علامہ شامیؒ نے ردالمختار میں نکاح کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے:

((النِّكَاحُ عَقْدٌ يُفِيدُ مِلْكَ الْمُتْعَةِ بِالأُنْثَى قَصْدًا، أَيْ يُفِيدُ حِل اسْتِمْتَاعِ الرَّجُل مِنَ امْرَأَةٍ لَمْ يَمْنَعْ مِنْ نِكَاحِهَا مَانِعٌ شَرْعِيٌّ))۔[1]

احوال الشخصیۃ فی الاسلام میں عبد الوہاب خلاف نے نکاح کی تعریف کچھ یوں کیا ہے:

((وفي الشريعة الإسلامية هو عقد يفيد حل استمتاع كل واحد من الزوجين بالآخر على الوجه المشروع، ويجعل لكل منهما حقوقا قبل صاحبه وواجبات عليه))۔[2]

اسلام میں نکاح اور ازدواجی تعلقات کو بنیادی اور پاکیزہ حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک مقدس معاہدہ ہے جس کے ذریعے مرد اور عورت نہ صرف ایک دوسرے کے شریک حیات بنتے ہیں بلکہ ایک مضبوط خاندانی اور معاشرتی نظام کی بنیاد بھی رکھتے ہیں۔ نکاح کے ذریعے دو افراد اپنی فطری ضروریات کو جائز طریقے سے پورا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق پاکیزہ زندگی گزارتے ہیں۔ نکاح کا مقصد سکون، محبت اور عفت کا قیام ہے، جو کہ اسلامی تعلیمات کا اہم جزو ہے۔ قرآن مجید میں نکاح کو اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دیا گیا ہے اور اسے ایک عظیم رحمت و سکون کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں":

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو، اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی۔"[3]

یہ آیت نکاح کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان تعلق محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی اور جذباتی پہلو بھی رکھتا ہے۔ یہ رشتہ انسان کو حقیقی سکون، خوشی، اور برائیوں سے دور رکھتا ہے۔

اسلام نے نکاح کو عبادت اور سنت کا درجہ دے کر اسے عظیم مقام دیا ہے۔ نکاح کے ذریعے خاندان بنتا ہے اور یہ بچوں کی تربیت اور معاشرتی اقدار کی مضبوطی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں نکاح ایک برکت اور رحمت ہے جسے اپنانا زندگی کو کامیاب اور خوشحال بنا سکتا ہے۔

عمر نکاح

دین اسلام میں عمر نکاح کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی تاہم رشد یعنی سمجھ داری اور عقل و شعور کی اصطلاح موجود ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

---

[1] ۔ الدر المختار علی رد المحتار ج2، ص285، وفتح القدیر، لابن الهمام الحنفي، طبعة دار الكتب العلمية، بیروت،، ج3، ص99-

[2] ۔ عبد الوهاب خلاف، أحكام الأحوال الشخصية في الشريعة الإسلامية،: مطبعة دار الكتب المصرية بالقاهرة، 1938م، ص13

[3] ۔ سورہ الروم: 21

﴿وَابْتَلُوا الْيَتَامَى حَتَّى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ﴾[1]

"یتیموں کو آزما کر دیکھتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر تم ان میں رشد پاؤ تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دو۔"

الرشد کا لفظ دنیا اور آخرت کے امور میں ہدایت اور سمجھداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ ابن رشد لکھتے ہیں:

((إن الرشد إذا وجد في المرأة اكتفي به في عقد النكاح.))[2]

"بیشک جب عورت میں سمجھ داری پائی جائے تو عقد نکاح میں اس پر اکتفا کیا جائے گا۔"

نکاح کا تصور اور بلوغ کا تصور دونوں لازم ملزوم ہے یہی وجہ ہے بلوغ ہی کو عموماً نکاح کی عمر کہا جاتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کو اس معروف حقیقت سے اختلاف ہوتا۔ اسی طرح حدیث میں عمر نکاح کا اشارہ موجود ہے:

((من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه)).[3]

امام طبریؒ نے معجم الاوسط میں اس کو ضعیف السند قرار دیا ہے۔[4]

علماء نے اس حدیث کو ضعیف السند قرار دیا ہے، لیکن اسکا معنیٰ اور مضمون دیگر صحیح احادیث سے ثابت اور تقویت یافتہ ہے، جیسے کہ:

- حسنِ نام رکھنے کی ترغیب صحیح احادیث سے ثابت ہے۔
- اولاد کی تربیت و ادب کی تاکید متعدد صحیح روایات میں وارد ہوئی ہے۔
- بالغ ہونے پر نکاح کروانے کی ترغیب بخاری و مسلم کی احادیث سے ثابت ہے، جیسا کہ حدیث ہے:

"یامعشرالشباب،من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج"...

"جسے اللہ تعالیٰ کوئی اولاد دے اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اور حسن آداب سکھائے پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے۔"

لیکن اسلام کی ایسی کوئی قانون بندی نہیں کہ جس میں نکاح قانوناً منع ہو، بلکہ قرآن و سنت اور عمل صحابہ سے صریح شہادتیں موجود ہیں کہ بوقت ضرورت بلوغ سے پہلے ہی نکاح کیا جا سکتا ہے۔

جہیز کا معنی و مفہوم شرعی حیثیت اور معاشرے پر اس کے اثرات

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو کامل ضابطہ حیات فرما کر آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو دائمی اور آفاقی قرار دیا

---

[1]۔النساء:6

[2]۔ابن الرشد،بدایۃ المجتهد ونهایۃ المقتصد، لِلإمام القاضي الفقیه النظار الأصولي المتكلم أبي الولید محمد بن أحمد بن محمد بن رشد الحفید (ت595ھ-) ،ج3 ، ص39

[3]۔البیهقي، أبو بكر أحمد بن الحسین شعب الإیمان، دار الكتب العلمیة، بیروت-لبنان،-2000م(6/401)،رقم الحدیث:8663

[4]۔المعجم الأوسط للطبراني(رقم:7696)

ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس میں آپ ﷺ نے اپنے اسوہ حسنہ کی روشنی میں راہنمائی نہ کی ہو اور کوئی بھی پہلو تشنہ رہ گیا ہو۔ اسلام نے معاشرے کی تربیت واصلاح پر کافی زور دیا ہے اور اس کی معاشرتی، اخلاقی، روحانی اور طبی مقاصد واہمیت کو اجاگر کیا ہے اسی لیے قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ نے معاشرتی زندگی کے وہ بنیادی مسائل جن کا تعلق معاشرے اور خاندانی نظام سے ہے ان اہم معاملات ومسائل اور جزئیات پر سیر حاصل ابحاث کی ہیں جو کہ تمام زبوں حال ذریت آدم کیلئے تاقیامت مشعل راہ ہیں۔ معاشرے کے استحکام کا سہرا عائلی زندگی کے مرّوجہ طریقہ نکاح میں پنہاں ہے اور نکاح سنت انبیاء ہے اس لیے اسلامی تعلیمات نے عائلی زندگی سے متعلق تمام معاملات جن میں مہر، نان ونفقہ کا تعین، اولاد کی تربیت، حقوق کی ادائیگیاں شادی بیاہ اور دیگر متعلقہ مسائل میں رہنمائی کی ہے۔

لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے مسائل معاشرے میں سرایت کیے ہوئے ہیں جو خاندانی نظام کے استحکام وپائیداری کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں اور نکاح جیسے بندھن کو جہاں اسلامی تعلیمات آسان تر بناتی ہے وہیں معاشرے میں بڑھتے ہوئے غیر اسلامی رسم ورواج وبائی مرض کی مانند وقت سے ساتھ کھیلتے چلے جارہے ہیں جو کہ معاشرے کی نہ صرف اسلامی بلکہ اخلاقی اقدار کو بھی دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ انہی رسم ورواج میں ایک معاشرتی مسئلہ شادی کے موقع پر جہیز دینے اور اور آج کل تومانگ لینے کی رسم بھی موجود ہے۔ دراصل بر صغیر میں مشترکہ معاشرت کے بہت سے اثرات مسلم تہذیب وثقافت اور پاکستانی معاشرے پر پڑے ہیں جس کے باعث بہت سی رسومات مسلم معاشرے کا حصہ بنتی چلی گئیں ہیں۔ رسم جہیز بھی اسی کی ایک کڑی ہے جس نے نکاح جیسے پاکیزہ بندھن کو انتہائی مشکل بنادیا ہے اور ہمارے معاشرے میں لاینفک تصور کیا جاتا ہے اور مسلم معاشرہ اس کو تحفظ اور دوام بخش رہا ہے۔ اس کو شادی کا لازمی حصہ سمجھا جارہا ہے جسکی وجہ سے معاشرہ میں کئی ایک معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور نفسیاتی برائیاں جنم لے رہی ہیں۔ ہم یہاں اسکی شرعی حیثیت اور معاشرے پر پڑنیوالے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

جہیز کا معنی ومفہوم

لفظ جہیز عربی زبان کے لفظ جھاز سے نکلا ہے۔ جس کا مصدر تجہیز ہے اور مطلب ساز وسامان۔

مفردات میں ہے:

((الجَهاز:مایعدّمن متاع وغیرہ،والتجهیز:حمل ذلك أوبعثه)).[1]

"جہاز اس سامان کو کہا جاتا ہے جو کسی کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور تجہیز کا معنی سامان کو اٹھانا یا بھیجنا۔"

اصطلاح میں جہیز ایسے سروسامان کو کہتے ہیں جو لڑکی کے نکاح میں اس کے ہمراہ دیا جاتا ہے انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

Dowry is the property which a man receives when he marries, either his

[1]۔ المعروف بالراغب، المفردات فی غریب القرآن،، 1412ھ، ص209

wife or from her family[1]

در اصل جہیز شادی کے موقع پر والدین کی جائیداد (زیور کپڑے یا دیگر) کی بیٹی کے نام منتقلی ہے۔ جہیز کو شادی کی حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ رسم عام طور پر برصغیر میں شادی کے ساتھ وابستہ دکھائی دیتی ہے۔ Devasia اپنی کتاب Female victims میں اس کی وضاحت کچھ یوں کرتی ہے:

Dowry is regarded as a gift in cash or kind given to the bride groom or to his family members during, before or after the solemnization of marriage[2]

جہیز رقم یا کسی چیز کی صورت میں ایک تحفہ ہے جو دولہا یا اس کے اہل خانہ دوران شادی یا قبل از شادی یا پھر تقریبات شادی کے اختتام پر دیا جاتا ہے۔

ہمارے پاکستانی معاشرے میں اس مال کی تعداد اور قیمت کہیں زیادہ ہوتی ہے کہیں تو والدین خود دیتے ہیں لیکن آج کل اس کو دین کا حصہ سمجھ کر مانگا جاتا ہے حالانکہ اسلام نے حصول مال اور مصارف مال کا ایک معتدل ضابطہ مرتب کیا ہے اور بے جا خرچ کرنے کو فضول خرچی بلکہ شیطانی عمل قرار دیا ہے جب کہ جہیز کی مد اس عمل کو کافی فروغ دیا جارہا ہے اور ایسی فضول خرچی کو اللہ ناپسند کرتا ہے:

﴿وَآتِ ذَاالْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَاتُبَذِّرْ تَبْذِيرًا(26) إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوإِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾[3]

اور رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور مسکین اور مسافر کو (ان کا حق) اور اپنے مال کو بے ہودہ کاموں میں نہ اڑاؤ، یقین جانو کہ جو لوگ بے ہودہ کاموں میں مال اڑاتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔

غلط کاموں میں استعمال کیا گیا ایک روپیہ بھی فضول خرچی ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں:

((مَنْ أَنْفَقَ دِرْهَمًا فِي حَرَامٍ فَهُوَ مُبَذِّرٌ)).[4]

جس نے حرام کام میں ایک درہم خرچ کیا وہ فضول خرچ ہے۔

ہمارے معاشرے میں اس جہیز کی رسم کو ادا کرنے کیلئے لوگ قرض اٹھاتے ہیں، لڑکے والوں کا منہ بھرنے کیلئے نہ جانے کیسے کیسے حیلے اپنائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے نوبت تنگ دستی اور بعض اوقات قرض کی ادائیگی کی وجہ سے لڑائی جھگڑے تک جا پہنچتی ہے۔ حالانکہ اچھے کاموں میں بھی اس قدر خرچ کرنا جس سے انسان تنگ دست ہو جائے اور دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانے کی نوبت آجائے تو ایسا کرنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے:

---

[1]- Max Radian, Encylopeadia of social scinces, the macmillan New York,vol:5,p:230

[2]-Devasia,Leelamna, Female Victims,Dattson Publishers,Nagpur,1989,p:141

[3]-الإسراء15:26-27

[4]-القرطبي، محمد بن أحمد بن أبي بكر بن فرح الأنصاري الخزرجي الأندلسي، أبو عبد الله، الجامع لأحكام القرآن، دار الكتب المصرية-القاهرة، ج10ص248

((من اقتصدأغناه الله ومن بذرأفقره الله ومن تواضع لله رفعه الله ومن تجبرقصمه الله)).[1]

"جس نے میانہ روی اختیار کی اللہ نے اسکو بے نیاز کر دیا اور جس نے فضول خرچی کی اللہ نے اسکو محتاج بنا دیا اور جس نے اللہ کی خاطر خاکساری اختیار کی اللہ نے اسکو سربلندی عطا کی اور جس نے تکبر کیا اللہ نے اسکو ہلاک کر دیا۔"

قرآن میں اللہ نے اپنے بندوں کا یہ امتیازی وصف بیان کیا ہے کہ وہ فضول خرچی نہیں کرتے اور تنگی کرتے ہیں بلکہ اعتدال کی راہ کو اختیار کرتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا﴾ [2]

"اور وہ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں اور ان دونوں کے درمیان اعتدال سے رہیں"۔

فضول خرچی اسلام میں ممنوع ہے اور نکاح جیسے عمل میں جس کو اسلام نے آسان رکھا ہے میں تو بالکل ایسے معاملات جو غیر شرعی ہیں منع کیا گیا ہے۔ نکاح نبی اکرم ﷺ اور تمام انبیاء کی سنت ہے۔ نکاح صرف دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کا نام ہے، نہ باراتوں کی لمبی قطار، نہ تلک و جہیز، نہ عمدہ سے عمدہ کھانے کا نظم اور نہ ہی کوئی صرفہ و خرچہ۔ نکاح کی سنت انتہائی آسان ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أَعْظَمَ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مُؤْنَةً)).[3]

ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔[4]

"وہ نکاح زیادہ بابرکت ہے جس میں اخراجات کم سے کم ہوں۔"

لیکن افسوس کہ ہم نے غیروں سے متاثر ہو کر اس مقدس فریضہ کو مشکل تر بنا رکھا ہے اور ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات کے برخلاف رسم و رواج، فضول خرچی و اسراف اور نمود و نمائش کے نت نئے دروازے کھل چکے ہیں۔ تلک[5] اور جہیز کو نکاح کا لازمی حصہ قرار دیا جاتا ہے۔

طلاق کی لغوی تعریف

طلاق کا مطلب ہے قید کو ختم کرنا اور آزاد کرنا۔ میں نے اسے طلاق دی: یعنی اسے کھول دیا اور چھوڑ دیا۔"

((والطلاق في اللغۃعبارۃعن رفع القيد))۔[6]

((طَلَقَ----، وَهُوَيَدُلُّ عَلَى التَّخْلِيَةِوَالْإِرْسَالِ))[7]

---

[1] ۔ علي المتقي، علاء الدين الشاذلي الهندي، كنز العمال، الناشر: مؤسسة الرسالة، 1981م (3/50)، رقم الحديث: 5437

[2] ۔ الفرقان: 67

[3] ۔ شعب الإيمان، ج5، ص254، رقم الحديث: 6546

[4] ۔ صحیح ابن حبان، کتاب الفضائل، باب الغيرة على الزوجة، رقم الحديث: 4072۔

[5] ۔ تلک سے مراد وہ روپیہ ہے جو شادی کے پہلے دن دلہن کا باپ دولہا کے گھر بھیجتا ہے۔

[6] ۔ فتح القدیر، للشیخ امام کمال الدین محمد بن عبد الواحد، ناشر، المکتبہ الرشیدیہ، کوئٹہ، ج3، ص325،

[7] ۔ أحمد بن فارس بن زكرياء القزويني الرازي، أبو الحسين، معجم مقاييس اللغة، الناشر: دار الفكر، 1979ء مادة: طلق، ج3، ص420.

طلاق کا لغوی معنی ہے چھوڑ دینا اور آزاد کر دینا، اور ترک کر دینا۔

طلاق کی اصطلاحی تعریف

طلاق ایک ایسا شرعی اور قانونی عمل ہے جسکے ذریعے شوہر مخصوص الفاظ یا اشارے کے ذریعے اپنی بیوی کو نکاح کے رشتے سے علیحدہ کرتا ہے، جس کے نتیجے میں ازدواجی تعلقات اور نکاح کا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے

((هو: رفع قيدالنكاح في الحال أو المآل بلفظ مخصوص أو ما يقوم مقامه))[1]

جمہور فقہاء کرام نے طلاق کی تعریف یوں کی ہے:

((عرف الفقهاءعبارةعن حكم شرعى برفع القيدالنكاح بالفاظ مخصوصةوسببه الحاجة المحوجة اليهٖ))۔[2]

اسلام میں شادی اور ازدواجی تعلقات کو ایک مقدس اور مضبوط رشتہ سمجھا گیا ہے، جو محبت، شفقت اور باہمی احترام کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ نکاح نہ صرف دو افراد کے درمیان ایک عہد ہے بلکہ یہ دو خاندانوں اور معاشرتی تعلقات کو مضبوط بنانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ اس رشتے کے ذریعے ایک مضبوط اور صالح خاندان تشکیل پاتا ہے، جس سے معاشرے کو فکری، اخلاقی اور روحانی استحکام ملتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں نکاح کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور ازدواجی زندگی کو خیر و برکت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

تاہم بعض اوقات حالات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں کہ ازدواجی زندگی میں تنازعات پیدا ہو جاتے ہیں، اور باہمی تعلقات کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اسلام نے صلح و مصالحت کو اولین ترجیح دی ہے تاکہ رشتہ بچ سکے اور باہمی اختلافات کو دور کیا جا سکے۔ اگرچہ اسلام میں طلاق کو ایک ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے، لیکن ضرورت پڑنے پر اسے ایک آخری اور جائز حل کے طور پر اپنانے کی اجازت دی گئی ہے۔

اسلام کا نظام طلاق اس بات کا گہرائی سے احساس دلاتا ہے کہ طلاق کوئی ہلکا یا جلد بازی میں لیا گیا فیصلہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ ایک متوازن، منظم اور سوچا سمجھا عمل ہے۔ قرآن مجید میں طلاق کے بارے میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں، ان کا مقصد دونوں فریقین کے حقوق کا تحفظ اور اُن کی زندگی میں آسانی پیدا کرنا ہے۔ اس کے ذریعے افراد کو ایسے تعلق سے آزاد کیا جا سکتا ہے جو ان کے لیے تکلیف اور ناچاقی کا باعث بن رہا ہو، تاکہ وہ بہتر انداز میں زندگی گزار سکیں اور مستقبل میں خوشحالی حاصل کر سکیں۔

اسلامی تعلیمات میں شادی اور طلاق دونوں کو ایک مکمل توازن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تاکہ افراد اور

---

[1] ۔الدر المختار:ج3،ص227،226،والشرح الكبير، الشرح الكبير على متن المقنع(مطبوع مع المغني) شمس الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن أبي عمر محمد بن أحمد بن قدامة المقدسي (ت682ھ)، دار الكتاب العربي للنشر والتوزيع، بيروت،

ج2ص347،، والمغني، الكتاب: المغني، المؤلف: موفق الدين أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة المقدسي الجماعيلي الدمشقي الصالحي الحنبلي (620ھ) الناشر: دار عالم الكتب للطباعة والنشر والتوزيع، الرياض - المملكة العربية السعودية، الطبعة الثالثة، 1997،، ج7، ص296

[2] ۔فتح القدير،، ج3، ص325،

معاشرے کی فلاح و بہبود کو یقینی بنایا جاسکے۔ اسلام نے طلاق کو ایک سہولت کے طور پر فراہم کیا ہے، لیکن اس کے استعمال میں سنجیدگی، ذمہ داری اور احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھنے کا حکم دیا ہے، تاکہ معاشرتی تعلقات کو مضبوط رکھا جاسکے اور افراد کو ذہنی سکون اور خوشحالی مل سکے۔

طلاق کا طریقہ کار

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں طلاق کی کوئی حد نہیں تھی۔ آدمی جتنی مرتبہ چاہے اور جتنی مدت کے لیے چاہے طلاق دیتا اور جب جی چاہے رجوع کرلیتا۔ اسلام نے اس پورے مسئلہ کو ایک خاص رخ سے دیکھا اور ایک نئے ڈھنگ سے حل کیا۔ اس نے کہا کہ عقد نکاح مودت و محبت کا رشتہ ہے۔ اسے جہاں تک ہوسکے باقی رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس کا منقطع ہونا پورے خاندانی نظام کو متاثر کرسکتا ہے۔ اختلافات ہوں تو انہیں دور کرنے کی ممکنہ تدابیر، جن کی اس نے خود وضاحت کردی ہے، اختیار کی جانی چاہئیں۔ اس کے باوجود طلاق دینی ہی پڑے تو صرف دوبار وقفہ وقفہ سے طلاق دی جاسکتی ہے۔ ان میں عدت کے درمیان رجوع کا حق حاصل ہوگا۔ اگر تیسری بار طلاق دی جائے تو رجوع کا حق ختم ہو جائے گا اور اس سے دوبارہ نکاح اس وقت ہوگا جب کہ وہ کسی دوسرے مرد کے نکاح میں جائے اور وہ بھی اسے طلاق دے دے (یا اس کی موت واقع ہو جائے) اس کے بعد پہلا شوہر عورت سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے اور عورت بھی اس کے لیے آمادہ ہو تو نئے مہر کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ﴾ [1]

"طلاق دوبار ہے (اس میں رجوع ہوسکتا ہے) اس کے بعد یا تو دستور کے مطابق بیوی کو رکھا جائے یا بھلے طریقے سے اسے چھوڑ دیا جائے۔"[2]

اور تیسری بار طلاق کے بارے میں فرمایا:

﴿ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ [3]

پھر اگر عورت کو تیسری بار طلاق دی تو وہ اس کیلئے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے۔[4]

اس آیت میں اس حد کا اشارہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں لوگوں کے طریقہ کار پر لاگو ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے تھے، پھر اسے طلاق دے کر چھوڑ دیتے تھے اور وہ عورت ایک طویل عرصے تک طلاق یافتہ حالت میں رہتی تھی، جس سے اسے نقصان پہنچتا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک طلاق کسی مخصوص تعداد تک محدود نہیں تھی، جس

---

[1] ۔البقرۃ،229

[2] ۔معارف القرآن،ج1ص553

[3] ۔البقرۃ،230

[4] ۔معارف القرآن،ج1،ص554

کے بعد شوہر کو دوبارہ رجوع کرنے کا حق نہ ہوتا تھا۔ اسلام نے یہ اصول قائم کیا کہ تیسری طلاق دینے سے پیدا ہونے والی جدائی شوہر سے بیوی کی طرف دوبارہ رجوع کرنے کا حق چھین لیتی ہے، اسی طرح بیوی سے بھی شوہر کے پاس واپس جانے کا حق چھن جاتا ہے۔ اس قانون کا حکمت یہ ہے کہ شوہروں پر عورت کے حقوق کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے تیسری طلاق کے بعد سزا جاری کی جائے تا کہ ان کے ضمیر کو ٹھیس پہنچے۔ کیونکہ طلاق دینے والا مرد اپنی بیوی کے بارے میں لاپرواہی کر رہا ہے جو اس کے تحفظ میں ہے اور اس کے حقوق کو نظر انداز کر رہا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے ایک کھلونا بنا دیتا ہے جس کے ساتھ وہ غصے اور حماقت کے عالم میں کھیل رہا ہے۔ اس سے طلاق دینے والوں پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جاہلیت کے زمانے میں اپنی حالت میں حق بجانب نہیں تھے۔

طلاق دینے کے تین طریقے ہیں

طلاق احسن

بیوی ماہواری سے پاک ہو، اور بیوی سے صحبت کیے بغیر ایک طلاق رجعی دے، اس صورت میں دوران عدت رجوع کر سکتا ہے، اور عدت کے بعد دوبارہ نکاح کر سکتا ہے، یہ طریقہ سب سے بہتر ہے۔

طلاق حسن

بیوی کو تین طہروں میں الگ الگ تین طلاقیں دے، یہ صورت بھی جائز ہے، البتہ اس صورت میں شرعی حلالہ کئے بغیر آئندہ نکاح نہیں کر سکتا۔

طلاق بدعت

اس کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً یہ کہ بیوی کو ماہواری کی حالت میں طلاق دے، یا ایسے طہر میں طلاق دے جس میں صحبت کر چکا ہو، یا ایک ہی مجلس یا ایک ہی طہر میں تین طلاقیں دے۔ تو اس طرح طلاق دینے والا گناہ گار ہو گا اور طلاق بھی واقع ہو جائے گی، البتہ اگر تین طلاقیں ایک ساتھ دے دیں تو عورت حرمت مغلظہ کے ساتھ حرام ہو جائے گی۔ اور اگر حالت حیض میں طلاق دے یا ایسے طہر میں جس میں جماع کیا ہو، تین سے کم طلاق دے تو رجوع کا حق باقی رہے گا، اور رجوع کے بعد باقی ماندہ طلاق دینے کا حق شوہر کو ہو گا۔[1]

طلاق کی تعداد اور تدریج

قرآن نے طلاق کو ایک تدریجی عمل قرار دیا ہے تا کہ غصے یا جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ قرآن میں طلاق کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

---

[1] ۔ نجم الفتاوی،، مفتی، سید نجم الحسن، شعبہ نشر واشاعت دار العلوم یاسین القرآن، نارتھ کراچی، ج6، ص2

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾۔[1]

" طلاق رجعی ہے دوبار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے ''۔[2]

یہ آیت طلاق کے اصولی طریقے کو واضح کرتی ہے کہ طلاق کا عمل دو مرحلوں میں ہوتا ہے اور ہر مرحلے کے بعد صلح کا موقع دیا جاتا ہے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ جلد بازی میں فیصلہ کرنیکے بجائے فریقین کو سوچنے کا وقت ملے۔

عدت کی لغوی واصطلاحی تعریف

عدت کا لغوی معنٰی ہے گننا اور شمار کرنا۔ الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے:

((العدة لغة: مأخوذة من العد والحساب)). [3]

''عدت لغت میں گننے اور حساب کرنے سے ماخوذ ہے''۔

اور عدت کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

((هي اسم لمدة تتربص فيها المرأة لمعرفة براءة رحمها، أو للتعبد أو لتفجعها على زوجها)). [4]

''یہ نام ہے اس مدت کا جس میں عورت ٹھہری رہتی ہے اپنے رحم کی صفائی کو جاننے کے لیے یا حکم خداوندی کی اطاعت یا اپنے شوہر کی وفات پر اظہارِ غم کے لیے''

عدت کے دوران عورت نہ منگنی کر سکتی ہے نہ شادی۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ برأتِ رحم کی پہچان ہو سکے تاکہ نسب ایک دوسرے سے خلط ملط نہ ہوں، حیات زوجیت کو لوٹانے کے لیے زوجین کو موقع فراہم کرنا اگر وہ دونوں سمجھیں کہ اس میں بہتری ہے۔ معاملہ نکاح کی اہمیت پر تنبیہ کہ یہ معاملہ مردوں کے اجتماع کے بغیر جڑتا نہیں ہے اور طویل انتظار کے بعد ہی قائم ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ بچوں کے کھیل کے درجہ میں آجاتا جو ایک ہی وقت میں بنتا اور پھر ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے فوائد پورے نہیں ہوتے جب تک ہم اپنے ہم نفسوں کو اس عقد کی ہمیشگی پر ظاہری طور پر پابند نہ کرلیں، اگر کوئی واقعہ پیش آتا جو اس نظام کو توڑنے کا موجب ہے تو بہر حال ہمیشگی کی صورت کو ثابت رکھنے کے لیے اس کے بغیر کوئی چھٹکارہ نہیں کہ عورت اتنی مدت تک انتظار کرے جس انتظار کی اس کو پرواہ ہو اور اس پر وہ مشقت برداشت کرے۔[5]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾[6]

---

[1] ۔البقرہ:229

[2] ۔معارف القرآن، البقرۃ ج2، ص554

[3]۔ وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية الكويت، الموسوعة الفقهية الكويتية، الطبعة الثانية، دار السلاسل الكويت، (304/29)

[4]۔ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ج29، ص304

[5]۔ شاہ ولی اللہ، أحمد بن عبد الرحيم الدهلوي، حجة الله البالغة، الناشر: دار الجيل، بيروت لبنان، :-2005م (220/2)

[6]-البقرۃ:228

"اور طلاق دی گئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾[1]

"یعنی تم ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو اور عدت شمار کرو۔"

عدت کی اقسام مختلف ہیں

جس عورت کو حیض آتا ہو اس کی عدت تین حیض ہے۔[2]

اس عورت کی عدت جو حیض سے ناامید ہو گئی ہے یا عدم بلوغ کیوجہ سے اسکو حیض نہ آتا ہو تین ماہ ہے۔[3]

اس عورت کی عدت جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو وہ چار ماہ دس دن ہے بشر طیکہ حاملہ نہ ہو۔[4]

حاملہ عورت کی عدت اس کا وضع حمل ہے۔[5]

طلاق کے دوران عدت کی مدت

عدت کی مدت کا تعین قرآن میں کیا گیا ہے تاکہ طلاق کے بعد بھی دونوں فریقین کو تعلقات بحال کرنے کا موقع مل سکے۔ عدت کے دوران شوہر اور بیوی کو ایک ساتھ رہنے کی ترغیب دی جاتی ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو مصالحت کر سکیں۔ قرآن میں عدت کے بارے میں کہا گیا ہے:

﴿ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾۔[6]

''اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک''۔"[7]

یہ آیت طلاق کے بعد عدت کی اہمیت کو بیان کرتی ہے، جو تین حیض یا مخصوص مدت پر مشتمل ہے۔ اس مدت کے دوران شوہر کو اپنی بیوی سے رجوع کرنے کا حق دیا جاتا ہے تاکہ تعلقات کی بحالی کا امکان پیدا ہو۔

احسان کے ساتھ طلاق

اسلام میں طلاق دینے کے عمل کو احسان یعنی نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کی ہدایت دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

---

[1]۔ الطلاق:1

[2]۔ البقرۃ:228

[3]۔ الطلاق:4

[4]- البقرۃ:234

[5]۔ البقرۃ:229

[6] ۔ البقرہ:228

[7] ۔ معارف القرآن، ج1، ص545

﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾۔[1]

''اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کر لیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے''۔[2]

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طلاق کے بعد بھی عورت کو انصاف اور حسن سلوک سے نوازا جائے اور اس کی عدت کے بعد اس کے مستقبل کے فیصلے میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔

طلاق دینے سے پہلے صلح کی کوشش

اسلام میں طلاق سے پہلے صلح و مصالحت کو اہمیت دی گئی ہے۔ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان اختلافات پیدا ہو جائیں تو سب سے پہلے دونوں کے خاندان کے منصفین کو شامل کر کے معاملہ حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ﴾۔[3]

''ترجمہ: اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرا دیں تو اللہ موافقت کر دے گا ان دونوں میں، بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے''۔[4]

یہ آیت اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ شوہر اور بیوی کے تعلق کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور صلح کا راستہ اپنایا جائے۔

خلع کی لغوی واصطلاحی تعریف

خلع کے لغوی معنی

لفظ خلع، خلع سے نکلا ہے اس کے معنی اتارنے[5] کے ہیں اور یہ لفظ اسی معنی کے ساتھ قرآن کریم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے ارشاد ہے:

﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ﴾[6]

((هُوَ خَلْعًا وَالِاسْمُ الْخُلْعُ بِالضَّمِّ وَهُوَ اسْتِعَارَةٌ مِنْ خَلْعِ اللِّبَاسِ لِأَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا لِبَاسٌ لِلْآخَرِ))[7]

---

[1] ۔البقرہ:232

[2] معارف القرآن۔ج2ص570

[3] ۔النساء:35

[4] ۔معارف القرآن،ج2ص393

[5]. مصباح اللغتہ۔ص215

[6] ۔سورۃ بقرۃ،187

[7]۔ردالمحتار علی الردالمختار:3ص439

"اور خلع کے ذریعہ ایک دوسرے سے علیحدگی لباس اتار دینے کے مرادف ہے"۔

اصطلاح میں خلع کہتے ہیں۔

خلع ایسا معاہدہ ہے جس میں بیوی شوہر سے علیحدگی کا مطالبہ کرتی ہے اور اسکے عوض میں مہر یا کوئی اور مالی معاوضہ واپس کرنیکی پیشکش کرتی ہے، تاکہ شادی کا رشتہ ختم کیا جاسکے۔ یہ شوہر کی رضامندی سے عمل میں آتا ہے۔

((الخلع بالضم لغةً: الإزالة، وشرعًا: إزالةملک النکاح المتوقفة قبولها بلفظ الخلع أوما في معناه کالمباراة۔[1]وعرفه الأحناف بأنه:عبارة عن أخذالمال بإزاءملک النکاح بلفظ الخلع))۔[2]

اسلام میں خلع کو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے ایک اہم ستون کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ نکاح ایک مقدس معاہدہ ہے، اور اسلام میں میاں بیوی کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اپنے ازدواجی تعلقات کو محبت، صبر، اور باہمی احترام سے نبھائیں۔ مگر بعض اوقات ازدواجی زندگی میں اختلافات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے لیے صلح کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ایسی صورت حال میں اسلام نے عورت کو خلع کا حق دے کر یہ ثابت کیا کہ شادی کا تعلق زبردستی یا بوجھ نہیں ہونا چاہیے بلکہ خوشی اور سکون کا باعث ہونا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات میں عورت کو عزت و احترام کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق دیا گیا ہے، اور خلع اس بات کی علامت ہے کہ اسلام عورت کے حقوق اور اسکے وقار کا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ خلع کا حق عورت کو ایک محفوظ راستہ فراہم کرتا ہے کہ اگر وہ ازدواجی زندگی میں بے چینی یا مشکلات محسوس کرے تو اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ اس طریقے سے اسلام نے عورتوں کے تحفظ کو یقینی بنایا ہے اور انہیں اپنے حق میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے، کہ جہاں عورت کو شادی سے علیحدگی کا حق دیا گیا ہے اگر وہ شوہر کے ساتھ اپنی زندگی کو ناخوش محسوس کرتی ہے تو وہ شوہر کی رضامندی سے شوہر سے خلع (طلاق) لے سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾[3]

"پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکمتوں کچھ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جاوے"۔[4]"

اس آیت میں خلع کی اجازت دی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اگر عورت کو خوف ہو کہ وہ شادی کے رشتے میں اللہ کے احکامات پر عمل نہیں کر سکے گی اور اس تعلق میں اس کے لیے مشکلات ہیں، تو وہ اپنا مہر یا معاوضہ دے کر علیحدگی لے سکتی ہے۔

---

[1] ۔ قواعد الفقہ، محمد عمیم الإحسان المجددي البرکتي، الناشر: الصدف۔ ببلشرز، کراتشي، 1986، ص 281، تنویر الأبصار / باب الخلع، ج 5 ص 83، زکریا۔

[2] ۔ الدر المحتار علی الرد المختار: ج 3 ص 441

[3] ۔ البقرہ: 229

[4] ۔ معارف القرآن۔ ج 2 ص 554

خلع کے مقاصد

خلع کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عورت کو ایسی زندگی میں رہنے پر مجبور نہ کیا جائے جو اس کے لیے اذیت ناک ہو۔ خلع کا نظام خواتین کو یہ اعتماد دیتا ہے کہ ان کے جذبات اور احساسات کا احترام کیا جاتا ہے، اور انہیں ایسے رشتے میں مجبور نہیں کیا جاسکتا جس میں وہ خوش نہ ہوں۔ خلع کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں اگر محبت اور ہم آہنگی برقرار نہ رہے تو فریقین کو بہترین اور مثبت انداز میں علیحدگی کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کو نئی سمت میں لے جاسکیں۔

رشتہ داروں کے حقوق

رشتہ داروں کے حقوق اسلامی تعلیمات اور انسانی معاشرتی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام نے ہمیں نہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو مضبوط بنانے کی تعلیم دی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے ارد گرد کے لوگوں، خاص طور پر رشتہ داروں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات قائم رکھنے کی تلقین کی ہے۔ قریبی رشتہ دار وہ لوگ ہیں جو نہ صرف ہمارے خون کے رشتے سے جڑے ہیں، بلکہ زندگی کے ہر لمحے میں ہمارے قریب رہتے ہیں اور ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔

قرآن و سنت میں رشتہ داروں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے، اور ہمیں صلہ رحمی (رشتہ داری نبھانے) پر خصوصی طور پر زور دیا گیا ہے۔ صلہ رحمی کا مطلب ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ محبت، احترام، مدد، اور تعاون کا رشتہ قائم رکھا جائے اور ان کے ساتھ تعلق کو کبھی بھی توڑا نہ جائے۔

رشتہ داروں کے حقوق کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کو اتنی اہمیت دی کہ قرآن میں متعدد مقامات پر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کے حقوق کو نظر انداز کرنے پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہے۔ معاشرے میں امن، بھائی چارہ، اور اخوت کی بنیاد رشتہ داروں کے درمیان محبت اور تعلق پر قائم ہوتی ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم ان حقوق کی تفصیل میں جائیں گے جو اسلام نے رشتہ داروں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

قرآن مجید میں بارہا قریبی رشتہ داروں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

﴿ وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَاتُشْرِكُوابِهِ شَيْئًاوَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًاوَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴾۔[1]

''ترجمہ: اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ اور یتیموں اور فقیروں اور ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنے

[1] ۔النساء:36

ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ بیشک اللہ کو پسند نہیں آتا اترانے والا بڑائی کرنے والا جو کہ بخل کرتے ہیں''[1]

اس ایات میں اللہ تعالیٰ نے خاندان کے افراد کے درمیان باہمی تعاون کو ایک اسلامی فریضہ قرار دیا ہے

والدین کے حقوق

والدین کے حقوق اسلام میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور ان کا شمار ان بنیادی اخلاقیات اور اصولوں میں ہوتا ہے جن پر اسلامی معاشرت کی بنیاد قائم ہے۔ والدین وہ ہستیاں ہیں جو اپنی اولاد کی پرورش، تربیت، اور زندگی کے مختلف مراحل میں ان کی مدد اور ہنمائی کیلئے اپناسب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ والدین کا احترام اور ان کے حقوق کی پاسداری نہ صرف اسلامی تعلیمات کا اہم حصہ ہے، بلکہ یہ انسانی فطرت اور اخلاقیات کا بنیادی تقاضا بھی ہے۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کے ادب واحترام، خدمت اور اطاعت کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد سب سے زیادہ زور والدین کے حقوق پر دیا ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کا حق ادا کرنا اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

والدین کے حقوق کی اہمیت اس بات سے بھی عیاں ہے کہ قرآن میں بار بار اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ والدین کے بڑھاپے میں ان کے ساتھ شفقت سے پیش آیا جائے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾[2]

''اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے پیٹ میں رکھا اس کو اس کی ماں نے تھک تھک کر اور دودھ چھڑانا ہے اس کا دو برس میں کہ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا آخر مجھ ہی تک آنا ہے''[3]

اس آیت سے عائلی زندگی میں والدین کی خدمت اور احترام کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ادب واحترام

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے:

﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّاتَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَأَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا﴾۔[4]

---

[1] ۔معارف القرآن، ج2، ص406

[2] ۔لقمان:14

[3] معارف القرآن، ج7ص30

[4] ۔الاسراء:23

''اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اسکے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو اور کہہ ان سے بات ادب کی''[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی ہے۔ ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا، احترام کرنا، اور ان کی باتوں کو توجہ سے سننا ضروری ہے۔

والدین کی خدمت اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنا

والدین کی ضروریات کو پورا کرنا، ان کی خدمت کرنا اور بڑھاپے میں ان کا خیال رکھنا اولاد کی اہم ذمہ داری ہے۔ والدین جب ضعیف ہو جاتے ہیں تو ان کی خدمت کرنا اولاد کا فرض بنتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:

''اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے اور ماں باپ کیساتھ بھلائی کرو اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو اور کہہ ان سے بات ادب کی''۔[2]

یہ آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ والدین کے ساتھ نرم اور شائستہ رویہ اختیار کرنا چاہیے، اور ان کی باتوں کو توجہ سے سننا چاہیے۔

والدین کے لیے دعا کرنا

والدین کے لیے دعا کرنا بھی ان کے حقوق میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم والدین کے لیے دعا کریں:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾۔[3]

''ترجمہ: اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کر نیاز مندی سے اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا''۔

یہ دعا ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہمیں اپنے والدین کی محبت اور قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے رحمت کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

والدین کے حکم کی پیروی کرنا

والدین کے حکم کی پیروی اور ان کی رضا کا حصول اسلام میں بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ والدین کسی ایسی بات کا حکم نہ دیں جو اللہ کے احکام کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

---

[1] ۔ معارف القرآن، ج5 ص 461

[2] ۔ ایضاً ص462

[3] ۔ الاسراء:24

الاسراء، ج5 ص462

تَعْمَلُونَ ﴾۔[1]

''ترجمہ: اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی، اور اگر وہ تجھ سے زور کریں کہ تو شریک کرے میرا جس کی تجھ کو خبر نہیں تو ان کا کہنا مت مان، مجھی تک پھر آنا ہے تم کو سو میں بتلا دوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے''۔[2]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی تلقین کی ہے، اگر والدین اللہ کے احکام کے خلاف کوئی بات کہیں تو ایسی صورت میں ان کی بات نہ ماننے کا حکم دیا ہے۔

بچوں کی پرورش اور تربیت

اسلامی تعلیمات میں بچوں کی پرورش اور تربیت کو ایک عظیم ذمہ داری اور عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ بچوں کی پرورش صرف والدین کا ہی فرض نہیں بلکہ ایک ایسی اجتماعی ضرورت بھی ہے جس پر پورے معاشرے کا استحکام اور خوشحالی منحصر ہے۔ ایک خاندان کی کامیابی اور ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں بچوں کی تربیت کا اہم کردار ہوتا ہے۔

بچوں کی ابتدائی تربیت والدین کے رویے، اخلاقی اقدار اور دینی تعلیمات کی روشنی میں ہوتی ہے، جو ان کی شخصیت سازی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں والدین کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ بچوں کو نیکی، محبت، اور اخلاقیات کے راستے پر چلائیں اور انہیں معاشرتی و دینی اقدار سے روشناس کرائیں۔

اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ والدین بچوں کو ان کے کردار، عادات، اور رویے میں اس طرح مضبوط کریں کہ وہ آنے والے وقت میں ایک مفید شہری اور صالح انسان بن سکیں۔ بچوں کی تربیت صرف دینی تعلیم تک محدود نہیں بلکہ ان کی دنیاوی ترقی، اخلاقیات، اور خودانحصاری کے فروغ کے لیے بھی ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ بچوں کی صحیح تربیت کے بغیر اپنے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا۔

بچوں کی تربیت کا آغاز ان کی پیدائش سے ہی ہوتا ہے اور ابتدائی سالوں میں والدین کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔ یہ وقت بچوں کے ذہنی، اخلاقی، اور روحانی نشوونما کا وقت ہوتا ہے، اور والدین کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو محبت، رحمت اور مثبت رویے کے ساتھ پروان چڑھائیں۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

﴿يَاأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُواقُواأَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًاوَقُودُهَاالنَّاسُ وَالْحِجَارَةُعَلَيْهَامَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴾۔[3]

''ترجمہ: اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کی چھٹیاں ہیں آدمی اور پتھر

---

[1] ۔العنکبوت:8

[2] ۔معارف القرآن، ج6 ص475

[3] ۔التحریم:6

اس پر مقرر ہیں فرشتے تند خو زبردست نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو بات فرمائے ان کو اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوا ے''۔[1]

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کی دنیاوی اور اخروی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

وراثت اور کفالت

اسلامی قانون کے تحت عائلی مسائل میں وراثت (میراث) کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے، اور قرآن میں اس کے اصول وضاحت کیساتھ اور ایک ایک کے حصے کو بیان کیا گیا ہے۔ وراثت کے قوانین کا مقصد اہلِ خانہ کے درمیان انصاف اور مالی توازن برقرار رکھنا ہے تا کہ معاشرے میں خاندانی رشتے مضبوط رہیں اور حقوق کی پاسداری ہو۔

وراثت کی تقسیم کا مقصد خاندان میں انصاف، اتفاق اور محبت پیدا کرنا ہے جب خاندان کے تمام افراد کو ان کے شرعی حقوق ملتے ہیں تو ان کے درمیان بدگمانی یا تنازعات کی بجائے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، وراثت میں ہر شخص کو اس کا جائز حصہ دینے کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی کیساتھ ظلم یا زیادتی نہ ہو۔ وراثت کے ان اصولوں عمل پیرا ہونے سے عائلی مسائل میں پیدا ہونیوالے تنازعات کو کم کیا جاسکتا ہے اور معاشرتی فلاح و بہبود کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

قرآن نے عائلی زندگی کے اصول میں وراثت کا حکم دیا تا کہ ہر فرد کو اس کا حق ملے اور خاندان میں معاشرتی اور اقتصادی استحکام پیدا ہو۔

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾۔[2]

''حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے''[3]

اسلام میں عائلی زندگی کے معاملات میں ہر شخص کو اس کے حقوق دینا لازم ہے تا کہ انصاف اور عدل کا قیام ہو۔ اسلام میں وراثت کی تقسیم کے اصول درج ذیل ہیں:

1. **قرابت داری:** وراثت کا حق خاندان کے ان افراد کو ملتا ہے جو مرحوم کے زیادہ قریب ہوں۔ اسلام نے ورثاء کو قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر کے ان کے حقوق کی وضاحت کی ہے۔
2. **شرعی حصے:** وراثت میں مردوں اور عورتوں کے حصے مقرر ہیں۔ قرآنِ مجید کے مطابق، بیٹے اور بیٹیاں، شوہر اور بیوی، والدین اور بھائی بہن، سب کو مخصوص حصے دیے گئے ہیں۔

---

[1] ۔ معارف القرآن، ج8ص501

[2] ۔ النساء:11

[3] معارف القرآن، ج2ص318

3. **بیٹی کا حق** :بیٹی کو بھی وراثت میں حصہ دیا گیا ہے، اور یہ حق کسی بھی صورت میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگر بیٹی ہو تو اسے نصف اور اگر بیٹیاں زیادہ ہوں تو دو تہائی حصہ دیا جائے گا۔

4. **بیوی کا حق** :اگر بیوی موجود ہو تو اسے شوہر کی جائیداد میں سے ایک چوتھائی حصہ ملتا ہے، بشرطیکہ کوئی اولاد نہ ہو۔ اگر اولاد موجود ہو تو بیوی کو ایک آٹھواں حصہ ملے گا۔

5. **شوہر کا حق** :اگر بیوی کی جائیداد میں وراثت ہو تو شوہر کو ایک نصف حصہ ملے گا اگر بیوی کے اولاد نہ ہو، اور اگر اولاد ہو تو ایک چوتھائی حصہ ملے گا۔

6. **والدین کا حق** :اگر والدین میں سے کوئی زندہ ہو تو اسے بھی حصہ ملتا ہے۔ قرآن کے مطابق، اگر مرحوم کے اولاد ہو تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔[1]

7. **بھائی اور بہنیں** :اگر مرحوم کی اولاد یا والدین نہیں ہیں تو بھائیوں اور بہنوں کو بھی وراثت ملتی ہے۔ ان کے حصے بھی قرآن میں وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

2. عائلی مسائل کی اہمیت (حدیث کی روشنی میں)

اہل و عیال کے ساتھ حسن سلوک:

رسول اللہ ﷺ نے عائلی مسائل میں بہترین رویے پر زور دیا اور فرمایا:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ)) [2]

البانی اور امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[3]

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ بہترین سلوک کرے''

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ عائلی زندگی میں حسن سلوک اسلام کی نظر میں بہترین عمل ہے اور اسے معاشرتی بھلائی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

ازدواجی تعلقات

رسول اللہ ﷺ نے ازدواجی تعلقات میں محبت، ہمدردی اور باہمی احترام کی تعلیم دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْأَمِيرُ رَاعٍ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[4]

---

[1] ۔ النساء: 11

[2] ۔ سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب فضل أزواج النبی ﷺ، رقم الحدیث: 3895

[3] ۔ البانی السلسلۃ الصحیحۃ، رقم الحدیث: 285

[4] ۔ صحیح البخاری کتاب النکاح، باب المراۃ راعیۃ فی بیت زوجھا، رقم الحدیث: 5200

''ترجمہ:تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا' ۔ امیر)حاکم (ہے، مرد اپنے گھر والوں پر حاکم ہے۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر حاکم ہے۔ تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں پر اپنے اہل و عیال کی دیکھ بھال اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داری ہے۔

نکاح

نکاح ایک ایسا عمل ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی ہے تاکہ وہ زندگی کی مشکلات اور آزمائشوں کا مل کر سامنا کر سکیں اور نسلوں کی تربیت اور ان کی دینی اور اخلاقی پرورش کو یقینی بنایا جا سکے۔ یہ معاشرتی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ، روحانی اور جسمانی سکون کا ذریعہ بھی ہے اور انسان کو تقویٰ، پاکدامنی اور شرعی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے۔

لہذا نکاح کا مقصد نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنا ہے بلکہ اللہ کے حضور ایک پاکیزہ تعلق قائم کرنا ہے جو آخرت میں بھی اجر کا باعث ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے نکاح کو ایمان کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کی فضیلت اور اہمیت پر مختلف مقامات پر روشنی ڈالی ہے۔

1. **نصف ایمان :** حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدْ كَمَّلَ نِصْفُ الدِّينِ، فَلْيَتَّقِ اللهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِي))[1]

علامہ البانی نے اس حدیث کو" صحیح لغیرہ "کہا ہے یعنی دیگر شواہد کی بنا پر قابلِ قبول اور درجہ " صحیح" میں داخل ہے۔[2]

''جس نے نکاح کیا، اُس نے اپنے آدھے ایمان کو محفوظ کر لیا''۔[3]"

اس حدیث سے نکاح کی اہمیت عیاں ہوتی ہے کہ یہ انسان کو ایمان کے تکمیل اور اللہ کے احکام کی پیروی کے قریب لے جاتا ہے۔

2. **نکاح، رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے :** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا":نکاح میری سنت ہے،[4] جو میری سنت سے روگردانی کرے وہ ہم میں سے نہیں''۔[5] البانی نے اسے

---

[1] مشکوۃ المصابیح، کتاب النکاح الفصل الثالث، ج2ص276رقم الحدیث 2959

[2] ۔السلسلۃ الصحیحۃ، رقم الحدیث:625

[3] ۔شعب الایمان، ج7ص340، رقم الحدیث 5100

[4] ۔ أبو عبد اللہ محمد بن یزید، ابن ماجۃ القزوینی(م:273ھ)، سنن ابن ماجۃ، دار الرسالۃ العالمیۃ، الطبعۃ الأولی 1430ھ، ص248، رقم الحدیث 1846۔

[5] ۔ صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی الناح،، ج1443،4 رقم الحدیث:5063

صحیح الجامع میں صحیح قرار دیا ہے۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور اسے ترک کرنا درست نہیں ہے۔

3. **بہترین نعمت :** حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ))۔[2]

''اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جسے استطاعت ہو اسے نکاح کر لینا چاہیے، کیونکہ نکاح آنکھوں کو نیچی رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے''۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ نکاح نہ صرف انسان کو گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ عفت اور پاکدامنی کا ذریعہ بھی ہے۔

4. **اہل وعیال کی کفالت :** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْأَمِيرُ رَاعٍ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[3].

''ترجمہ: تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اسکی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ امیر (حاکم) ہے، مرد اپنے گھر والوں پر حاکم ہے۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر حاکم ہے۔ تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا''

نکاح کے ذریعے انسان اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے اور اپنے گھر والوں کے لیے ایک محافظ اور کفیل بن جاتا ہے۔

طلاق

اسلام میں طلاق کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے، لیکن بعض حالات میں اسے ایک جائز اور ضروری حل کے طور پر بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ حدیث کی روشنی میں طلاق کی اہمیت اور اس سے متعلق احکامات کچھ اس طرح سے بیان کیے گئے ہیں:

1. **طلاق کو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین حلال عمل قرار دینا:**

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''حلال چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے''۔[4]"

---

[1] - صحیح الجامع، رقم الحدیث:6807

[2] مشکوۃ المصابیح کتاب النکاح،، ج2ص275

[3] - صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل، کتاب النکاح، باب المراۃ راعیۃ فی بیت زوجھا، ناشر الطاف اینڈ سنز، ج3ص1487، رقم الحدیث5200

[4] . سنن ابو داؤد، کتاب التفریع ابواب الطلاق، باب فی کراھۃ الطلاق،، ج2، ص370، رقم الحدیث:2178

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طلاق بظاہر حلال ہے لیکن اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے، اور اسے صرف شدید ضرورت کے وقت ہی استعمال کرنا چاہیے۔

شیطان کا خوش ہونا

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''شیطان اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے اور اس کے لشکر پھیل جاتے ہیں۔ ان میں سے شیطان کا سب سے قریبی وہ ہے جو فتنہ پیدا کرے۔ ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں فتنہ پیدا کیا، شیطان کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا۔ دوسرا آ کر کہتا ہے: میں نے میاں بیوی میں جدائی ڈالی، شیطان اسے اپنے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے: تو نے بہترین کام کیا''۔[1]"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل میاں بیوی کے درمیان جدائی اور طلاق کروانا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایسے عمل سے بچیں۔

طلاق سے خاندان اور معاشرے پر اثرات

طلاق صرف دو افراد کو نہیں بلکہ پورے خاندان اور معاشرت کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بچوں کی تربیت متاثر ہوتی ہے اور خاندان بکھر جاتا ہے۔ طلاق سے پیدا ہونیوالے مسائل اور انکے معاشرتی اثرات کو دیکھتے ہوئے، نبی ﷺ نے ہمیں تحمل اور صبر کا درس دیا ہے تاکہ ہم مشکل وقت میں برداشت اور حکمت سے کام لیں۔

والدین اور اولاد کے حقوق

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تمہاری جنت تمہاری ماؤں کے قدموں تلے ہے''(سنن نسائی)

اس حدیث میں والدہ کا مقام اور اہمیت بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عائلی نظام میں والدین کا خاص درجہ ہے۔

بچوں کی پرورش

بچوں کی پرورش اور انہیں اچھی تربیت دینے کی بہت اہمیت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھے اخلاق سے بہتر کوئی چیز نہیں دی''[2]

اس حدیث سے عائلی زندگی میں بچوں کی تربیت اور اخلاقی پرورش کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

---

[1] ۔ سنن ابو داؤد، کتاب المناسک فی باب صفقۃ حجۃ النبی ﷺ، ج2 ص596، رقم الحدیث 1905

[2] ۔ سنن ترمذی، کتاب البر والصلۃ عن رسول اللہ ﷺ، باب مَا جَاءَ فِي أَدَبِ الْوَلَدِ، رقم الحدیث: 1951

بیویوں کے حقوق

رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا:

''بیویوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عائلی زندگی میں بیوی کے حقوق کا احترام ایک اہم دینی فریضہ ہے۔

خلع احادیث کی روشنی میں

اسلامی تعلیمات میں خلع (عورت کا نکاح ختم کرنے کی درخواست) کی خاص اہمیت ہے اور احادیث میں بھی اس کا تذکرہ آیا ہے۔ خلع ایک ایسا حق ہے جو عورت کو دیا گیا ہے تاکہ اگر وہ شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے میں مشکلات محسوس کرے تو وہ نکاح کو ختم کرنے کا مطالبہ کر سکے۔ اس کے بارے میں چند احادیث درج ذیل ہیں:

((عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، "أَنَّ امْرَأَةَ ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، ثَابِتُ بْنُ قَيْسٍ مَا أَعْتِبُ عَلَيْهِ فِي خُلُقٍ وَ لَا دِينٍ، وَلَكِنِّي أَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ؟ قَالَتْ: نَعَمْ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: اقْبَلِ الْحَدِيقَةَ، وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً۔))

''حضرت ثابت بن قیس رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کی اہلیہ حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ مذکور ہے، جب وہ نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ وہ اپنے شوہر کی دینداری یا اخلاق میں کوئی برائی نہیں پاتیں مگر ان کے ساتھ نہیں رہ سکتیں، تو نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ اگر وہ شوہر کو واپس وہ باغ دے دیں جو شوہر نے ان کو مہر میں دیا تھا، تو نکاح ختم ہو جائے گا۔ حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا نے باغ واپس کر دیا اور نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے خلع کروا دیا''۔[1]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ:

((أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا فِي غَيْرِ مَا بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ))[2]

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا، "جو عورت اپنے شوہر سے بغیر کسی وجہ کے طلاق کا مطالبہ کرے گی، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے''۔

اس حدیث کو شیخ البانی نے صحیح قرار دیا ہے۔[3]

اس سے خلع کی اہمیت اور ذمہ داری کا پہلو سامنے آتا ہے کہ عورت کو خلع کا مطالبہ جائز اور درست وجوہات پر کرنا چاہیے۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ!

خلع اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک جائز عمل ہے، مگر اسے ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے جب بلا وجہ یا معمولی باتوں پر مطالبہ کیا جائے۔

---

[1] ۔ صحیح البخاری، کتاب الطلاق، رقم الحدیث: 5273

[2] ۔ جامع الترمذی، کتاب الرضاعت، باب ماجاء فی جہاۃ المرآۃ، رقم الحدیث 1151

[3] ، سلسلۃ الصحیح، رقم الحدیث: 2154

خلع کا مقصد یہ ہے کہ اگر ازدواجی تعلق میں خوشی اور امن نہیں ہے اور عورت کی جانب سے ناپسندیدگی ہے، تو اسے مجبوراً اس تعلق میں رہنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ اسلامی نظام عدل کا ایک حصہ ہے تاکہ شوہر اور بیوی دونوں کے حقوق محفوظ رہیں۔

کچھ الفاظ خلع سے قریب المعنی مستعمل ہیں جن کو مختصراً ذکر کر دیا ہے:

طلاق علی مال

طلاق علی مال ایک ایسی طلاق ہے جس میں شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور بیوی اس کے بدلے میں شوہر کو کوئی مالی منفعت دیتی ہے۔ یہ طلاق خلع کی طرح ہوتی ہے لیکن اس میں بیوی کی طرف سے مالی معاوضہ کی شمولیت ہوتی ہے جس کا مقصد علیحدگی کی منظوری حاصل کرنا ہوتا ہے۔

فسخ نکاح

فسخ نکاح ایک ایسی کارروائی ہے جس میں عدالت یا کوئی معتبر شرعی ادارہ شادی کے اختتام کا حکم دیتا ہے۔ یہ عمل اس وقت کیا جاتا ہے جب نکاح کی بنیادیں قائم نہ رہیں یا شوہر اور بیوی کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو جائیں جو مفاہمت سے حل نہ ہوں۔ فسخ نکاح کی صورت میں بیوی کی طرف سے شرعی یا قانونی وجوہات کی بنا پر نکاح کو ختم کرنے کی درخواست دی جاتی ہے۔

فدیہ

فدیہ کا مطلب ہے کسی چیز کے بدلے میں کچھ دینا۔ شرعی نکاح کے تناظر میں، یہ وہ مال یا معاوضہ ہوتا ہے جو عورت اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے شوہر کو دیتی ہے۔ فدیہ عام طور پر خلع کی صورت میں دیا جاتا ہے، جہاں عورت مالی معاوضے کے بدلے علیحدگی کی درخواست کرتی ہے۔

مباراۃ

مباراۃ باہمی رضامندی سے علیحدگی کا معاہدہ ہے۔ اس میں شوہر اور بیوی دونوں اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ وہ نکاح کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس معاہدے میں دونوں فریقین کی رضامندی شامل ہوتی ہے اور مالی معاملات بھی طے کیے جاتے ہیں۔

جس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تیسرے باب میں زیر بحث لائے جائے گی۔

فصل دوم

پاکستان کے عائلی قوانین کا جائزہ

پاکستان کے عائلی قوانین کا تعلق ان قوانین سے ہے جو ازدواجی زندگی، خاندان، وراثت، اور دیگر عائلی معاملات کو منظم کرنے کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں۔ ان قوانین کی تشکیل میں اسلامی تعلیمات کو بنیادی رہنمائی کے طور پر اپنایا گیا ہے، تاکہ معاشرے میں عدل، انصاف، اور خاندانی تعلقات میں توازن قائم رکھا جا سکے۔

قیام پاکستان کے بعد، اسلامی اصولوں کے مطابق قوانین مرتب کرنے کی کوشش کی گئی، جس کے نتیجے میں مختلف عائلی قوانین متعارف کروائے گئے، جیسے کہ مسلم عائلی قوانین آرڈیننس 1961، جس میں نکاح، طلاق، اور دیگر عائلی امور کے لیے قواعد وضع کیے گئے۔ اس فصل میں پاکستان کے عائلی قوانین کا جائزہ لیا جائے گا، تاکہ ان کے بنیادی اصول اور عملی پہلو کو اسلامی تعلیمات کے تناظر میں سمجھا جا سکے۔

کاظمی ایکٹ 1939ء

تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کے تحت مسلمانوں کے لیے عبادات سے لے کر معاملات تک اور معاشرت سے لے کر اخلاقیات تک زندگی کے تمام مسائل کے متعلق ہدایات اور قوانین وضوابط موجود ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کریم میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [1]

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا"۔

یہ اسلامی قوانین تمام اسلامی ممالک میں مرتب ومنضبط بھی رہے ہیں اور عملاً نافذ بھی۔ جب ہندوستان میں انگریز کا تسلط ہوا تو انہوں نے تمام اقوام ومذاہب کے لوگوں کے لیے الگ اور مستقل قوانین وضع نہیں کیے بلکہ ہر مذہب کے قوانین کو ہی ان پر لاگو کر دیا اور اسے مرکزی اور بنیادی قانون تسلیم کرنے کی بجائے "پرسنل" یعنی شخصی اور ذاتی قانون کا درجہ دیا گیا۔ تاہم اس میں بہت احتیاط کے ساتھ مسلمانوں کے احتجاج کے خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے حذف واضافات کیے گئے اور اسے "مسلم پرسنل لا" کا نام دیا گیا۔ سید احمد عروج قادری لکھتے ہیں:

"مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ انگریزوں ہی کے عہد حکومت میں شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس میں تبدیلیوں کے اقدامات شروع کر دیے تھے، لیکن وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اپنے اپنے پرسنل لا سے گہرا لگاؤ ہے۔ جذباتی بھی اور عقیدے کا بھی۔ اس لیے انہوں نے اس ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی

---

[1] ۔المائدۃ:3

کوشش کبھی نہیں کی"۔[1]

یہ پرسنل لا مختلف معاشرتی پہلوؤں سے متعلق تھا اور عائلی یعنی گھریلو قوانین اسی پرسنل لا کا ایک حصہ ہیں۔ جب 1947ء کو پاکستان قائم ہوا اور اہل اسلام کو انگریز کے تسلط اور اس کے مسلط کردہ قوانین سے نجات ملی تو امید کی کرن نظر آئی اور اسلامی قوانین کو ملک پاکستان میں عملاً نافذ کرنے کے لیے غور و خوض شروع ہوا۔ چنانچہ "دستورِ پاکستان" کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ہی اسلامی قوانین کو وضع کرنے کی طرف بھی توجہ کی گئی۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو وہ تمام قوانین جو متحدہ ہندوستان میں تعزیراتِ ہند کے نام سے جاری تھے، ورثہ کے طور پر حاصل ہوئے اور انہی پر عدالتی نظام جاری رہا۔ عائلی قوانین کے سلسلے میں سابقہ کاظمی ایکٹ یا قانونِ انفساخِ نکاحِ مسلمین 1939 پر ہی عمل ہوتا رہا اور نئے حالات میں شریعت ایکٹ وغیرہ کی طرف توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان کا وجود حقیقتاً ایک اسلامی حکومت کے طور پر ہوا تھا اور مسلمانانِ ہند نے پاکستان کا مطالبہ ہی اسی نعرہ کے تحت کیا تھا:

"پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ"

لہٰذا اس پس منظر میں یہ بات بھی بڑی بدیہی تھی کہ پاکستان کا آئین خالصتاً اسلامی اصولوں پر مبنی ہو گا اور تمام کے تمام قوانین کتاب وسنت کی روشنی میں از سر نو مدوّن کیے جائیں گے۔ لہٰذا عائلی قوانین بھی اسلامی ہوں گے۔ اس لیے فوری طور پر کسی کی نظر عائلی قوانین کی تبدیلی کی طرف نہ گئی۔ لیکن 1955ء میں ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ جس کی وجہ سے حکومت پاکستان اس بات پر مجبور ہو گئی کہ وہ عائلی قوانین کی تدوین کے لیے ایک کمیشن مقرر کرے۔

عائلی کمیشن کا قیام اسباب وعلل

اس خاص واقعے کی طرف اشارہ روزنامہ امروز نے اپنے ادارہ اشاعت 4رمارچ 1961ء میں بھی کیا ہے۔ وہ واقعہ یہ پیش آیا کہ جناب محمد علی بوگرہ جب پاکستان کے وزیر اعظم تھے انہوں نے اپنی پہلی بیوی حمیدہ بانو صاحبہ کی موجودگی میں اپنی ایک عرب نژاد سیکریٹری عالیہ بیگم سے شادی کر لی، تو ان کے سیاسی حریفوں کے ہاتھ ایک بہانہ آگیا انہوں نے وزیر اعظم کی حیثیت کو گھٹانے کے لیے اس بات کو خوب ہوا دی۔ ان کے ساتھ اسلام دشمن قوتوں نے بھرپور تعاون کیا۔ پاکستان کی اسلامی تعلیمات سے نابلد لیکن سوشل زندگی میں خوب نمایاں خواتین کو وزیر اعظم کے اس عمل سے ایک بہانہ مل گیا اور انہوں نے عورت کی مظلومیت اور پریشانیوں کو خوب ہوا دی۔ اتفاق سے اسی

---

[1]۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ترتیب: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ناشر: مرکزی کتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، جنوری 2015ء، ص17

دوران مصر کی ایک خاتون حقوقِ نسواں کا نعرہ لے کر پاکستان تشریف لائیں۔ انہوں نے پاکستانی خواتین کو حقوق نسواں کے تحفظ کے لیے عملی جہاد پر آمادہ کیا۔ ان تمام عوامل کے. پیش نظر ملک میں وزیر اعظم کے خلاف بیانات اور تقاریر کا سلسلہ چل نکلا اور چاروں طرف عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پاکستان کی ایک خاتون نے لندن میں یہاں تک کہہ دیا:

> "جناب محمد علی نے وہ بری حرکت کی کہ یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ہم لوگ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے یہاں کے لیڈیز اور جینٹل مین ہمیں کثیر الازدواجی کا طعنہ دے کر شرمندہ کر رہے ہیں۔ ان وجوہات کے پیش نظر حکومت نے 4 اگست 1955ء کو مسلم شادی کمیشن کا تقرر کیا"[1]

حکومت پاکستان کی وزارت قانون نے اپنی قرارداد نمبر 551/(24)EGF7 مورخہ 4 اگست 1955ء کے تحت عائلی قوانین کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس کے اراکین حسب ذیل تھے:

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین (صدر)، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (سیکریٹری)، مولانا احتشام الحق، مسٹر عنایت الرحمان، بیگم شاہ نواز، بیگم انوار جی احمد، بیگم شمس النہار محمود کمیشن کی غرض وغایت اور دائرہ کار کے سلسلے میں سرکاری گزٹ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> "Do the existing laws governing marriage divorce maintenance and other matters among Muslims require modification in order to give woman their proper place in society according to the fundamentals of Islam? The commission was asked to report on the proper registration of Marriage and divorce the right to divorce exercisable by either partner through a court or by other judicial means maintenance andestablishment of special courts to deal expeditiously with cases of acting women righir".[2]

کمیشن کے پہلے صدر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کی زندگی میں کوئی خاص کام انجام نہ پاسکا۔ ان کی وفات کے بعد جسٹس عبد الرشید صاحب اس کمیشن کے چیئر مین مقرر کیے گئے اور انہی کی صدارت میں تمام سفارشات مرتب ہوئیں۔

---

[1]۔ محمد شفیع، مفتی، جواھر الفقہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ج2 ص17

[2]۔ طلوع اسلام، اکتوبر 1963ء، ص:57

پہلا اجلاس

اس کمیشن کا پہلا اجلاس 5 اکتوبر 1955ء کو منعقد ہوا۔ جس میں طے کیا گیا کہ کمیشن کی طرف سے ایک سوالنامہ مرتب کیا جائے جس کی روشنی میں سفارشات طلب کی جائیں۔ اس اجلاس کے بعد کمیشن کے صدر خلیفہ شجاع الدین عارضہ قلب کی وجہ سے وفات پا گئے۔ بعد میں سابق چیف جسٹس پاکستان میاں عبد الرشید کو بتاریخ 27 اکتوبر 1955ء صدر مقرر کیا گیا۔

دوسرا اجلاس

کمیشن کا دوسرا اجلاس 30 نومبر 1955 کو منعقد ہوا اور طے کیا گیا کہ عائلی مسائل سے متعلق سوالنامہ اردو، انگریزی اور بنگالی زبان میں شائع کیا جائے اور دانشوروں اور علماء اور عوام الناس سے 15 جنوری 1956ء تک آراء طلب کی جائیں۔ اس کے بعد اس تاریخ میں ایک ماہ کی توسیع کی گئی۔ کمیشن کو اس سوال نامے کے جواب میں لاتعداد جوابات موصول ہوئے اور اس طرح کمیشن نے ایک رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو پیش کی جس کا گزٹ نوٹیفکیشن نمبر 9(4)-LEG ایف کے تحت کیا گیا۔ کمیشن نے جو سوال نامہ جاری کیا اسکے عنوانات حسب ذیل تھے۔

(1) نکاح کے بارے میں نو سوالات

(2) طلاق سات سوالات

(3) تعدد ازدواج پانچ سوالات

(4) مہر تین سوالات

(5) حضانت پانچ سوالات

(6) تولیت املاک دو سوالات

(7) وراثت اور وصیت پانچ سوالات

(8) انفساخ نکاح بذریعہ عدالت چار سوالات

(9) ازدواجی و عائلی عدالت گیارہ سوالات

جون 1956ء میں کمیشن نے اپنا کام پورا کر دیا اور اپنی مرتب کردہ سفارشات حکومت کو پیش کر دیں۔ ان کے شائع ہوتے ہی پورے پاکستان میں ان کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس وقت چونکہ فوجی حکومت قائم نہ تھی اور عوام و خواص سب کو انفرادی و اجتماعی اظہار رائے اور احتجاج کا حق حاصل تھا، اس لیے رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے حکومت انہیں قانونی شکل دینے کی جرات نہ کر سکی۔ اگلی حکومت نے ان سفارشات پر دوبارہ غور کیا اور کچھ ترمیم و تبدیلی کے ساتھ صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان صاحب نے 2 مارچ 1961ء کو ایک آرڈیننس جاری کر دیا۔ اس

کا نام "مسلم فیملی لاز آرڈی نینس مجریہ 1961ء" ہے۔ اس آرڈیننس کو پیش کرتے ہوئے وزیر قانون نے ایک توضیحی بیان بھی دیا جس میں بتایا گیا کہ اس کا مقصد عائلی زندگی سے متعلق قوانین قرآن پر عمل کرانا ہے۔ وزیر قانون کے اس ارشاد کے بعد جب ہم وراثت اور نکاح و طلاق سے متعلق دفعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں اور وزیر قانون کے بیان اور ان دفعات میں کوئی تطبیق سمجھ میں نہیں آتی۔[1]

اس آرڈی نینس کے پس منظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع رقم طراز ہیں:

"پاکستان بننے کے بعد ہماری حکومت نے جب پہلا لاء کمیشن بنایا، جس کا احقر بھی ممبر رہا ہے۔ تو اس میں بھی جب عائلی مسائل کی نوبت آئی، راقم الحروف نے ایسی تجاویز پیش کیں، جن سے عورتوں کی مشکلات کا صحیح حل اور ظلم سے نجات کی صورتیں قرآن وسنت کے تحت عمل میں آسکیں لیکن مقدرات سے یہ لاء کمیشن بھی اپنا کام نہ کر سکا اور یہ مسائل اسی طرح رہ گئے۔ اس کے بعد ہماری حکومت نے ان مقاصد کے لیے ایک عائلی کمیشن مرتب کیا، مگر افسوس کہ اس میں اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ عائلی مسائل کا بیشتر حصہ خالص مذہبی اور شرعی ہے، اس میں ایسے ہی لوگوں کی تجویز عام مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے جن کی علوم دینیہ کی مہارت پر پورے ملک کو اعتماد ہو، اس کمیشن میں صرف ایک عالم مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کو لیا گیا، کمیشن نے ایک سوال نامہ پورے ملک میں شائع کرایا۔ سوال نامہ سے کمیشن کے عزائم اور ان کے مضمرات کی غمازی ہوتی تھی، ملک بھر میں علماء کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی طرف سے سوالات کے جوابات میں بھی ان چیزوں پر اقدام کرنے کی شدید مخالفت ظاہر کی گئی، جن میں خلاف شرع قانون سازی کا احتمال پایا گیا، بالآخر کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کر دی، جس میں علماء دین کے جوابات کو یکسر نظر انداز کر کے قرآن وسنت کے بالکل خلاف قوانین کی سفارش کی گئی"۔[2]

رپورٹ کے شائع ہونے پر اطراف ملک سے ہر طبقہ کے مسلمانوں کی طرف سے شدید احتجاج ہوا، اس کے نتیجہ میں حکومت نے اس کو سکوت والتواء میں ڈال دیا۔ معلوم نہیں کن اسباب و دواعی کے ماتحت مارشل لاء حکومت کے دوران اس دفن شدہ قانون کو پھر نکالا گیا، اور پچھلی حکومتوں کے بنائے ہوئے تمام سابقہ قوانین اور منصوبوں میں سے صرف اسی کو اس قابل سمجھا گیا کہ تمام مذہب پرست مسلمانوں کے شدید احتجاج کے باوجود اس کو ان پر مسلط کر دیا جائے۔ اس کے لئے اتنا انتظار بھی گوارا نہ کیا گیا، کہ آگے آنے والی اسمبلی اس پر غور کر لے۔

---

[1]۔ سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص59

[2]۔ محمد شفیع، مفتی، جواھر الفقہ، ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، 2010ء، جلد4، ص234

مسلم فیملی لاز آرڈیننس کی قابل اعتراض دفعات

مسلم فیملی لاز آرڈی نینس مجریہ 1961ء بہت سی قابل اعتراض دفعات پر مشتمل ہے۔ ان دفعات میں جو قوانین وضع کیے گئے ہیں ان میں سے کسی قانون کے لیے بھی قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس شرعی میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ ان دفعات کو پڑھ کر ذہن سب سے پہلے یہ تاثر قبول کرتا ہے کہ مسلمان حکمران اسلام کے مسلمہ عقائد پر مطمئن نہیں ہیں اور وہ اپنے خود ساختہ نظریات کو طاقت کے زور سے دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ہم درج ذیل سطور میں ان قابلِ اعتراض دفعات کا ذکر کرتے ہیں۔

دفعہ نمبر4: وراثت کا مسئلہ

اس دفعہ کی رو سے دادا اور نانا کے ان پوتوں اور پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کو دادا اور نانا کا وارث قرار دیا گیا ہے جن کے باپ یا ماں مورث کی زندگی ہی میں وفات پا گئے ہوں۔ اس طرح مورث کی زندہ اولاد کے ساتھ اس کی اس مردہ اولاد کو بھی وراثت میں شریک قرار دیا گیا ہے جو مورث کی زندگی ہی میں وفات پا چکی ہو۔[1]

قرآن وحدیث کا فیصلہ

دین اسلام کا ایک مسلمہ عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم، حکیم اور رحیم ہے۔ اس کے علم و حکمت اور شفقت و رحمت کی کوئی نظیر نہ موجود ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے لیے جو قوانین ہمیں دیے ہیں وہ سب کے سب بلا استثناء انتہائی حکیمانہ اور ہمارے لیے بے حد نفع بخش ہیں۔ مثال کے طور پر قانون میراث کے سیاق وسباق میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[2]

"یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حصے ہیں۔ بلاشبہ اللہ علیم (تمام حقیقتوں کو جاننے والا) ہے اور حکیم ہے۔ (یعنی اس کے تمام احکام حکمتوں سے معمور ہیں)"۔

نیز ایک جگہ فرمایا:

﴿وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ﴾[3]

"یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ صاحب علم اور بردبار ہے"۔

ان آیتوں کو سامنے رکھ کر اس دفعہ کو پڑھیں جو اوپر وراثت سے متعلق نقل کی گئی ہے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس دفعہ کے مرتبین عملی طور پر اس کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں کہ ان کا علم و حکمت اور ان کی شفقت و رحمت

---

[1]۔ مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، ناشر: جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور، ج5، ص65

[2]۔ النساء:11

[3]۔ النساء:12

خدا کے علم اور اسکی شفقت ورحمت سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ آج تک امت کا اجماعی عقیدہ و عمل یہ رہا ہے کہ مورث کی زندگی میں اس کی جو اولاد مر جاتی ہے وہ اس کے ترکے سے محروم ہو جاتی ہے، لیکن یہ دفعہ کہتی ہے کہ ہم اس اجماعی عقیدہ و عمل کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم تو مردہ اولاد کو بھی ترکے کا مستحق قرار دے کر رہیں گے۔ ہماری شفقت و مہربانی پوتوں اور پوتیوں کی محرومی برداشت نہیں کر سکتی۔[1]

لیکن یہ ہمدردی صرف پوتوں، پوتیوں تک محدود ہے دیگر ورثاء جو مورث کی حیات میں وفات ہوئے ان کو یہ ہمدردی بھی مستحق وراثت نہیں سمجھتے، یعنی ان کے ہاں بھی نظام و قانون میں یکسانیت و مساوات نہیں پائی جاتی۔

سورہ نساء کی جن آیتوں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے انکے بعد کی آیتیں خاص طور پر ایمان والوں کیلئے قابل توجہ ہیں۔ فرمایا گیا:

﴿تِلْكَ حُدُودُاللَّهِ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَاالْأَنْهَارُخَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (13) وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَاوَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾ [2]

"یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کریں گے، اللہ انہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ عظیم کامیابی ہے اور جو شخص اللہ و رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود سے آگے بڑھے گا، اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور وہ رسوا کن عذاب میں مبتلا ہو گا"۔

دفعہ نمبر 5: شادی بیاہ کی رجسٹریشن

ہر وہ شخص جو ذیلی دفعہ (3) مذکورہ بالا کی خلاف ورزی کرے گا، وہ قید محض جس کی میعاد تین ماہ ہو سکتی ہے، یا جرمانہ جو ایک ہزار روپے تک ہو سکتا ہے، یا ہر دو سزاؤں کا مستوجب ہو گا۔

قرآن وحدیث کا فیصلہ

اگر اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جو نکاح رجسٹریشن کے بغیر عمل میں آئے، وہ قانوناً نکاح ہی نہ قرار دیا جائے تب تو یہ دفعہ قرآن و سنت اور اجماع امت کے واضح ارشادات کے بالکل منافی ہے، نہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے نکاح کے شرائط میں رجسٹری کرانے کو کہیں دخل دیا ہے، اور نہ پوری امت نے اس کو شرط سمجھا ہے۔

اور اگر منشا یہ ہے کہ کہ نکاح تو تسلیم کیا جائے، مگر خلاف ورزی قانون کی بناء پر اس کو سزا دی جائے، تو یہ ایک خالص انتظامی معاملہ ہے، بدنظمی اور جعلسازی کو روکنے کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی ایسا اقدام تو مناسب ہے، مگر اس پر اتنی شدید سزاؤں کا کوئی جواز نہیں ہے، غور کیا جائے کہ جائیدادوں کے بیع ناموں کا رجسٹریشن بھی تو ایک حیثیت

---

[1] ۔ سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص64

[2] ۔ النساء14،13

سے ضروری ہی سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی خلاف ورزی پر کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی، صرف یہ کیا جاتا ہے کہ غیر رجسٹری شدہ بیع نامے، ہبہ نامے وغیرہ کا کوئی نزاع جب عدالت میں پہنچتا ہے، تو عدالت اس کو جائز دستاویز قرار نہیں دیتی، لہٰذا اہل معاملہ دشواریوں سے بچنے کے لئے رجسٹریشن کا خود بخود اہتمام کرتے ہیں۔[1]

قرآن کریم نے قرض ادھار کے معاملات کو کتابت میں لانے کی ہدایت دی ہے، تاکہ بعد میں کسی نزاع کی صورت نہ بنے لیکن یہ بات ہدایت ہی کے درجہ میں رکھی ہے، کوئی قانون نہیں بنایا، جس کی خلاف ورزی قابل سزا جرم ہو۔ ارشاد قرآنی ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾[2]

"اے ایمان والو! جب تم کوئی معاملہ کسی مدت تک ادھار کا کرو تو اس کو لکھ لیا کرو"۔

اگر یہی طریق کار نکاح کے رجسٹریشن میں ہو جائے، تو بلاشبہ انتظامی مقصد پورا جائے گا، اور لوگوں کو سزاؤں کے چکر سے بھی نجات مل جائے گی، کیونکہ بہت سے پہاڑی اور جنگلی علاقے ایسے بھی ہیں جو رجسٹریشن کے لئے دور دراز سفر کئے بغیر رجسٹریشن نہیں کرا سکیں گے۔

دفعہ نمبر 6: تعددِ ازواج

یہ دفعہ تعددِ ازدواج پر پابندی عائد کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اس میں ایک شخص کو جو ایک بیوی یا زائد بیویوں کی موجودگی میں مزید نکاح کرنا چاہتا ہو، اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ:

اولاً: وہ اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں کی رضامندی حاصل کرے۔

ثانیاً: اپنے علاقے کی یونین کونسل کے چیئرمین سے اجازت حاصل کرنے کی درخواست کرے۔

ثالثاً: ایک پنچایت کو، جو اس شخص کے نمائندے اور اس کی بیوی یا بیویوں کے نمائندے اور یونین کونسل کے چیئرمین پر مشتمل ہو گی، مطمئن کرے کہ اس کا مزید ایک بیوی کرنا ضروری اور حق بہ جانب ہے۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد پنچایت سے اجازت نامہ حاصل کرنے پر وہ نکاح کرنے کا مجاز ہو گا، لیکن پنچایت اس بات پر اسلام کے عائلی قوانین کے اس فیصلے کے خلاف مغربی پاکستان میں کلکٹر کے پاس اور مشرقی پاکستان میں سب ڈویژنل آفیسر کے پاس اپیل کی جاسکے گی اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو گا، جس کے خلاف کہیں کوئی اپیل نہ ہو سکے گی قطع نظر اس کے کہ وہ نکاح کی اجازت دینے کے حق میں ہو یا اجازت منسوخ کرنے کے حق میں۔

مزید برآں اس دفعہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو شخص مذکورہ بالا قاعدہ کے خلاف نکاح کرلے:

---

[1] ۔ جواھر الفقہ، ج4، ص267

[2] ۔ البقرۃ: 282

اس کی بیوی یا بیویوں کو فوراً پورا مہر دلوایا جائے گا، خواہ وہ اصلا مہر معجّل ہو یا مؤجل۔ اس کو ایک سال قید یا پانچ ہزار روپے جرمانہ تک کی سزا دی جائے گی یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

اس کا نکاح علاقے کے رجسٹرار کے پاس درج نہیں کیا جائے گا، جس کے معنی غالباً یہ ہیں کہ وہ سرے سے قانوناً تسلیم ہی نہیں ہو گا۔ اس کی بیوی کو یہ حق حاصل ہو گا کہ اس شکایت کی بنیاد پر عدالت میں خلع کا مطالبہ کرے۔[1]

قرآن وحدیث کا فیصلہ

اس دفعہ کا منشاء بظاہر ان مظالم کو دور کرنا ہے، جو ایک سے زائد نکاح کرنے والوں کی طرف سے ان کی بیویوں پر ظہور میں آسکتے ہیں، اس لئے اس دفعہ کی رو سے دوسرا نکاح کرنے پر کڑی پابندیاں لگائی گئی ہیں۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف ایک بیوی رکھنے والے کیا اس ظلم کے مرتکب نہیں ہوتے، یا انکی مظلوم بیوی کو ظلم سے نجات دلانا ضروری نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر جو اصول اس دفعہ میں اختیار کیا گیا ہے کیا اسکا تقاضا یہ نہیں ہو گا کہ پہلا نکاح کرنے والے ہر شخص پر بھی یہی پابندی لگائی جائے کہ یونین کے چیئرمین کے سامنے اپنے نکاح کی ضرورت اور اسکی ذمہ داریوں کو انصاف کیساتھ پورا کرنیکی ضمانت پیش کر کے اجازت حاصل کئے بغیر کوئی اقدام نکاح کا نہ کرے اور جو ایسا نہ کرے وہ قابل سزا مجرم قرار دیا جائے۔ مگر ظاہر ہے کہ کوئی سمجھدار انسان شادی پر ایسی پابندیاں عائد کرنے کا حامی نہیں ہو سکتا، وجہ یہ ہے کہ اصل شادی کرنا تو کوئی جرم نہیں، جرم وہ غلط کاریاں ہیں جو بعد میں ادائے حقوق کے بارے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جسطرح پہلی کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی پر عدالتی کارروائی کیجاسکتی ہے، اسی طرح ایک سے زائد بیویوں میں بھی کی جاسکتی ہے۔ قانون اور حکومت کی مداخلت کا وہ وقت ہوتا ہے، جب کوئی فرد حقوق ادا نہ کرے، صرف خوف یا بے اعتمادی کی بناء پر مداخلت صحیح نہیں۔[2]

اس دفعہ کا اصل منشاء کسی ظلم کو روکنا نہیں بلکہ غیر مسلموں کے نظریات سے متاثر ہو کر خود تعدد ازدواج کو ایک مکروہ شے اور جرم قرار دینا ہے۔ جو شخص اسلام اور انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو، وہ اس اقدام کو کھلے طور پر اسلام پر گستاخانہ حملہ کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ جو لوگ تعدد ازدواج کو جرم سمجھتے ہیں، ان کے یہاں زنا جرم نہیں۔ غیر محدود عورتوں کو دانستہ طور پر رکھنا جرم نہیں، اس لئے تعدد ازدواج کو ترک کر دینا، ان کی کسی ضرورت میں حائل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک کے سوا پوری دنیا میں ناجائز بچوں کی تعداد روز بروز طوفانی رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے۔

قرآن کا کھلا ہوا فیصلہ اس معاملے میں ہر مسلمان جانتا ہے کہ:

---

[1]۔ مسلم عائلی قوانین آرڈیننس، 1961ء، (اردو ترجمہ، نمبر 8، مجریہ 1961ء) ص 14

[2]۔ جواھر الفقہ، ج4، ص 251، 252

﴿فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾ [1]

"تو عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند آئیں دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے"

اس آیت نے مسلمان کے لئے چار عورتوں تک بیک وقت نکاح میں جمع رکھنے کی اجازت دی ہے۔ رہا ان کا یہ کہنا کہ قرآن نے خود واضح کر دیا ہے کہ یہ اجازت ان لوگوں کے لئے ہے جو ایک سے زائد بیویوں کے حقوق عدل و انصاف کے ساتھ پورے کر سکیں اور جو اس پر قادر نہیں اس کے لئے قرآن کا فیصلہ یہ ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً ﴾ [2]

"یعنی اگر تم چند بیویوں میں برابری نہ کر سکو تو پھر ایک ہی نکاح پر اکتفا کرنا چاہئے"۔

سو یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے قرآن کریم نے پہلے نکاح کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَايَجِدُونَ نِكَاحًاحَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ [3]

"اور جن لوگوں کو نکاح کے مواقع میسر نہ ہوں، وہ پاک دامنی کے ساتھ رہیں، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انہیں بے نیاز کر دے"۔

یہ دونوں حکم ایک اخلاقی ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی کرنے پر انسان گناہ گار اور محشر میں جوابدہ ہو گا، لیکن ان دونوں آیتوں میں نکاح پر کوئی قانونی پابندی نہیں کہ نکاح کو قابلِ سزا جرم قرار دے دیا جائے اور یہ اخلاقی ہدایت جیسے ازدواجِ ثانی پر ہے اسی طرح پہلے نکاح پر بھی ہے۔[4]

مفتی محمود [5] ؒ فرماتے ہیں:

"آرڈیننس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا نکاح کوئی جرم اور عار کی بات ہے۔ صرف ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ حالانکہ قرآن پاک دو دو تین تین چار چار نکاح کرنے کا حق مردوں کو دیتا ہے۔ صرف ایک خطرے کی صورت میں ایک پر اکتفا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿فَانْكِحُوامَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾ [6]

"تو عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند آئیں دو دو سے تین تین سے اور چار چار سے"۔

---

[1]۔ النساء:3

[2]۔ النساء:3

[3]۔ النور:33

[4]۔ محمد شفیع، مفتی، جواہر الفقہ، ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، 2010ء، جلد4، ص52،52

[5]۔ مفتی محمود ایک بااثر مذہبی رہنما اور سیاست دان تھے۔ کانگریس پارٹی کے سابقہ رکن اور جمعیت علمائے اسلام کے بانی رکن تھے۔ وہ سال1919ء میں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے عبد الخیل گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ لسانی طور پر مروت پشتون قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام مولانا خلیفہ محمد صدیق ؒ تھا۔ (عبد الحکیم اکبری، مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمود ؒ کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات (ڈیرہ اسماعیل خان: مکتبۃ الحمد، 2010)، ص25۔)

[6]۔ النساء:3

ایک ایسے کام پر سزا تجویز کرنا جس پر عہد صحابہ سے لے کر آج تک کسی نے سزا نہیں تجویز کی اور نہ قرآن و حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ اس کو مداخلت فی الدین کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ نیز دوسرے نکاح کو پہلی بیوی کے خلع و تفریق کے لیے وجہ جواز قرار دینا دین میں خود ساختہ اضافہ ہے۔ اسی طرح دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو فوراً مہر دینے کا پابند کرنا چاہے مہر موجل کیوں نہ ہو، بے چارے مرد پر خواہ مخواہ کا غصہ ہے۔

ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ بلا اجازت دوسرا نکاح کیا ہوا رجسٹرار کے دفتر میں درج نہ ہو گا جس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ وہ نکاح نہ سمجھا جائے گا حالانکہ شریعت میں نکاح صرف دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کرنے کا نام ہے اور اس میں رجسٹرار کے دفتر کی کوئی قید نہیں ہے۔ [1]

دفعہ نمبر7: طلاق ضمن 3،4

اس دفعہ کی تیسری اور پانچویں شق میں طے کیا گیا ہے کہ:

1۔ طلاق کی عدت، طلاق دینے کے وقت سے شروع نہیں ہو گی، بلکہ یونین کونسل کے چیئرمین کو نوٹس ملنے کے بعد سے شروع ہو گی۔

2۔ اور یہ عدت عورت کے غیر حاملہ ہونے کی صورت میں نوے (90) دن کی ہو گی اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل تک یا نوے (90) دن تک (ان میں سے جو عدت بھی طویل تر ہو) ہو گی، یعنی اس عدت کے اندر رجوع کا حق ہو گا۔

شق 4 میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر وہ نکاح، جو کسی مؤثر طلاق کے ذریعے سے ختم ہو چکا ہو، اس کے فریقین دوبارہ باہم نکاح کر سکیں گے، بغیر اس کے کہ یہ یک وقت دی ہوئی طلاقیں خواہ تین ہی کیوں نہ ہوں، مغلظہ نہیں ہوں گی اور عملاً ان کی تاثیر ایک ہی طلاق کی ہو گی۔ [2]

قرآن وحدیث کا فیصلہ

اس قانون کی رو سے بغیر مجوزہ قانونی صورت کے شوہر کی کوئی طلاق مؤثر نہ ہو گی، خواہ وہ ایک طلاق ہو یا دو، تین، اور خواہ صریح الفاظ سے ہو یا کنایہ اور خواہ رخصتی سے پہلے ہو یا بعد میں، یہاں دو باتیں قابل غور ہیں، اول یہ کہ طلاق کے موثر ہونے کے معنی کیا ہیں، دوسرے یہ کہ طلاق کے مؤثر ہونے کے متعلق قرآن و سنت کے احکام کیا ہیں، اسی سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ قانون قرآن و سنت سے کس حد تک ہم آہنگ ہے۔

شرعاً اور عقلاً طلاق کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک طلاق دینے والے شوہر پر عورت کا حرام ہو جانا۔ دوسرے

[1] ۔ مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، ناشر: جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور، ج5، ص61

[2] ۔ قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ص62

عورت کا دوسروں کے نکاح کے لئے حلال ہو جانا۔

مذکورہ دفعات قانون سے واضح ہے کہ کسی طلاق کا کوئی اثر نوے دن سے پہلے مرتب نہ ہو گا۔ اس کے بالمقابل قرآن وسنت کے احکام دیکھیے۔ سورۃ احزاب میں ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا﴾ [1]

"اے ایمان والو! جب تم نے مومن عورتوں سے نکاح کیا ہو، پھر تم نے انہیں چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دی ہو، تو ان کے ذمہ تمہاری کوئی عدت واجب نہیں ہے جس کی گنتی تمہیں شمار کرنی ہو۔ لہذا انہیں کچھ تحفہ دے دو، اور انہیں خوبصورتی سے رخصت کر دو"۔

اس آیت کی رُو سے وہ عورت جس کے ساتھ خلوت نہیں ہوئی، اگر اس کو طلاق دے دی گئی، اس کے حق میں طلاق کے دونوں قسم کے اثر یعنی شوہر اول کے لئے حرمت اور دوسروں کے لئے حلت فوری ہے، ایک گھنٹہ کا بھی کوئی انتظار نہیں لیکن عائلی قانون اس کے لیے بھی نوے دن تک کسی قسم کا اثر تسلیم نہیں کرتا۔

سورۃ طلاق کی پہلی آیت ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ [2]

"اے نبی! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دینے لگو تو انہیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو اچھی طرح شمار کرو"۔

اس آیت میں یہ حکم ہے کہ طلاق عدت کے وقت دی جائے، صحیح بخاری میں بروایت ابن عمر اسکی یہ تشریح مذکور ہے کہ ایسے زمانۂ طہارت میں طلاق دیجائے جس میں اسکے ساتھ مباشرت نہ ہوئی ہو۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں:

((عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ عَلَى عَهْدِرَسُولِ اللهِ ﷺ،فَسَأَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ لِيُمْسِكْهَا حَتَّى تَطْهُرَ، ثُمَّ تَحِيضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدُ، وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ، فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ)). [3]

"عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بحالت حیض طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے نبی ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو رجوع کرنے کا حکم دو، پھر وہ اس کو روکے رکھے، یہاں تک کہ پاک ہو جائے، پھر حیض آئے پھر پاک ہو جائے پھر اگر چاہے تو اس کے بعد اپنے پاس رہنے دے اور اگر چاہے تو صحبت کرنے سے پہلے طلاق دے، یہی وہ عدت ہے، جس کے لئے عورتوں کو طلاق دیئے جانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے"۔

---

[1]۔ الأحزاب:49

[2]۔ الطلاق:1

[3]۔ صحيح البخاري، كتاب الطلاق، باب قول الله تعالى يا ايها النبى اذا طلقتم النساء فطلقوهن بعد تهن آ خصوا العدة، 1311ه، ج7 ص41، رقم الحديث: 5251

اگر طلاق کا لفظ زبان سے نکلنے کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتا، تو اس حکم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اس معاملہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر پر جو اپنی زوجہ کو بحالت حیض طلاق دینے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے عتاب فرمایا اس کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ سورہ بقرہ میں ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾ [1]

"اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین مرتبہ حیض آنے تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں اور اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہوں تو ان کے لیے حلال نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ (حمل یا حیض) پیدا کیا ہے اسے چھپائیں، اور اس مدت میں اگر ان کے شوہر حالات بہتر بنانا چاہیں تو ان کو حق ہے کہ وہ ان عورتوں کو (اپنی زوجیت) میں واپس لے لیں"۔

اس آیت میں قرآن حکیم نے مرد کی زبان سے طلاق کا لفظ نکلتے ہی اس کی بیوی کو مطلقہ کا نام دے کر یہ بتلا دیا کہ طلاق کا اثر اول یعنی شوہر کے لئے حرام ہونا فوراً قائم ہو گیا، البتہ دوسرا اثر کہ دوسرے شخص سے نکاح کر سکیں اس کو عدت پورے ہونے پر موقوف کیا ہے۔ نیز شوہر کو یہ حق دیا ہے کہ عدت کے دوران اپنی طلاق سے شرائط رجعت کے موافق رجوع کر لے۔ اگر طلاق اثر انداز ہی نہ تھی، تو بیویوں کو مطلقات کا نام دینے اور شوہروں کو رجعت کا حق دینے کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اسی طرح تمام آیات قرآن متعلقہ طلاق کا مفہوم یہی ہے کہ طلاق کے دو اثر ہیں:

1۔ پہلا اثر شوہر کے لئے حرام ہو جانا، طلاق کے زبان سے نکلتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

2۔ اثر دوم یعنی دوسروں کے لئے نکاح حلال ہونا عدت گزرنے پر موقوف ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین وصحابہ کرام کے تمام فیصلے اس پر واضح ثبوت ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرمایا:

((ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَالطَّلَاقُ، وَالرَّجْعَةُ.)) [2]

"تین چیزیں ایسی ہیں جن کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے، نکاح، طلاق اور رجعت"۔

اور بروایت حسن اس حدیث میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

((مَنْ طَلَّقَ أَوْأَعْتَقَ أَوْ نَكَحَ أَوْ أَنْكَحَ جَادًّا أَوْ لاعِبًا فَقَدْ جَازَ عَلَيهِ.)) [3]

"جس نے طلاق دی یا آزاد کیا یا نکاح کیا یا نکاح کروایا خواہ سنجیدہ ہو یا کھیل کھیل میں، وہ بہر حال اس پر لاگو ہو گیا"۔

شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے [4]

---

[1] ۔البقرۃ:228

[2] ۔سنن الترمذي، كتاب الطلاق واللعان عن رسول الله، باب ماجاء في الجد والهزل والطلاق:,رقم الحديث:1184

[3] ۔علاء الدين، علي المتقي الهندي(ت 975) كنز العمال، الناشر: مؤسسة الرسالة، 1981م (9/643)، رقم الحديث:27788

[4] ۔ صحيح الجامع، رقم الحديث 3021

اس میں اس کی وضاحت ہے کہ ہنسی مذاق میں بغیر ارادہ کے الفاظ طلاق کہہ دینے کو بھی فوری طور پر مؤثر قرار دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں عائلی قانون نوے دن پورے ہونے سے پہلے طلاق کا کوئی اثر تسلیم نہیں کرتا، اسی وجہ سے ضمن (4) میں ثالثی کونسل کو مصالحت کرانے کے لئے مامور کرتا ہے، جو حرمت ثابت ہونے کے بعد ان دونوں کو حرام کی ترغیب دینے کے مرادف ہے، اور اگر مصالحت سے مراد واضعانِ قانون کی نظر میں رجعت یا منسوخی طلاق ہے، تو وہ بھی ہر طلاق میں نہیں ہوسکتی، صرف طلاق رجعی میں ہوسکتی ہے، جو صریح الفاظ طلاق کے ساتھ ایک یا دو مرتبہ تک دی گئی ہو۔ اور جس طلاق میں بالکل رشتہ زوجیت قطع کرنے کے الفاظ بہ نیت طلاق کہے گئے ہوں، جیسے حرام، بائن وغیرہ اس میں رجعت یا مصالحت کا ازروئے قرآن وسنت کوئی امکان نہیں۔ جیسا کہ فاروقِ اعظم اور علی المرتضیٰ کے مذکور الصدر فیصلوں سے ثابت ہے، جبکہ عائلی قانون علی الاطلاق ان میں مصالحت کرانے کی سعی کرتا ہے، یہ قرآن کے ساتھ کھلا تصادم ہے۔

اور قرآن کریم میں جس مصالحت کا ذکر ہے، وہ طلاق سے پہلے رفعِ نزاع کے لئے ہے تاکہ طلاق تک نوبت ہی نہ پہنچے۔ اور اس میں اس کی رعایت ہے کہ معاملہ صرف دونوں کے خاندان ہی تک محدود رہے، غیروں کی مداخلت نہ ہو۔ عائلی قانون نے اس کے بالکل برعکس طلاق ہو جانے کے بعد مصالحتی کونسل کا کام شروع کیا اور اس میں یونین کے چیئرمین کا اپنی طرف سے اضافہ کر کے وہ مصلحت بھی ختم کردی کہ زوجین کے نزاع میں کسی غیر کی مداخلت نہ ہو، کیونکہ اس سے فریقین کی رسوائی اور نزاع بڑھ جانے کا امکان زیادہ ہے۔ [1]

دفعہ 7: ضمن 5

اگر طلاق کے اعلان کے وقت بیوی حمل سے ہو، تو طلاق اس وقت تک مؤثر نہیں ہوگی، جب تک ذیلی دفعہ 3 میں مذکورہ مدت یا مدّتِ حمل جو بھی زیادہ ہو، ختم نہ ہو جائے۔

قرآن وحدیث کا فیصلہ

گزشتہ سطور میں واضح کیا جاچکا ہے کہ طلاق کے دو اثر ہوتے ہیں:

1۔ پہلے شوہر کے لئے حرمت

2۔ اور دوسرے کے لئے حلت۔

پہلا اثر تمام نصوص قرآن وسنت کی رُو سے اسی وقت ثابت ہو جاتا ہے جس وقت الفاظِ طلاق زبان یا قلم سے نکلے اور دوسرا اثر عدت گزرنے پر موقوف رہتا ہے۔ پھر دوسرے اثر کے لئے قرآن کریم نے حاملہ عورت کی عدت وضع حمل قرار دی ہے، خواہ وہ کتنی ہی قلیل یا کثیر مدت میں واقع ہو، قرآن کی تصریح اس میں بالکل واضح ہے:

---

[1]۔ جواہر الفقہ، جلد 4، ص 57، 58

﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [1]

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر طلاق کے ایک ہی دن بعد وضع حمل ہو جائے تو عدت ختم ہو گئی اور دوسرا نکاح اس کیلئے حلال ہو گیا، اسکی اولاد ثابت النسب وارث ہے۔ مگر ہمارا عائلی قانون کہتا ہے کہ ابھی نواسی (89) دن تک طلاق مؤثر نہیں، نہ یہ عورت اپنے طلاق دینے والے کیلئے حرام ہے، نہ دوسرے شخص سے اس کا نکاح حلال ہے۔ جب نکاح جائز نہیں تو جو اولاد اس سے ہو گی، وہ قانونی اولاد نہ ہونے کے سبب وراثت سے محروم ہو گی، یہ قرآن سے کھلا تصادم ہے۔ [2]

دفعہ 7: ضمن 6

ایسی بیوی کے لیے جس کا نکاح دفعہ ہذا کے تحت مؤثر شدہ طلاق کی وجہ سے فسخ ہو چکا ہو، کسی اور شخص سے شادی کیے بغیر اسی خاوند سے دوبارہ شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہو گا، تاوقتیکہ ایسا فسخ نکاح تیسری مرتبہ اسی طرح مؤثر نہ ہو چکا ہو۔

قرآن وحدیث کا فیصلہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ [3]

”طلاق (زیادہ سے زیادہ) دوبار ہونی چاہیے، اس کے بعد یا تو قاعدے کے مطابق روک رکھے یا خوش اسلوبی سے چھوڑ دے“۔

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ [4]

”پھر اگر شوہر طلاق دیدے تو وہ اس کیلئے اس وقت تک حلال نہیں ہو گی جب تک وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے“

ان دونوں آیتوں کا تقاضا یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق تک تو رجعت یا آپس میں دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے مگر تیسری طلاق ہو جائے تو رجعت اور آپس میں دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا، جب تک دوسرے مرد سے شادی اور پھر اس کی موت یا طلاق واقع نہ ہو جائے۔

اس آیت کی تشریح ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ابو داؤد میں اس طرح منقول ہے کہ:

---

[1] ۔ الطلاق:4

[2] ۔ جواھر الفقہ، جلد 4، ص 60

[3] ۔ البقرۃ:229

[4] ۔ البقرۃ:230

”زمانہ جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو کتنی ہی طلاقیں دے ڈالے، بہر صورت اس کو رجعت کا حق رہتا تھا اور مظلوم بیوی کو اس سے چھٹکارا حاصل ہونے کی کوئی صورت بجز اس کے نہ تھی کہ وہ خود ہی چھوڑ دے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ نے جاہلیت کی اس رسم کو باطل کر کے یہ حکم دے دیا کہ تین طلاق کے بعد رجعت کا کوئی حق نہیں، بلکہ اب اس کا دوبارہ نکاحِ جدید بھی اس عورت کے ساتھ بغیر دوسری شادی اور پھر اس سے جدائی کے نہیں ہو سکتا“۔[1]

ہمارا عائلی قانون پھر قرآن کے خلاف عہد جاہلیت کی رسم کو زندہ کرنا چاہتا ہے، کیونکہ عائلی قانون نکاحِ جدید میں کوئی مانع نہیں قرار دیتا، جب تک پہلی تین طلاقیں اس قانون کے مفروضہ طریقہ کے مطابق مؤثر ہو کر ثابت نہ ہو چکی ہوں، اور یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ قرآن وسنت کی رُو سے ہر طلاق زبان یا قلم سے نکلتے ہی مؤثر ہو جاتی ہے، اس کے مؤثر ہونے میں نوے دن کی مفروضہ شرط جو اس قانون نے لگائی ہے وہ بالکل قرآن وسنّت کی تحریف اور اس سے کھلا تصادم ہے، اس لیے جب کسی شخص نے تین طلاقیں دیدیں، تو وہ خود بخود فوراً مؤثر بھی ہو گئی۔

امام نووی نے شرح مسلم میں اس پر صحابہ کرام کا اجماع نقل کیا ہے اور امت کے چاروں ائمہ ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اس پر متفق ہیں بلکہ بہت سے اہل ظاہر اہل حدیث بھی اس میں متفق ہیں جیسے ابن حزم اندلسی اور یہ بات ہر کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں کہ پوری دنیائے اسلام بجز عدد قلیل کے انہیں ائمہ مجتہدین کو قرآنی قانون کی تعبیر میں حجت (اتھارٹی) تسلیم کرتی ہے۔[2]

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ قانون کسی بھی اسلامی فرقہ کی فقہ کے موافق نہیں کیونکہ جو حضرات تین طلاق کو ایک قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک بھی ایک طلاق تو فوراً ہو جاتی ہے، اور اگر تین طلاقوں کو تین طہروں میں متفرق کر کے دیا جائے تو تینوں طلاقیں ہو جاتی ہیں اور وہی حکم ہوتا ہے کہ دوسری شادی اور پھر اس سے جدائی کے بغیر پہلے شوہر سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ موجودہ قانون دووجہ سے ان کی فقہ کے بھی خلاف ہے، کیونکہ ان کے نزدیک تین طلاق سے کم از کم ایک طلاق تو ہو جاتی ہے، مگر یہ قانون اس کو ایک طلاق بھی تسلیم نہیں کرتا، اور اسی طرح تین طہروں میں تین طلاق دینے کی صورت میں بھی بغیر دوسری شادی کے اس کو شوہر اول سے نکاح کی اجازت دیتا ہے۔

عائلی قانون دفعہ 12: کمسن بچوں کی شادی پر پابندی

اس دفعہ کی رو سے کسی لڑکی کا نکاح سولہ سال اور لڑکے کا اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے کرنا جرم قرار دیا گیا ہے۔

[1] ۔سنن أبي داود، کتاب الطلاق، باب نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاث، ج3، ص517، رقم الحديث:2195

[2] ۔النووي، أبوزکریا یحیی بن شرف (ت676ھ-) شرح النووي علی مسلم، الناشر: دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة: الثانية، 1392(10/70)

قرآن وحدیث کا فیصلہ

قرآن کریم کا فیصلہ اس بارہ میں ملاحظہ ہو:

﴿وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُأَشْهُرٍوَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ﴾[1]

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو ماہواری آنے سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان عورتوں کی (عدت) بھی (یہی ہے) جنہیں ابھی ماہواری آئی ہی نہیں''۔

اس آیت میں ان لڑکیوں کی عدتِ طلاق تین ماہ بیان کی گئی ہے جنہیں ابھی تک حیض نہیں آیا، ظاہر ہے کہ عدت کا سوال طلاق کے بعد ہی ہو سکتا ہے، اور جب تک نکاح صحیح نہ ہو طلاق کا کوئی احتمال ہی نہیں، اس لئے اس آیت نے نابالغ لڑکیوں کے نکاح کو واضح طور پر جائز قرار دیا ہے، مگر عائلی قانون سولہ یا اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے نکاح کی اجازت نہیں دیتا، یہ قرآن کریم سے کھلا ہوا تصادم ہے۔

صحیح بخاری سمیت تمام کتب احادیث میں صحیح اسناد کے ساتھ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حضرت عائشہؓ کے ساتھ جب نکاح ہوا تو اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال تھی اور جب رخصتی ہوئی تو 9 سال، مگر عائلی قانون اس عمر کے نکاح کو ناجائز قرار دیتا ہے۔[2]

اسی طرح علامہ ابو بکر جصاص رازی[3] نے احکام القرآن میں محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ کے صاحبزادے سلمہ کا نکاح حضرت حمزہ کی لڑکی سے اس وقت کر دیا تھا، جب کہ یہ دونوں چھوٹے بچے تھے، پھر اتفاق یہ ہوا کہ دونوں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔[4]

کم سنی کے نکاح کے متعلق کیا عمل بہتر ہے؟

صغر سنی کے نکاحوں میں عام طور پر جو خرابیاں دیکھی جاتی ہیں، ان کے پیش نظر اس کی حوصلہ افزائی تو بیشک نہ ہونی چاہئے، ترغیبی صورتیں اس کے انسداد کی اختیار کی جائیں تو بہتر ہے، مگر قانونی پابندی لگا کر قرآن کے حلال کو حرام جرم قرار دینا قرآن کی مخالفت ہے جو کسی طرح گوارا نہیں کی جا سکتی، پھر عائلی قانون نے جو سولہ سال نکاح کی عمر مقرر کی ہے، تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ لڑکی عموماً تیرہ چودہ سال کی عمر میں اور لڑکا چودہ پندرہ سال میں بالغ ہو جاتے ہیں، بلوغ کے بعد بھی دو تین سال تک ان کو نکاح سے قانوناً روکنا بسا اوقات ان کے لئے حرام کا سبب بن

---

[1] ۔الطلاق:4

[2] ۔البخاري، صحيح البخاري(5/56) كتاب مناقب الأنصار، باب تزويج النبي ﷺ عائشة وقدومها المدينة وبنائه بها، رقم الحديث:3896

[3] ۔الإمام، ابو بکر احمد بن علی، رازی، حنفیفقہ حنفیہ کے اکابرین میں شمار ہوتا ہے۔ امام جصاص کی ولادت رے شہر میں ہوئی اسی نسبت سے رازی کہلاتے ہیں ولادت کا سال 305ھ بمطابق 917ء بیس سال کی عمر میں بغداد منتقل ہو گئے۔ امام کرخی کے پاس نیشاپور میں تھے کہ ان کا انتقال ہوا۔(الجصاص، أحمد بن علي الرازي . أحكام القرآن . بيروت: دار إحياء التراث العربي، 1994، ج1، ص5)

[4] ۔الجصاص، أحمد بن علي أبو بكر الحنفي(ت370هـ) أحكام القرآن للجصاص، دار الكتب العلمية بيروت، لبنان، الطبعة: الأولى، 1415هـ-/1994م(2/66)

سکتا ہے، جس کے روکنے کے لئے ہمارے قانون میں کوئی دفعہ نہیں، یہ کس قدر شرمناک معاملہ ہوگا کہ ایک مسلمان لڑکا یا لڑکی زنا کرے تو قانون اس کو کچھ نہ کہے، اور نکاح کرے تو اس پر سزا جاری ہو، بعض اوقات لڑکی یا لڑکے کے اولیاء کوئی خرابی محسوس کر کے اس کا نکاح فوری کر دیناہی ضروری سمجھتے ہیں، اس قانون کی رو سے وہ پابند ہوں گے کہ ان کو حرام کاری میں مبتلا ہوتے ہوئے دیکھتے رہیں نکاح نہ کر سکیں۔

کم سنی کے نکاح کے مفاسد کا شرعی علاج

چوں کہ کم سنی کا نکاح بچوں کے اولیاء کرتے ہیں اس میں احتمال ہے کہ بچوں کی مصلحتوں کی پوری رعایت نہ ہو، اس لئے شریعت اسلام نے اس کا تدارک یہ کر دیا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد ان کو اپنا نکاح فسخ کرانے کا اختیار دے دیا ہے، البتہ باپ دادا کی شفقت بھی اولاد پر غیر معمولی ہوتی ہے اور اولاد کے مصالح کو اولاد سے بھی زیادہ یہ جانتے سمجھتے ہیں، اس لئے باپ دادا کے کئے ہوئے نکاح کو فسخ کرانے کا اختیار عام طور پر نہیں دیا گیا، مگر اس میں بھی اگر کسی موقع میں یہ ثابت ہو جائے کہ باپ یا دادا نے کسی اپنی نفسانی غرض یا لالچ کے سبب اولاد کا نکاح نابالغی میں کر دیا ہے تو قاضی یا مسلم حاکم اس کو بھی فسخ کر سکتا ہے۔اس خیارِ فسخ کی وجہ سے وہ تمام خرابیاں دور ہو سکتی ہیں، جو نکاح صغر سنی میں متصور ہیں۔

دفعہ نمبر13: حقوق تنسیخ نکاح

اس دفعہ کے پیرا دوم الف میں کہا گیا ہے کہ اگر خاوند نے موجودہ عائلی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک اور شادی کر لی ہے، اس کی بیوی کو حق تنسیخ نکاح حاصل ہوگا، نیز پیرا ہفتم میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی لڑکی کے والد یا سرپرست نے اس کی شادی سولہ سال کی عمر سے پہلے کر دی ہے، تو اس لڑکی کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

قرآن وحدیث کا فیصلہ

اس دفعہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے واضعین قانون تعدد ازدواج یا کم سنی کی شادی سے پیدا ہونے والے مظالم ومفاسد کی وجہ سے عورت کو تنسیخ نکاح کا حق نہیں دے رہے بلکہ تعدد ازدواج اور کم سنی کی شادی ان کے نزدیک بذات خود ایک برائی ہے، اسی لئے وہ دوسری شادی کر لینے کے بعد فوراً عورت کو فسخ نکاح کا حق دیتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ اس مرد نے اپنی پہلی بیوی پر ظلم کیا ہے یا نہیں؟ ہم دفعہ 4 اور دفعہ 12 کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ یہ تصور قرآن وسنت سے متصادم ہے۔

پھر اس دفعہ کی رو سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ اگر ایک شخص دوسری شادی کرنے کے بعد اپنی دونوں بیویوں میں انصاف کرتا ہے تو اس صورت میں بھی اس کی پہلی بیوی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ عدالت میں دعویٰ دائر کر کے شوہر سے اپنا رشتہ ازدواج ختم کر لے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اسلامی شریعت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اگر شوہر

عدل سے کام لے تو قرآن کریم دو شادیاں کرنے پر کوئی اخلاقی پابندی بھی عائد نہیں کرتا۔[1]

دفعہ نمبر7: طلاق وعدت کے مسائل

اس دفعہ کا منشاء ان گھریلو جھگڑوں کا انسداد بتلایا جاتا ہے، جو زوجین کے باہمی اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اس دفعہ کی چھ ضمنی دفعات میں سے اکثر ایسی ہیں جن کا خانگی نزاعات سے کوئی تعلق نہیں، ان میں بلاوجہ قرآن وسنت کے مخالف صورتیں تجویز کر کے پورے ملک کے مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی پیدا کی گئی ہے، مثلاً ضمن (3) میں طلاق کے مؤثر ہونے کی آخری میعاد نوے دن مقرر کرنا، جب کہ قرآن کریم نے قبل از خلوت طلاق پر ایک دن کی بھی عدت لازم نہیں کی اور خلوت کے بعد عدت طلاق واضح طور پر تین ایام ماہواری مقرر فرمائی:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾ [2]

"یعنی مطلقہ عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین مرتبہ ایام ماہواری پورے ہونے تک"۔

ہر شخص جانتا ہے کہ تین ماہواری کبھی نوے دن سے کم میں بھی پورے ہو سکتی ہیں اور کبھی اس سے زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں ہمارے قانون ساز حضرات نے خانگی نزاعات ختم کرنے کے لئے اس میں کون سی مصلحت سمجھی ہے کہ قرآن کی نص صریح کے مخالف نوے دن مقرر کر دیئے اسی طرح ضمن (۵) میں حاملہ کی عدت جو مدت حمل یا نوے دن میں سے جو زائد ہو، اس کو قانونی عدت قرار دیا ہے، جب کہ قرآن کریم کا واضح فیصلہ یہ ہے کہ حمل سے فراغت ہوتے ہی عدت ختم ہو جاتی ہے، چاہے وہ ایک گھنٹہ کے بعد ہی ہو جائے:

﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [3]

"اور حمل والیوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل سے فارغ ہو جائیں"۔

---

[1] ۔ النساء 3:4

[2] ۔ البقرۃ: 228

[3] ۔ الطلاق: 4

فصل سوم

عائلی مسائل سے متعلق بنیادی شرعی احکام

عائلی مسائل انسانی زندگی کے وہ اہم پہلو ہیں جو خاندان اور ازدواجی تعلقات کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسلام نے ان معاملات کو خاص اہمیت دی ہے، تاکہ خاندان مضبوط اور معاشرہ منظم ہو۔ قرآن و سنت نے ان مسائل کے لیے واضح رہنمائی فراہم کی ہے، تاکہ مسلمانوں کی زندگی عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ جدید دور میں آن لائن نکاح، تین طلاق، نشے کی حالت میں طلاق، تفویض طلاق، اور مفقود الخبر کی بیوی کے نکاح جیسے مسائل نئے چیلنجز کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اس فصل میں ان مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے اور انہیں شرعی اصولوں کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

آن لائن نکاح کا حکم

قرآن و سنت میں نکاح کی ترغیب دی گئی ہے۔ نکاح محض ایک معاشرتی عمل نہیں ہے، بلکہ یہ عظیم عبادت بھی ہے اور اسکا حلال اور حرام کیساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ نکاح میں چونکہ حلال اور حرام کا پہلو بھی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح کے انعقاد میں احتیاط سے کام لیا جائے، لہٰذا نکاح کا بہتر اور مروج طریقہ یہ ہے کہ اسکا انعقاد مواصلات کے جدید ذرائع کے بغیر براہِ راست یا وکیل کے ذریعے کیا جائے، کیونکہ اس میں شرعی اور ملکی قوانین کے لحاظ سے پیچیدگی نہیں ہے۔

نیز یہ طریقہ بہتر انداز میں میاں بیوی اور ان کے خاندانوں کے درمیان باہم تعارف اور دیرپا تعلقات کا ذریعہ ہونے کے ساتھ احتیاط پر بھی مبنی ہے، لہٰذا حتی الامکان نکاح کے انعقاد میں یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے، تاہم اگر براہِ راست یا بذریعۂ وکیل نکاح کرنے کے بجائے آن لائن نکاح کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کی بنیادی طور پر درج ذیل دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

آن لائن نکاح کی بنیادی صورتیں

1۔ آن لائن تحریری نکاح

2۔ براہِ راست / زبانی یا بالمشافہہ آن لائن نکاح

1۔ آن لائن تحریری نکاح

آن لائن تحریری نکاح کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ اسکائپ، ای میل اور واٹس ایپ وغیرہ کے ذریعے فریقین میں سے ایک فریق کی طرف سے تحریری ایجاب دوسرے فریق کو موصول ہو جائے تو وہ گواہوں کے سامنے اُسے پڑھے۔ جب گواہ ای میل وغیرہ میں مذکور ایجاب اچھی طرح سن لیں تو ان کی موجودگی میں ہی نکاح قبول کر لیا

جائے اور اس نکاح کی اطلاع کسی بھی ذریعے سے دوسرے فریق کو کر دی جائے۔

ای میل وغیرہ کے ذریعے نکاح کی مذکورہ بالا صورت تو قدیم کتب میں مذکور نہیں ہے، البتہ اس مسئلے کو نکاح بالکتابۃ یعنی بذریعہ تحریر نکاح کے مسئلے کے تحت حل کیا جاسکتا ہے، اس لیے ذیل میں نکاح بالکتابۃ کا حکم ذکر کیا جاتا ہے:

نکاح بالکتابۃ کا حکم

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ گونگے کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد ہو جاتا ہے، جیسا کہ علامہ شربینیؒ نے لکھا ہے:

(("ينعقد نكاح الأخرس بالكتابة بلا خلاف))۔[1]

(اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ گونگے آدمی کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد ہو جاتا ہے۔)

لیکن تندرست اور بولنے کی صلاحیت کے حامل شخص کے لیے نکاح بالکتابۃ کا کیا حکم ہے؟ یعنی بذریعۂ تحریر نکاح کرنے سے اس کا نکاح منعقد ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اس میں علمائے کرام کی آرا مختلف ہیں:

احناف کا مؤقف

احناف کے نزدیک اگر زوجین آمنے سامنے ہوں تو تحریری نکاح کرنے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا جیسے فتاوی عالمگیری میں ہے:

((ولا ينعقد بالكتابة من الحاضرين فلو كتب تزوجتك فكتبت قبلت؛ لم ينعقد هكذا))۔[2]

(مجلس میں موجود لوگوں کا کتابت کے ذریعے نکاح منعقد نہیں ہوتا، لہٰذا اگر کسی نے یہ لکھا کہ میں نے آپ سے نکاح کیا اور اس کے جواب میں لڑکی نے یہ لکھ دیا کہ میں نے قبول کر لیا تو اس سے نکاح منعقد نہیں ہو گا۔ اسی طرح النہر الفائق میں ہے۔

تاہم اگر زوجین حاضرِ مجلس نہ ہوں تو بذریعۂ تحریر نکاح کرنے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے، جیسا کہ بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع میں ہے:

((وينعقد بالكتابة؛ لأن الكتاب من الغائب خطابه))۔[3]

(کتابت یعنی تحریری صورت میں بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے، کیونکہ غیر موجود آدمی کی طرف سے تحریر اس کی جانب سے خطاب کرنے کی طرح ہے۔)

مالکیہ کا مؤقف

مالکیہ کے نزدیک نکاح کے انعقاد کے لیے تلفظ شرط ہے، لہٰذا تلفظ کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا، چنانچہ منح

---

[1]۔ الشربيني، شمس الدين، محمد بن أحمد، مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج (بيروت، دار الكتب العلمية 1415ھ-1994م)، 4/230۔

[2]۔ لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي، الفتاوى الهندية (بيروت، دار الفكر، 1310ھ-) 1/270۔

[3]۔ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع (بيروت، دار الكتب العلمية 1406ھ-1986م)، 2/231۔

الجلیل شرح مختصر خلیل میں ہے:

((ویشترط اللفظ من القادر علیه))۔[1]

(قدرت رکھنے والے شخص کے لیے لفظ کی ادائیگی شرط ہے۔)

اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ علامہ دردیر رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح کے ارکان بیان کرتے ہوئے ایجاب اور قبول کے ضمن میں لکھا ہے:

((ولا تكفي الإشارة ولا الكتابة إلا لضرورة خرس))۔[2]

(گونگے پن کی ضرورت کے علاوہ اشارہ اور کتابت کافی نہیں ہے۔)

شافعیہ کا مؤقف

شافعیہ کے نزدیک بذریعۂ تحریر نکاح کرنے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا، چنانچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((إذاكتب بالنكاح إلى غائب أوحاضر،لم يصح. وقيل:يصح في الغائب وليس بشيء،لأنه كناية،ولاينعقد بالكنايات))۔[3]

(جب کوئی نکاح کی تحریر موجود یا غیر موجود کی طرف بھیج دے تو ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ غائب اور غیر موجود کے حق میں درست ہے، لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ تحریری نکاح دراصل کنایہ ہے اور نکاح کنایات یعنی غیر واضح اور ابہام پر مبنی طریقوں سے انعقاد پذیر نہیں ہوتا۔)

حنابلہ کا مؤقف

علمائے حنابلہ کے راجح قول کے مطابق بھی بولنے کی صلاحیت کے حامل شخص کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد نہیں ہوتا، جیسا کہ الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف میں ہے:

((وأماالكتابةفي حق القادرعلى النطق:فلاينعقدبهاالنكاح مطلقا.على الصحيح من المذهب)) [4]

(رہا معاملہ بولنے کی صلاحیت کے حامل افراد کے حق میں کتابت کا تو صحیح مذہب کے مطابق عمومی اطلاق کے ساتھ بذریعۂ تحریر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔)

فقہ جعفریہ

فقہ جعفریہ کے مطابق بھی بولنے کی صلاحیت کے حامل شخص کا نکاح کتابت کے ذریعے منعقد نہیں ہوتا، چنانچہ تحریر الوسیلۃ میں ہے:"

---

[1]۔ علیش، محمد بن أحمد بن محمد (م:1299ھ)، منح الجلیل شرح مختصر خلیل (بیروت، دار الفکر 1409ھ/1989م)، 3/267۔

[2]۔ الدردیر، أحمد بن محمد بن أحمد العدوي، الشرح الصغیر مع حاشیۃ الصاوي (القاھرۃ، دار المعارف)، 2/350۔

[3]۔ النووي، أبو زکریا محیي الدین یحیی بن شرف، روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین (دمشق، المکتب الإسلامي، 1412ھ/1991م)، 7/37۔

[4]۔ المرداوي، علاء الدین أبو الحسن علي بن سلیمان الإنصاف في معرفۃ الراجح من الخلاف (بیروت، دار إحیاء التراث العربي)، 8/50۔

((ولا الكتابة وكذا الإشارة المفهمة في غير الأخرس)).[1]

"اور نہ ہی کتابت کافی ہے، اسی طرح جو بولنے کی صلاحیت کا حامل ہے وہ سمجھ آنے والے اشارے پر بھی اکتفا نہیں کر سکتا۔"

مذکورہ بالا حوالہ جات سے درج ذیل امور ثابت ہوئے:

1۔ گونگے کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد ہو جاتا ہے۔

2۔مالکیہ ،شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک بولنے کی صلاحیت کے حامل شخص کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد نہیں ہوتا۔

3۔احناف کے نزدیک مجلس میں موجودآدمی کا نکاح بذریعۂ تحریرمنعقد نہیں ہوتا،البتہ غائب اور غیر حاضر شخص کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد ہو جاتا ہے۔

راجح قول

علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق خود جناب نبی کریم ﷺ کا نکاح حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تحریری صورت میں ہی ہوا تھا، نیز نکاح بھی ایک عقد ہے اور دیگر عقود کتابت سے منعقد ہو جاتے ہیں، اس لیے نکاح بھی کتابت سے منعقد ہونا چاہیے۔اس سلسلے میں علمائے احناف کا مؤقف راجح معلوم ہوتا ہے،[2] جس کے مطابق غیر موجود اور مجلس سے غیر حاضر شخص کا اسکائپ، ای میل اور واٹس ایپ وغیرہ کے ذریعہ تحریری نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح

زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح سے مراد یہ ہے کہ زوجین گواہوں کی موجودگی میں دو مختلف جگہوں سے آڈیو یا ویڈیو کال کے ذریعے براہِ راست خود یا اپنے وکیل کے ذریعے ایجاب اور قبول کر کے نکاح کر لیں۔اس مفہوم کے لحاظ سے آن لائن نکاح کے لیے ایجاب اور قبول دو مختلف مقامات سے ہو رہے ہوتے ہیں۔

زبانی / بالمشافہہ بذریعہ کال نکاح کا حکم

زبانی / بالمشافہہ بذریعہ کال نکاح کے حکم کے بارے میں معاصر علمائے کرام کی دو قسم کی آرا سامنے آئی ہیں:

پہلی رائے

برصغیر پاک وہند کے اکثر اہلِ علم وافتاء کی رائے کے مطابق زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح کرنے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

---

[1]۔خميني، روح الله موسوي، تحرير الوسيلة، ترجمہ اردو: مترجم ندارد، (موسسة تنظيم ونشر آثار امام خميني، 1413ھ، ج3، ص428

[2]۔السرخسي، شمس الأئمة، محمد بن أحمد، المبسوط للسرخسي، بيروت، دار المعرفة، 1414ھ–1993، ج5، ص15

دوسری رائے

بعض افتاء کے مراکز جیسے دارالافتاء خیر المدارس ملتان، دارالافتاء جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک اور بعض اہلِ علم جن میں جامعہ عثمانیہ پشاور کے مفتی ذاکر حسن نعمانی بھی شامل ہیں، کی رائے یہ ہے کہ براہِ راست زبانی یا بالمشافہہ آن لائن نکاح کرنے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

مانعین کے دلائل

جو حضرات زبانی یا بالمشافہہ آن لائن نکاح کے قائل نہیں ہیں، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

1۔ نکاح کے انعقاد کے لیے ایجاب اور قبول کا ایک ہی مجلس میں ہونا ضروری ہے، جیسا کہ بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع میں ہے:"

((وأما الذي يرجع إلى مكان العقد فهو إتحاد المجلس إذا كان العاقدان حاضرين وهو أن يكون الإيجاب والقبول في مجلس واحد حتى لو اختلف المجلس لا ينعقد النكاح))۔[1]

(رہی نکاح کی وہ شرائط جن کا تعلق عقد کی جگہ سے ہے تو وہ مجلس کا ایک ہونا ہے، بشرطیکہ عقد کرنے والے فریقین حاضرِ مجلس ہوں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایجاب اور قبول ایک ہی مجلس میں ہو، لہٰذا اگر مجلس مختلف ہو گئی تو نکاح منعقد نہیں ہو گا۔)

براہِ راست زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح کی صورت میں فریقین دو الگ الگ جگہوں میں ہوتے ہیں، اس لیے اس نکاح میں اتحادِ مجلس نہیں پائی جاتی، لہٰذا براہِ راست زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح اتحادِ مجلس یا مجلس متحد نہ ہونے کی وجہ سے منعقد نہیں ہوتا۔

2۔ نکاح کے لیے گواہوں کا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ در مختار میں ہے:"

(و) شرط(حضور)شاهدين(حرين)أوحروحرتين (مكلفين سامعين قولهما معا)۔[2]

(دو آزاد مکلف یا ایک آزاد مرد اور دو آزاد عورتوں کا بطورِ گواہ ہونا ضروری ہے، جو ایک ساتھ زوجین کا کلام سن سکیں)

3۔ براہِ راست زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح کی مجلس میں گواہ نہیں ہوتے، اس لیے براہِ راست زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

4۔ تحملِ شہادت کے لیے گواہوں کا خود دیکھ کر گواہی دینا ضروری ہے، جیسا کہ علامہ کاسانی[3]رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[1]۔ بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع، ج2، 332۔

[2]۔ الدر المختار مع رد المحتار، ج3، ص21۔

[3]۔ علاؤ الدین الکاسانی ابو بکر بن مسعود جو صاحب البدائع اور ملک العلماء کے لقب سے ملقب ہیں۔ ابو بکر بن مسعود بن احمد بن علاؤ الدین ملک العلماء الکاسانی صاحب البدائع شارح تحفۃ الفقہا ہیں۔ الکاسانی کی وفات 587ھ میں ہوئی حلب کے قبرستان ظاہریہ میں مقام ابراہیم خلیل اللہ میں اپنی بیوی

((والثالث:أن يكون التحمل بمعاينةالمشهودبه بنفسه لابغيره))۔[1]

(تیسری شرط یہ ہے کہ جس چیز کی گواہی دینی ہے، اسے دوسرے کے بجائے باقاعدہ خود دیکھ کر تحملِ شہادت کرنا۔)

براہِ راست زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح میں زوجین کو کیمرے کی آنکھ کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے، لیکن انہیں براہِ راست نہیں دیکھا جاسکتا، اس لیے آن لائن نکاح میں گواہ بنناہی درست نہیں ہے اور گواہوں کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

5۔احناف کی تصریح کے مطابق اندھے کی گواہی معتبر نہیں ہے، اسکی وجہ یہی ہے کہ بینائی سے محروم شخص کانوں سے سن کر ہی گواہی دے سکتا ہے، جبکہ آوازیں ایک دوسرے کے مشابہ بھی ہوسکتی ہیں، لہٰذا آوازوں کے درمیان امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے بینائی سے محروم شخص کا گواہ بننا درست نہیں ہے، جیسا کہ قدوری کی مشہور شرح "لباب" میں ہے:

((ولاتقبل شهادةالأعمى)؛لأن الأداءيفتقر إلى التمييز بالإشارة بين المشهودله والمشهود عليه،و لايميزالأعمى إلابالنغمة،و النغمة تشبه النغمة))۔[2]

"بینائی سے محروم شخص کی گواہی معتبر نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے حق میں اور جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہے، انکے مابین فرق کرنے کیلئے اشارہ کرنا ناگزیر ہے، جب کہ بینائی سے محروم شخص آواز ہی کے ذریعے اس کی پہچان کر سکتا ہے، حالانکہ ایک آواز دوسری آواز کے مشابہ ہوسکتی ہے۔"

براہِ راست زبانی / بالمشافہہ آن لائن نکاح کی صورت میں زوجین کو براہِ راست دیکھے بغیر ان کی آواز سن کر گواہی دی جاتی ہے۔جب بینائی سے محروم شخص کی گواہی درست نہیں تو اس پر قیاس کرتے ہوئے آن لائن نکاح میں گواہ بننے والے کی گواہی بھی درست نہیں ہے۔

مانعین کے دلائل کا جواب

1۔بلاشبہ نکاح کے انعقاد کے لیے اتحادِ مجلس یعنی نکاح کی مجلس کا ایک ہونا ضروری ہے، لیکن مجلس کی باقاعدہ کوئی جامع مانع تعریف اکثر و بیشتر کتابوں میں نہیں ملتی۔غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مجلسِ عقد کا مفہوم اس قدر معروف تھا کہ اس کی جامع مانع تعریف ذکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

فاطمہ کے پاس مدفون ہوئے۔(ابن خلکان، احمد بن محمد بن ابی بکر۔ وفیات الأعیان وأنباء أبناء الزمان ۔ تحقیق:احسان عباس۔بیروت: دار صادر، 1994، ج3، ص318)

[1]۔بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع، ج2، ص266۔

[2]-عبد الغني بن طالب بن حمادة(م:1298ھ)، اللباب في شرح الكتاب، (بیروت: المكتبة العلمية)، 4/60۔

مجلسِ عقد کا مفہوم

المجلة الأحكام العدلية میں مجلسِ عقد کی تعریف کی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی انجام دہی کے لیے منعقد کیا جانے والا اجتماع مجلسِ عقد کہلاتا ہے۔[1]

اسی طرح کی تعریف الفقه الإسلامي وأدلته میں کی گئی ہے:

((ومجلس العقد:هوالحال التي يكون فيها المتعاقدان مشتغلين فيه بالتعاقد. وبعبارة أخرى: إتحاد الكلام في موضوع التعاقد))[2]

(مجلسِ عقد سے مراد وہ حالت ہے کہ جس میں فریقین عقد کے حوالے سے مشغول ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں معاملے کے حوالے سے باہم گفتگو میں یکسانیت کا نام مجلسِ عقد ہے۔)

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلسِ عقد، عقد اور معاملہ کے بارے میں کی جانے والی باہم گفتگو میں یکسانیت اور اتحاد کا نام ہے، لہٰذا مجلس کو مکان کے ساتھ محدود کرنا درست نہیں ہے۔

فقہائے کرام کے نزدیک ایجاب اور قبول کی مجلس کا ایک ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتحادِ مجلس سے مراد کیا ہے؟

اتحادِ مجلس کا مفہوم

اتحادِ مجلس سے مراد فریقین کے درمیان ہونے والے ایجاب اور قبول میں اتحاد ہے۔ یہاں فریقین کی جگہ اور بیٹھک کا اتحاد مراد نہیں ہے، جیسا کہ البحر الرائق میں ہے:

((المجلس المتحد أن لا يشتغل أحد المتعاقدين بعمل غير ما عقد له المجلس أو ما هو دليل الإعراض عن العقد))۔[3]

(مجلس جس کے لیے منعقد کی گئی، عقد اور معاملہ کرنے والے فریقین اس کے علاوہ کسی دوسرے عمل میں مصروف نہ ہوں یا ان کی طرف سے اعراض پر مبنی کوئی سرگرمی اختیار نہ کرنے کو اتحادِ مجلس کہتے ہیں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اتحادِ مجلس سے مراد مکان اور جگہ کا ایک ہونا نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ایجاب اور قبول کے مابین یکسانیت ہے، یعنی ایجاب اور قبول میں یکسانیت کے پائے جانے سے اتحادِ مجلس وجود میں آجاتی ہے۔ اس تفصیل کے مطابق آن لائن نکاح کی صورت میں بھی ایجاب اور قبول میں یکسانیت پائی جائے تو اتحادِ مجلس کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔

جس طرح نکاح میں اتحادِ مجلس ضروری ہے، اسی طرح خرید و فروخت میں بھی اتحادِ مجلس ضروری ہے اور معاصر علمائے کرام کے نزدیک آن لائن خریداری جائز ہے، جیسا کہ مجمع الفقه الإسلامي الدولي کی قرارداد میں ہے:

---

[1]۔لجنة مكونة من عدة علماء وفقهاء في الخلافة العثمانية، مجلة الأحكام العدلية، (كراتشي: نور محمد كارخانه)، 1/ 38۔

[307]۔الزحيلي، د. وهبة، الفقه الإسلامي وأدلته، (دمشق، دار الفكر)، ج4، ص458۔

[3]ابن نجيم، زين الدين بن إبراهيم بن محمد (م:970ھ)، البحر الرائق، (بيروت، دار الكتاب الاسلامي)، 5/ 293۔

((إذاتم التعاقدبين طرفين في وقت واحدوهمافي مكانين متباعدين ، وينطبق هذا على الهاتف واللاسلكي،فإن التعاقد بينهمايعتبرتعاقدًابين حاضرين وتطبق على هذه الحالة الأحكام الأصلية المقررة لدى الفقهاء))۔[1]

(جب دو آدمی ایک دوسرے سے دور مختلف مقامات پر ہوں اور وہ ایک ہی وقت میں معاملہ کر لیں۔ ٹیلی فون اور وائرلیس پر اسی کو منطبق کیا جائے گا، کیونکہ ان دونوں کے درمیان ہونے والا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کہ دو پاس بیٹھے آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے اور اس صورتِ حال پر فقہائے کرام کے ہاں طے شدہ بنیادی احکام ہی کا انطباق کیا جائے گا۔)

جب خرید و فروخت کے معاملات آن لائن کرنے میں اتحادِ مجلس کی شرط پوری ہو جاتی ہے تو آن لائن نکاح کی صورت میں بھی اتحادِ مجلس کی شرط پوری ہو جائے گی، لہٰذا اتحادِ مجلس کو بنیاد بنا کر براہِ راست یا بالمشافہہ آن لائن نکاح کو ناجائز کہنے کی زیادہ مضبوط دلیل نہیں ہے۔

2۔ جہاں تک گواہ کی عدم موجودگی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ماقبل ذکر کردہ تفصیل سے جب یہ بات واضح ہوئی کہ آن لائن نکاح کی صورت میں اتحادِ مجلس کی شرط کو پورا کیا جاسکتا ہے تو آن لائن نکاح کی مجلس میں گواہ بھی بنائے جاسکتے ہیں، لہٰذا آن لائن نکاح میں گواہوں کی عدم موجودگی والا اعتراض بھی باقی نہیں رہتا۔

3۔ جہاں تک شہادت کے لیے تحملِ شہادت کی بات ہے تو فقہائے کرام کی عبارات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحملِ شہادت کے لیے اصل چیز یقینی علم ہے، البتہ عموماً جس چیز کو کھلی آنکھوں دیکھ لیا جائے تو اس سے یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے عبارات میں تحملِ شہادت کے لیے گواہوں کی بذاتِ خود موجودگی اور گواہوں کا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گواہی دینے کا ذکر ملتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ فقہائے کرام نے بہت سی ایسی صورتیں ذکر فرمائی ہیں کہ جن میں دیکھے بغیر یقینی علم حاصل ہونے کی گواہی کو درست تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر گواہوں کے لیے آنکھوں سے دیکھ کر ہی یقینی علم حاصل کرنا ضروری ہوتا تو فقہائے کرام وہ تمام صورتیں ذکر نہ فرماتے کہ جن میں آنکھوں سے دیکھے بغیر یقینی علم حاصل ہونے کی وجہ سے گواہی کو درست تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ دیکھے بغیر یقینی علم حاصل ہونے پر گواہی معتبر ہونے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں:

1-((رجل قال لقوم:اشهدواأني تزوجت هذه المرأةالتي في هذا البيت فقالت المرأة:قبلت، فسمع الشهودمقالتهاولم يروا شخصـــها،فإن كانت في البيت وحدهاجاز النكاح؛ لأنه لاجهالة و إن كانت معها في البيت أخرى لم يجز؛ لأن الجهالة ممكنة))۔[2]

(ایک آدمی نے لوگوں سے کہا کہ آپ سب گواہ رہو کہ میں نے اس گھر میں موجود لڑکی سے نکاح کیا۔ اس کے جواب میں عورت نے کہا کہ میں نے قبول کیا۔ عورت کو دیکھے بغیر گواہوں نے اس کا جواب سن لیا تو اگر گھر

---

[1]۔ قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي الدولي، (مكة المكرمة، منظمة مجمع الفقه الإسلامي الدولي الإصدار، الرابع 2021ء، ص:168۔

[2]۔ برهان الدين، محمود بن أحمد (م:616ھ)، المحيط البرهاني في الفقه النعماني، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1424ھ–2004م)، 3/29۔

میں وہ تنہا ہو تو نکاح درست ہے، اس لیے کہ یہاں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے اور اگر گھر میں اس کے ساتھ کوئی دوسری عورت بھی ہو تو یہ نکاح درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں جہالت اور ابہام پایا جاتا ہے۔)

2۔((ولوسمع من وراءالحجاب لايسعه أن يشهدلإحتمال أن يكون غيره إذاالنغمةتشبه النغمةإلاإذاكان في الداخل وحده و علم الشاهد أنه ليس فيها غيره))۔[1]

(اگر کسی نے پردے کے پیچھے سے آواز سنی تو اس کیلئے گواہی دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور ہو، نیز ایک آواز دوسری آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے، البتہ اگر (کمرے میں) داخل ہونے والا ایک ہی ہو اور گواہ کو اس کا یقینی علم ہو کہ گھر میں اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے (تو گواہی دینا درست ہے۔))

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ گواہی دینے کے لیے آنکھوں کا مشاہدہ ہر حال میں ضروری نہیں ہے، بلکہ گواہی میں اصل چیز یقینی علم ہے۔ وہ کسی بھی طرح حاصل ہو جائے تو اس واقعہ کی گواہی دینا درست ہے، لہٰذا آن لائن نکاح کی صورت میں بھی اگر خارجی قرائن پائے جائیں، مثلاً مجلسِ نکاح میں کسی قابلِ اعتبار آدمی سے مضبوط رابطہ ہو، اس کے ذریعے تمام ضروری امور معلوم کر لیے جائیں یا کسی اور ذریعے سے نکاح کا یقینی علم ہو جائے تو اس صورت میں گواہی دینا درست ہے، بالخصوص ویڈیو کال کے ساتھ قرائنِ قطعیہ پائے جائیں تو گواہوں کے لیے گواہی دینے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

3۔ آن لائن نکاح میں بننے والے گواہوں کی نوعیت بظاہر روبرو اور مشاہد طریقے سے بننے والے گواہوں سے مختلف ہے، کیونکہ آن لائن نکاح میں گواہ اسکرین پر دیکھنے کے ساتھ آواز سن کر یا صرف آواز سن کر ہی گواہی دیتے ہیں۔ فقہِ اسلامی کی قدیم کتابوں میں اس سے قریب قریب ذکر کردہ صورت بینائی سے محروم شخص کی گواہی کی ہے، لہٰذا نکاح میں بینائی سے محروم شخص کی گواہی کا حکم ذکر کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

نکاح میں نابینا شخص کی گواہی کا حکم

نکاح میں نابینا شخص کی گواہی کے معتبر ہونے یا نہ ہونے میں فقہائے کرام کی آرا مختلف ہیں:

احناف کا مؤقف

احناف کے نزدیک نکاح میں بینائی سے محروم شخص کی گواہی درست ہے، لہٰذا اگر نکاح کے دونوں گواہ نابینا ہوں، تب بھی نکاح منعقد ہو جائے گا۔ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

((ينعقد بشهادة الأعميين بالإتفاق))۔[2]

(اس بات پر اتفاق ہے کہ دو بینائی سے محروم آدمیوں کی گواہی سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔)

---

[1]۔ الزيلعي، عثمان بن علي (م: 743ھ)، تبيين الحقائق شرح كنزالدقائق، (القاهرة المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، 1313ھ) (4/213)۔

[2]۔ محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (ت ۴۸۳ھ)، السرخسي، المبسوط للسرخسي، الناشر: مطبعة السعادة– مصر وصوّر تها: دار المعرفة- بيروت، لبنان ج5، ص32

مالکیہ کا مؤقف

مالکیہ کے نزدیک نکاح میں بینائی سے محروم شخص کی گواہی معتبر ہے، چنانچہ علامہ قرافی[1] لکھتے ہیں:

((تجوز شهادة الأعمى في الأقوال)) [2]

(اقوال میں بینائی سے محروم آدمی کی گواہی درست ہے۔)

فقہ مالکی کی مشہور کتاب إرشاد السالک میں ہے:"

((ويقبل من الأعمى فيما لا يشتبه عليه من الأقوال))۔ [3]

(وہ معاملات جن کا تعلق اقوال کے ساتھ ہے اور ان میں نابینا کو غلطی لگنے کا اندیشہ نہ ہو تو بینائی سے محروم شخص کی گواہی مقبول ہو گی۔)

شافعیہ کا مؤقف

شافعیہ کے راجح قول کے مطابق نکاح میں بینائی سے محروم شخص کی گواہی معتبر نہیں ہے، چنانچہ فتح المعین بشرح قرة العين بمهمات الدين میں ہے:

((ومن لازمها الإسلام والتكليف وسمع ونطق وبصر۔ لما يأتي أن الأقوال لا تثبت إلا بالمعاينة والسماع وفي الأعمى وجه لأنه أهل للشهادة في الجملة الأصح لا وإن عرف الزوجين))۔[4]

(شہادت کے لیے مسلمان ہونا، مکلف ہونا، سننا، بولنا اور دیکھنا ضروری ہے۔ یہ بات آگے ذکر کی جائے گی کہ اقوال کو معائنے اور سنے بغیر ثابت نہیں کیا جاسکتا، البتہ بینائی سے محروم شخص (کی گواہی) کے بارے میں (ایک) نقطۂ نظر الگ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ نابینا آدمی فی الجملہ گواہی دینے کی صلاحیت کا حامل ہے، لیکن صحیح ترین قول کے مطابق اس کی گواہی معتبر نہیں ہے، اگرچہ وہ زوجین کو ذاتی طور پر جانتا ہو۔)

حنابلہ کا مؤقف

حنابلہ کے نزدیک نابینا شخص نکاح میں گواہ بن سکتا ہے، جیسا کہ النكت والفوائد السنية على مشكل المحرر میں ہے:

((يجوز للأعمى تحمل الشهادةفيماطريقه الصوت كالنسب و الموت والملك المطلق والوقف والعتق والولاء وسائر العقود كالنكاح والبيع والصلح والإجارة والإقرار))۔[5]

---

[1] ۔ محمد بن یحیٰ بن عمر (بن احمد بن یونس بن عبد الرحمٰن، آپ بدر الدین قرافی کے نام سے مشہور تھے۔ مصری مالکی، مصر کے قاضی اور اپنے وقت کے بڑے مالکی علماء میں سے تھے۔ انہوں نے تقریباً پچاس سال قاہرہ میں جج کی حیثیت سے خدمات انجام دیں (ابن حجر، احمد بن علی۔ الدرر الكامنة في أعيان المئة الثامنة .بیروت: دار الجیل، 1993، ج4، ص306۔)

[2] ۔ القرافي، أبو العباس شهاب الدين أحمد بن إدريس (م:684ھ-)، الذخيرة، بیروت، دار الغرب الإسلامي، 1994م)، 10/164۔

[3] ۔ شهاب الدين، عبد الرحمن بن محمد (م:732ھ-)، إرشاد السالك إلى أشرف المسالك في فقه الإمام مالك، (القاهرة، مكتبة مصطفى البابي الحلبي وأولاده) ص: 120۔

[4] ۔ زين الدين، أحمد بن عبد العزيز (م:987ھ-)، فتح المعين بشرح قرة العين بمهمات الدين، (الرياض، دار ابن حزم) ص:461۔

[5] ۔ ابن مفلح، إبراهيم بن محمد (م:884ھ-) النكت والفوائد السنية على مشكل المحرر، (الرياض، مكتبة المعارف، 1404ھ-) 2/288۔

(وہ امور جن کا تعلق آواز کے ساتھ ہے، مثلاً نسب، موت، مطلق ملکیت، وقف، آزادی، ولاء اور تمام عقود جیسے کہ نکاح، خرید و فروخت، صلح، کرایہ داری اور اقرار وغیرہ ہیں تو ان میں بینائی سے محروم شخص تحملِ شہادت جائز ہے۔)

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ جمہور فقہائے کرام کے نزدیک نکاح میں بینائی سے محروم شخص آواز پہچان کر گواہ بن سکتا ہے۔ جب بینائی سے محروم شخص کو غلطی لگنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی گواہی محض آواز کی بنیاد پر معتبر ہے تو آن لائن نکاح ــ جس میں عموماً آواز کے ساتھ تصویر بھی ہوتی ہے ــ میں گواہی بطریقِ اولیٰ معتبر ہونی چاہیے۔

النغمة تشبه النغمة کا اشکال

اب تک کی تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ بینائی سے محروم شخص آواز پہچان کر نکاح میں گواہ بن سکتا ہے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فقہائے کرام نے فرمایا: "النغمة تشبه النغمة" یعنی ایک آواز دوسری آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے، لہٰذا بینائی سے محروم شخص کی گواہی میں غلطی کا امکان ہے۔ جب اس کی گواہی میں غلطی کا امکان ہے تو اس کے لیے گواہ بننا بھی درست نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نابینا کی گواہی اسی صورت میں معتبر ہوگی کہ جب وہ زوجین کی آواز پہچانتا ہو، لیکن جہاں وہ زوجین کی آواز اچھی طرح پہچان نہ سکے اور اسے غلطی لگنے کا امکان ہو تو وہاں وہ گواہ بھی نہیں بن سکتا۔

اسی طرح آن لائن نکاح کی صورت میں بھی اگر گواہ زوجین کو پہلے سے جانتے ہیں یا زوجین کو جانتے نہیں، لیکن انہیں کسی دوسرے ذریعے سے یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے تو ان کے لیے گواہ بننا درست ہے، لہٰذا آن لائن نکاح میں گواہ کے موجود نہ ہونے یا آواز میں مشابہت پائے جانے والی بات بھی زیادہ وزن نہیں رکھتی، اس لیے آن لائن نکاح منعقد ہونا چاہیے۔

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ حنفی فقہائے کرام کے نزدیک اگر زوجین حاضرِ مجلس نہ ہوں تو بذریعۂ تحریر نکاح کرنے سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے، حالانکہ جس طرح ایک آواز دوسری آواز کے مشابہ ہو سکتی ہے، اسی طرح کسی آدمی کی لکھائی سے دوسرے آدمی کی لکھائی بھی مشابہ ہو سکتی ہے۔ فقہائے کرام نے مختلف ابواب میں اس خدشے کا اظہار بھی کیا ہے،[1] اور یہ بات مشاہدے میں بھی آئی ہے کہ کچھ لوگوں کی لکھائی دوسرے لوگوں سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہوتی ہے، تو جو تاویل، جواب یا احتیاط بذریعۂ تحریر نکاح میں برتی جاتی ہے، وہی تاویل، جواب یا احتیاط آواز کی صورت میں برتنے سے معاملہ حل ہو سکتا ہے۔

آن لائن نکاح کے بارے پاکستان کے کچھ علماء کے فتاویٰ

پاکستان کے بھی کچھ علماء آن لائن نکاح کے جواز کے قائل ہیں، جیسا کہ فتاویٰ حقانیہ میں ہے: "آج کل

[1] ۔المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين، علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني، الهداية في شرح بداية المبتدي، (بيروت، دار احياء التراث العربي)، 1/104۔

موبائل کئی قسم کے ملتے ہیں مثلاً

1۔ وہ فون جس سے صرف ایک آدمی آواز سن سکتا ہے۔

2۔ وہ ٹچ فون جن کے ذریعے بات کرنے والے ایک دوسرے کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

3۔ وہ فون جن کے ذریعے بات چیت کرنے والوں کی آواز حاضرینِ مجلس بھی سن سکتے ہیں۔ اول الذکر میں نکاح منعقد نہ ہو گا، اس لیے کہ گواہوں کے لیے ایجاب وقبول کا ایک ساتھ سننا ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں ہے اور اخیرین میں چونکہ شہادت کے تمام تقاضے پورے ہو سکتے ہیں، لہٰذا نکاح درست ہے۔[1]

خیر الفتاوی میں ہے: "در اصل فون دو طرح کے ہیں ایک وہ کہ اس کی آواز صرف وہی شخص سن سکتا ہے جس نے فون اٹھایا ہوا ہو۔ دوسرا فون وہ ہے جس کی آواز سب حاضرین کو سنائی دیتی ہے۔ پہلی قسم کے فون پر نکاح منعقد نہ ہو گا، کیونکہ ایجاب وقبول کو معاً دونوں گواہوں کا سننا شرعاً ضروری ہے۔ اس فون پر معاً سنانہ ہو گا بلکہ علی المتعاقب ہو گا... چونکہ عموماً فون ایسے ہی نہیں، اس لیے نکاح کے عدمِ انعقاد کا قول کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کے فون میں چونکہ مذکورہ شرط پائی جائے گی، اس لیے نکاح منعقد ہو جائے گا۔ فون کے ذریعہ جو براہِ راست آواز آتی ہے، اسے رسول کے پیغام ایجاب یا خط کے مضمون کے اعادہ کی طرح قرار دیں گے"۔[2]

---

[1]۔ مرتبہ حقانی، مختار اللہ، فتاوی حقانیہ، (اکوڑہ خٹک، جامعہ دار العلوم حقانیہ، 2010ء)، 4/311، 312۔

[2]۔ مرتبہ انور، مفتی، خیر الفتاوی، (ملتان، مکتبہ امدادیہ، 1418ھ)، 4/370، 371۔

نتائج بحث

- نکاح محض ایک معاشرتی عمل نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عظیم عبادت بھی ہے اور اس کا حلال اور حرام کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔
- نکاح میں چونکہ حلال اور حرام کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لیے اس کے انعقاد میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔
- نکاح کے انعقاد میں بہتر یہی ہے کہ نکاح سادہ اور معروف روایتی طریقے سے کیا جائے اور نکاح کے انعقاد میں حتی الامکان مواصلات کے جدید آلات سے بالکل مدد نہ لی جائے۔
- نکاح کے لیے اتحادِ مجلس اور گواہوں کا ہونا ضروری ہے اور اتحادِ مجلس سے مراد اتحادِ مکان نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ایجاب اور قبول میں اتحاد اور یکسانیت ہے۔
- معاصر علمائے کرام میں سے اکثر حضرات کے نزدیک آن لائن نکاح کی صورت میں اتحادِ مجلس کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔
- گونگے کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد ہو جاتا ہے، البتہ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک بولنے کی صلاحیت کے حامل شخص کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد نہیں ہوتا، جب کہ احناف کے نزدیک مجلس میں موجود شخص کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد نہیں ہوتا، تاہم غائب اور غیر حاضر شخص کا نکاح بذریعۂ تحریر منعقد ہو جاتا ہے۔
- غائب اور غیر موجود آدمی کا نکاح میسج یا ای میل وغیرہ کے ذریعے ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں نکاح کے لیے ضروری امور مثلاً گواہوں کا ہونا وغیرہ یقینی بنایا جائے۔
- گواہ بننے کے لیے جمہور فقہائے کرام کے نزدیک بینا ہونا ضروری نہیں ہے، نیز بینائی سے محروم آدمی زوجین کی آواز اچھی طرح پہچانتا ہو تو اس کے لیے نکاح میں گواہ بننا درست ہے۔
- براہِ راست یا بالمشافہہ آن لائن نکاح کرنا بہتر نہیں ہے، تاہم اگر کسی نے براہِ راست یا بالمشافہہ آن لائن نکاح کر لیا تو بعض علمائے کرام کے مطابق یہ نکاح منعقد ہو جائے گا، بشرطیکہ قرائنِ قویہ سے گواہی کے لیے درکار یقینی علم حاصل ہو جائے اور اس میں کسی قسم کی دھوکہ دہی یا جعل سازی کا امکان نہ ہو۔
- براہِ راست یا بالمشافہہ آن لائن نکاح میں قرائنِ قویہ سے گواہی کے لیے درکار یقینی علم حاصل نہ ہو یا اس میں دھوکہ یا جعل سازی ہو تو نکاح منعقد نہیں ہو گا۔

خلاصۂ کلام

فریقین (زوجین) دو مختلف مقامات میں ہوں تو وکیل کے ذریعے نکاح بالاتفاق منعقد ہو جاتا ہے۔ نکاح کی یہ صورت بے غبار ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جب کہ اکثر علمائے کرام آن لائن نکاح کے قائل نہیں ہیں، نیز اس میں نکاح کے تقدس کے ساتھ احتیاط کا پہلو بھی شامل ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو براہِ راست یا وکیل کے ذریعے ہی نکاح کرنا چاہیے، تاہم اگر کسی نے براہِ راست یا بالمشافہہ آن لائن نکاح کر لیا تو دوسرے علمائے کرام کی رائے کے مطابق اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، بشر طیکہ قرائنِ قویہ سے گواہی کے لیے درکار یقینی علم حاصل ہو جائے اور اس میں کسی قسم کی دھوکہ دہی یا جعل سازی نہ ہو، البتہ براہِ راست یا بالمشافہہ آن لائن نکاح میں قرائنِ قویہ سے گواہی کے لیے درکار یقینی علم حاصل نہ ہو یا اس میں ایسا دھوکہ یا جعل سازی ہو کہ جس سے نکاح کے لیے ضروری شرائط کا پایا جانا مشکوک ہو جائے تو آن لائن نکاح منعقد نہیں ہو گا۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک مجلس کی تین طلاقوں
اور تفویض طلاق کا حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "

((أَبْغَض الْحَلَال إِلَى اللَّه عَزَّ وَجَلَّ الطَّلَاق))[1]

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز چیزوں میں سے قابلِ نفرت طلاق ہے"

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا مقصد انسان کو قانون سے بالاتر رکھ کر اخلاقی اقدار سے آشنا کرتا ہے۔ طلاق دینے سے قانونی حیثیت سے مؤثر تو ہو جاتی ہے، لیکن عند اللہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ فعل ہے، اسی لیے قرآنِ حکیم نے طلاق پر بہت ساری پابندیاں عائد کی ہیں۔

طلاق دینے سے قبل بعثِ حکمین کا حکم

عموماً طلاق اسی وقت دی جاتی ہے جب زوجین میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم ایسے ہی اختلاف کی صورت میں فوراً طلاق دینے کی بجائے بعثِ حکمین (Arbitration) کا حکم دیتا ہے تاکہ جذباتی طلاق کا دروازہ بند ہو جائے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ﴾[2]۔

"اگر تمہیں زوجین میں باہم جدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم (ثالث) شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم (ثالث) بیوی کے خاندان سے لے لو۔ اگر یہ دونوں صلح کی نیت رکھتے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان (میاں بیوی) کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا"۔

یہ طلاق سے پہلے کا حکم ہے تاکہ حکمین، زوجین کے اختلاف کو دور کر کے انہیں طلاق جیسا انتہائی قدم اٹھانے سے روک سکیں۔

طلاق کی اقسام

1۔ طلاقِ سنت اور اس کے مسائل

اگر حکمین کی کوششیں بارآور ثابت نہ ہوں تو خاوند بیوی کو اس طہر میں طلاق دے جس میں مقاربت نہ ہوئی ہو۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

---

[1]۔ سنن أبي داود، کتاب الطلاق، باب کراھیۃ الطلاق، رقم الحدیث: 2177۔

[2]۔ القرآن، النساء: 35

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ أَحْصُوا الْعِدَّةَ" ﴾[1]

(اے نبی ﷺ! جب آپ عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے لیے دو اور عدت کو شمار کرو۔)

عدت اسی وقت شمار ہو سکتی ہے جب طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں مقاربت نہ ہوئی ہو کیونکہ قرآنِ حکیم نے عام حالات میں مطلقہ کی عدت تین حیض مقرر کی ہے:

﴿ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ﴾[2]

(اور طلاق شدہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک ٹھہرائیں)

جب کہ ایامِ حیض میں دی گئی طلاق میں عدت کا شمار مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایامِ حیض میں عورت کا چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے اور مرد کی طبیعت میں بھی کچھ گریز اور تنفر پایا جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں صحیح فیصلہ کرنے میں مانع ہوتی ہیں۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ایامِ حیض میں دی گئی طلاق سے رجوع کر لینے کا حکم دیا ہے۔ صحیحین میں عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے:

((أنه طلق امرأته وهی حائض فی عهدرسول اللهﷺ فسأل عمربن الخطاب (رضی الله عنه) رسول الله ﷺ عن ذلک، فقال رسول الله ﷺ مره فليرا جعها))[3]

(عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی۔ حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں حکم دو کہ رجوع کر لیں)۔

مطلقہ کے لیے قرآنِ حکیم نے یہ بھی ضروری کر دیا ہے کہ وہ عدت خاوند ہی کے گھر میں گزارے۔ ممکن ہے جو اختلاف و تنفر ان میں پیدا ہو گیا تھا، دورانِ عدت جذبات قابو میں آنے پر موانست و مودت میں بدل جائے اور خاوند طلاق سے رجوع کر لے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ ﴾[4]

(نہ تم (خاوندو) انہیں گھر سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں)۔

اگر خاوند مطلقہ کو طلاق کے فوراً بعد گھر سے نکال دے یا وہ خود نکل جائے تو قرآنِ حکیم نے اسے ظلم (گناہ) سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ اس طرح اصلاح اور رجوع کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1]۔القرآن: الطلاق:1

[2]۔القرآن: البقرۃ:228

[3]۔متفق علیہ، بخاری، کتاب الطلاق، باب قولہ تعالیٰ یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ؛ مسلم، کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض بغیر رضاھا وأنہ لو خالف وقع الطلاق ویؤمر برجعتھا۔

[4]۔القرآن: الطلاق:1

﴿ وَتِلْكَ حُدُودُاللهِ وَمَنْ يَتَعَدَّحُدُودَاللهِ فَقَدْظَلَمَ نَفْسَهُ لَاتَدْرِي لَعَلَّ اللهَ يُحْدِثُ بَعْدَذَلِكَ أَمْرًا ﴾[1]

(یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں، جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا، وہ اپنے آپ پر خود ظلم کرے گا، تم نہیں جانتے ہو، ہو سکتا ہے اللہ اس کے بعد (رجعت کی) کوئی سبیل پیدا کر دے۔)

دورانِ عدت خاوند کو رجوع کر لینے کی تلقین کی گئی ہے اور اس کے حقِ رجوع کو فائق کیا گیا ہے قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ﴾[2]

(اور ان کے خاوند دورانِ عدت انھیں لوٹانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں، اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔)

انعقادِ عدت کے قریب اگر خاوند رجوع کرنے کا ارادہ کرے یا طلاق پر ہی قائم رہے اور بیوی کو رخصت کرنا چاہے تو دونوں صورتوں میں قرآن اشہادِ شاہدین کا حکم دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا فرمان ہے:

﴿فَإِذَابَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْفَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَّ أَشْهِدُوا ذَوَى عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلهِ ﴾[3]

(پھر جب وہ اپنی میعاد (عدت) کے قریب پہنچ جائیں تو یا تو ان کو اچھی طرح زوجیت میں رہنے دو یا اچھی طرح سے رخصت کر دو اور اپنے میں سے دو عادل مردوں کو گواہ بنالو۔ (گواہو!) اللہ کے لیے درست گواہی دینا۔)

رجوع پر گواہ بنانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس بات سے آگاہ ہو جائیں کہ طلاق دینے والے نے اپنی طلاق سے رجوع کر لیا ہے اور بیوی کے ساتھ اس کا تعلق شرعاً جائز ہے جب کہ رخصتی پر گواہ بنانے میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ گواہ صرف مہر و دیگر واجبات کی ادائیگی پر ہی گواہ نہ بنیں بلکہ وہ عدت کے آخری ایام میں بھی زوجین کو سمجھا کر رجوع کر لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں تا کہ ان کا گھر بکھرنے سے بچ جائے۔

دورِ جاہلیت میں خاوند اپنی بیویوں کو لاتعداد طلاقیں دیتے رہتے تھے۔ نہ تو آباد کرتے اور نہ ہی اپنی زوجیت سے آزاد کرتے، عورت کو اذیت دینے کے لیے ہر طلاق کو تین مواقع میں محدود کر دیا۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ﴾[4]

(طلاق دو مرتبہ (موقع) ہیں، پھر (عورتوں کو) یا تو بطریقِ شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے، یا بھلائی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے)۔

اس طرح کی طلاق کو فقہاء نے طلاقِ احسن کہا ہے، یعنی خاوند حالتِ طہر میں جس میں مقاربت نہ کی ہو، ایک ہی طلاق دے۔ اگر عدت کے اندر رجوع کر لے تو وہ حسبِ سابق شرعاً رشتۂ زوجیت میں وابستہ رہیں گے اور اگر عدت کے اندر رجوع نہ کرے تو خاوند کا حقِ رجوع ساقط ہو جائے گا اور طلاقِ بائن (بینونتِ صغریٰ) ہو جائے گی اور

---

[1]- حوالہ سابقہ

[2]- البقرۃ:228

[3]- الطلاق:2

[4]- البقرۃ:229

کسی وقت بھی اگر وہ چاہیں تو باہمی رضامندی سے مہرِ جدید پر تجدیدِ نکاح کر کے رشتۂ زوجیت میں وابستہ ہو سکتے ہیں۔[1]

2۔ طلاقِ حسن اور اس کے مسائل

طلاقِ حسن یہ ہے کہ خاوند ایک طہر میں جس میں مقاربت نہ کی ہو ایک طلاق دے، پھر بغیر رجوع کیے دوسرے طہر میں دوسری طلاق دے اور پھر بغیر رجوع کیے تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے دے۔ اس طرح طلاقِ مغلظہ (بینونتِ کبریٰ) واقع ہو جائے گی اور خاوند کا حقِ رجوع و تجدیدِ نکاح ساقط ہو جائے گا۔ اس صورت میں عدت طلاقِ اول سے شمار ہو گی اور اگر عورت آئسہ ہے تو پھر ہر ماہ بغیر رجوع و مقاربت کے ایک طلاق دے، اسی طرح تین ماہ میں تین طلاقیں واقع ہو کر بینونتِ کبریٰ (مغلظہ) واقع ہو جائے گی۔[2]

طلاقِ مغلظہ واقع ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ پہلی طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع ہو جائے یا بعدِ عدت تجدیدِ نکاح بر مہرِ جدید ہو جائے اور پھر کسی وقت طلاق کی نوبت آ جائے تو عدت کے اندر رجوع اور بعدِ عدت تجدیدِ نکاح بر مہرِ جدید سے رشتۂ زوجیت بحال ہو تا ہے لیکن اگر اس دوسرے رجوع یا تجدیدِ نکاح کے بعد پھر طلاق واقع ہو جائے تو اس تیسرے موقع کی طلاق سے بینونتِ کبریٰ واقع ہو جائے گی، اب رجوع ہو سکتا ہے نہ ہی تجدیدِ نکاح۔

3۔ طلاقِ بدعت

طلاقِ بدعت وہ طلاق ہے جو قرآن و سنت کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف دی جائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

الف- باعتبارِ وقت

ب- باعتبارِ عدد

الف- اگر ایامِ حیض میں یا اس طہر میں دی جائے جس میں مقاربت ہو چکی ہو تو طلاقِ بدعت کہلاتی ہے کہ ایسے وقت میں دی گئی طلاق میں عدت کا شمار نہیں ہو سکتا اور دورانِ حیض زوجین میں باہمی رغبت بھی نہیں ہوتی۔ ایسی طلاق کی صورت میں رجوع کر لینا ہی بہتر ہے۔[3]

ب- طلاقِ بدعت باعتبارِ عدد یہ ہے کہ ایک طہر میں ایک طلاق دینے کی بجائے بیک لفظ یا بیک مجلس ایک

---

[1]- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج4، ص188، طبع بیروت 1424؛ موطا إمام محمد، کتاب الطلاق ص254، مکتبۃ الحسین لاہور (قال محمد طلاق السنۃ أن یطلقھا لقبل عدتھا طاھرًا من غیر جماع حین تطھر من حیضتھا قبل أن یجامعھا، وھو قول أبی حنیفۃ والعامۃ من فقھائنا)۔

[2]- ابن ھمام عبد الرزاق الصنعانی (ت 211ھ)، مصنف عبد الرزاق، ج5، ص335، طبع مصر 1436 (عن إبراھیم قال إذا أراد الرجل أن یطلق امرأتہ فیطلقھا حین تطھر من حیضتھا تطلیقۃ فی غیر جماع۔۔۔ فإن ھو أراد أن یطلقھا ثلاث تطلیقات فیطلقھا عند کل حیضۃ تطھر منھا تطلیقۃ من غیر جماع، فان کانت قد یئست من الحیض فیطلقھا عند ھلال تطلیقۃ)

[3]- سنن أبی داؤد، کتاب الطلاق، باب کراھیۃ الطلاق عن ابن عمر؛ بدائع الصنائع: ج4، ص201۔

سے زیادہ بار طلاق کے الفاظ استعمال کر دیئے جائیں، جیسے یوں کہا جائے کہ "تجھے تین طلاقیں" یا "تجھے طلاق، طلاق، طلاق"۔[1]

رہا یہ سوال کہ کیا بیک لفظ یا بیک مجلس متعدد یا تین کے عدد سے دی گئی طلاق بھی مغلظہ شمار ہو گی؟ یا رجعی ہو گی؟

اس مسئلہ پر پہلی صدی ہجری سے اہلِ سنت، اہل حدیث اور اہل تشیع کے ہاں اختلاف چلا آ رہا ہیں:

اول یہ کہ اس طرح دی گئی طلاق، طلاقِ مغلظہ ہو گی اور حقِ رجوع و تجدیدِ نکاح ساقط ہو جائے گا۔ اس رائے کے حامل جمہور فقہاء ہیں۔[2]

دوسری رائے یہ ہے کہ اس طرح کی طلاق ایک رجعی طلاق ہوتی ہے، اس رائے کے حامل اہل تشیع اور اہل حدیث ہے۔[3]

ایک مجلس میں تین طلاق کا حکم

ایک مجلس کی تین طلاقیں خواہ ایک جملے سے دی ہوں یا الگ الگ جملوں سے ہوں یہ فعل تو خلاف سنت اور ناجائز ہے، تاہم اگر کسی نے اس طریقے سے تین طلاقیں دے دیں تو اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلظہ ثابت ہو جائے گی، ائمہ اربعہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایک ساتھ تین طلاق دینے سے عورت مکمل طور پر حرام ہو جاتی ہے اور حلالہ شرعیہ کے بغیر وہ حلال نہیں ہو سکتی، اس اجماع کے خلاف جو بات بھی کہی جائے وہ قابل قبول نہیں ہے، اگرچہ کوئی اس کے خلاف کسی سے فتویٰ بھی حاصل کر لے. ذیل میں اختصار کے ساتھ قرآن کریم، احادیث مبارکہ، آثار صحابہ اور عباراتِ فقہ ملاحظہ ہوں:

﴿الطلاق مرتان فامساك بمعروف اوتسريح باحسان...﴾[4]۔

"طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر خواہ قاعدے کے مطابق رکھ لے، خواہ اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے"[5]

اس آیتِ کریمہ سے علماء کرام نے ایک دفعہ میں تین طلاق دینے سے تینوں کے واقع ہونے پر استدلال کیا ہے، وہ اس طرح کہ اس آیت کریمہ کا مضمون یہ ہے کہ طلاق دو دفعہ کی ہے، اب اس میں دونوں احتمال ہیں کہ

---

[1]-بدائع الصنائع: ج4، ص201

[2]-ابن رشد الخیر، أبو الولید محمد بن أحمد القرطبی (ت 545)، بدایۃ المجتھد و نھایۃ المقتصد: ج2، ص46، طبع دار الفکر، (جمہور فقھاء الأمصار علی أن الطلاق بلفظ ثلاث حکمہ حکم طلقۃ الثالثۃ)

[3]-حوالہ سابقہ

[4]۔البقرۃ:229

[5]۔معارف القرآن: ج1، ص553

دو طلاق الگ الگ طہر میں دیدے یا ایک ساتھ دیدے، بہر صورت دونوں واقع ہوں گی اور جب ایک وقت میں دو طلاقیں واقع ہو سکتی ہیں تو تین بھی واقع ہوں گی.

اس لیے کہ دو اور تین میں فرق کرنے والا کوئی قرینہ نہیں ہے. امام بخاریؒ نے بھی اپنی کتاب صحیح بخاری میں "باب من اجاز الطلاق الثلث"[1] میں تین طلاقوں کے واقع ہونے پر اسی آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے.

((قال ابوبكرالرازي تحت عنوان ''ذكرالحجاج لايقاع الثلث معاً''قوله تعالي :الطلاق مرتان فامساك بمعروف اوتسريح باحسان،الاية:يدل علي وقوع الثلث معاًمع كونه منهياعنه وذلك لان قول تعالىٰ:''الطلاق مرتان''قدابان عن حكمةاذاوقع اثنتين بأن يقول:أنت طالق،أنت طالق،في طهرواحد،وقدبيناان ذلك خلاف السنةفاذا كان في مضمون الايةالحكم بجواز وقوع الاثنين علي هذا الوجه دل ذلك علي صحةوقوعهالوأوقعهامعالأن أحدالم يفرق بينهما (رسالةحكم الطلاق الثلاث بلفظ واحدفتوي علماءالحرمين الشريفين)و في الصحيح لامام البخاريؒ:باب من أجازطلاق الثلاث لقوله تعالي الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان))۔[2]
وفي عمدةالقاري شرح الصحيح لامام البخاري:وجه الاستدلال به ان قوله تعالي :(الطلاق مرتان)معناه مرةبعدمرة،فاذاجاز الجمع بين اثنين جاز بين الثلاث))۔[3]

اس آیت کریمہ کے علاوہ بھی چند آیات مبارکہ اور بھی ہیں، جن سے تین طلاقوں کے واقع ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، ہم نے ایک آیت کے ذکر کو کافی سمجھا. اب چند احادیث طیبہ ملاحظہ ہوں جن سے مذکورہ موقف ثابت ہو رہا ہے.

((أُخْبِرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا، فَقَامَ غَضْبَانَ، ثُمَّ قَالَ: أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللهِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ ؟)) [4]

آنحضرت ﷺ کو اطلاع پہنچی کہ ایک شخص نے اکٹھی تین طلاقیں دی ہیں، یہ سن کر آپ ﷺ غصے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ: میری موجودگی میں اللہ تعالی کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے.

اس روایت میں آپ ﷺ نے غصے کا اظہار تو کیا، لیکن تین طلاقوں کو ایک قرار نہیں دیا، بلکہ تینوں کو نافذ فرمایا، جیسا کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

((فلم يرده النبيﷺبل أمضاه،عن سهل في هذاقال:فطلقهاثلث تطليقات عندرسول اللهﷺ فأنفذه رسول ﷺ .)) [5]

حضرت عویمرؓ نے اپنی بیوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دے دیں تو آپ ﷺ نے تینوں کو نافذ فرمایا.

---

[1] ۔ صحیح البخاری، کتاب الطاق، باب من طلاق وھل یواجہ الرجل امراتہ بالطلاق،:ج2ص 791، رقم الحدیث:5257

[2] ۔ ایضاً

[3] ۔ العینی، حافظ بدر الدین محمود بن احمد، عمدۃ القاری، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ج9، ص538

[4] ۔ النسائی، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر الخراسانی، سنن النسائی، کتاب الطلاق باب الطلاق لغیر والعدۃ وما یحتسب منہ علی المطلق، ج2 ص99، رقم الحدیث:3428

[5] ۔ سنن اَبي داود، کتاب الطلاق، باب کراھیۃ الطلاق، ج1، ص306، رقم الحدیث:2177۔

((كان ابن عمررضي الله عنهمااذاسئل عمن طلق ثلثاقال:لوطلقت مرةأومر تين فأن النبي ﷺ أمرني بهذا،فان طلقهاثلثاحرمت حتى تنكح زوجاغيره)).[1]

حضرت ابن عمرؓ سے جب اس شخص کے متعلق سوال کیا جاتا جس نے تین طلاقیں دی ہوں تو فرماتے: "اگر تو نے ایک یا دو طلاقیں دی ہوتیں، تو رجوع کر سکتا تھا، اس لیے کہ رسول ﷺ نے مجھے اس کا (یعنی رجعت کا) حکم دیا تھا، اور اگر تین طلاقیں دے دی ہیں تو عورت حرام ہو جائے گی، یہاں تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح کرے۔"

ان احادیثِ مبارکہ کے علاوہ بھی ایسی بہت ساری روایات موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ کے عہد مبارک میں تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی تھیں۔

غیر مقلدین حضرات جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے ہیں، وہ عام طور پر دو روایات سے استدلال کرتے ہیں:

حديث نمبر1((عن ابن عباس رضي الله عنهماقال:طلق ركانة بن عبديزيدأخوبني مطلب امرأئة ثلثا في مجلس واحد فحزن عليهاحزناشديدا،قال:فسأله رسول الله ﷺ وكيف طلقتها؟ قال:طلقتهاثلثا،قال:فقال في مجلس واحد؟قال:فانما تلك واحدة فارجعهاان شئت .قال:فرجعها)).اسناده صحيح.[2]

حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں اور پھر وہ افسردہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے کیسے طلاق دی؟ انہوں نے عرض کیا: تین طلاقیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "ایک مجلس میں؟" عرض کیا: جی ہاں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر تو یہ ایک طلاق ہے، اگر آپ چاہیں تو رجوع کر لیں۔" چنانچہ انہوں نے رجوع کر لیا۔

حدیث نمبر2((عن ابن عباس رضي الله عنهماقال:كان الطلاق علي عهدرسول الله ﷺ وأبي بكروسنتين من خلافةعمرطلاق الثلث واحدة)).[3]

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ: رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں اور حضرت عمر کے زمانہ خلافت کے شروع کے دو سالوں میں (ایک مجلس کی) تین طلاقیں ایک ہی ہوا کرتی تھیں.

غیر مقلدین اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے عام طور پر مذکورہ بالا روایتوں سے استدلال کرتے ہیں، لیکن ان روایتوں سے مذکورہ موقف پر استدلال درست نہیں، وجوہات درج ذیل ہیں:

حدیث نمبر 1: میں حضرت رکانہ کی طلاق کا جو قصہ مذکورہ ہے، اس میں روایات کے اندر اضطراب پایا جاتا ہے، بعض روایات میں ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی جیسا کہ مذکورہ روایت میں ہے، اور بعض

---

[1] ۔ صحیح البخاری، کتاب الطلاق، باب من قال لامر أتہ انت علی حرام، ج2ص792، رقم الحدیث:5264

[2] ۔ مسند امام احمد ج4، ص477، رقم الحدیث:2387

[3] ۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب طلاق الثلاث، ج1ص550، رقم الحدیث:3673

روایات میں آیاہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ "بتہ" سے طلاق دی تھی، اور طلاق "بتّہ" سے مراد وہ طلاق ہے جس میں ایک سے تین طلاقوں تک کی گنجائش ہوتی ہے، یعنی اگر ایک طلاق کی نیت ہو تو ایک، اور تین کی نیت ہو تو تین طلاقیں واقع ہوں گی، اسی اضطراب کی وجہ سے اس روایت کے بارے میں علمائے حدیث نے مختلف اقوال اختیار کیے، مثلاً:

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو "معلول" قرار دیا۔[1]

علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اس کو "ضعیف" کہا۔

حضرت امام ابو بکر جصاص اور علامہ ابن الہمام رحمہما اللہ نے اس کو "منکر" فرمایا۔

کیونکہ یہ روایت ان معتبر اور ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف ہے جنہوں نے لفظ "بتّہ" کے ذریعہ طلاق دینا نقل کیاہے۔

حضرت امام ابو داوٗد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق "بتہ" دی تھی، کیونکہ حضرت رکانہؓ کے گھر والوں نے اس کو روایت کیاہے اور گھر والے گھر کے قصے کو دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں، چنانچہ امام ابو داوٗد نے فرمایا:

((عن عبداللہ بن علي بن يزيد بن ركانةعن ابيه عن جده انه طلق امرأته ،فأتي رسول اللهﷺ فقال:ماأردت ؟قال واحدة،قال:هوعلي ماأردت،قال أبوداؤد:وهذاأصح من حديث ابن جريج أن ركانةطلق امرأته ثلثالأنهم اهل بيته وهم أعلم به))[2]

حضرت یزید اپنے والد حضرت رکانہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق "بتّہ" دی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ: تمہاری نیت کیا تھی؟ عرض کیا: ایک طلاق کی، آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم؟ عرض کیا: جی ہاں خدا کی قسم، آپ ﷺ نے فرمایا: جو تم نے نیت کی وہی معتبر ہے (یعنی نیت کے مطابق ایک طلاق واقع ہوئی)۔ امام ابو داوٗدؒ نے فرمایا کہ اس حدیث کے بیان کرنے والے ان کے اپنے گھر کے افراد ہیں، اور وہ اس واقعے کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت رکانہؓ نے اس وجہ سے رجوع نہیں کیا تھا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو حضور ﷺ نے ایک طلاق شمار کرکے ان کو رجوع کا حکم دیا تھا، بلکہ اس وجہ سے انہوں نے رجوع کیا تھا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاق کی نیت سے طلاق "بتہ" دی تھی۔

حدیث نمبر:2 سے بھی غیر مقلدین کا اپنے موقف پر استدلال کرنا درست نہیں، وجوہات درج ذیل ہیں:

---

[1] ۔ سنن أبي داود ط عطاءات العلم - باب في البتة - المكتبة الشاملة، ج1 ص537-

[2] ۔ سنن أبي داود، كتاب الطلاق، باب في طلاق الثلاث، ج1، ص307، رقم الحديث:2197۔

الف:اس روایت میں راوی کو وہم ہوا ہے ،کیونکہ ابن طاؤسؒ سے اس کے خلاف روایت منقول ہے ،اور علامہ باجیؒ[1] نے حضرت ابن طاؤس[2] کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے ،چنانچہ اوجزالمسالک میں اس مضمون کو درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

((في أوجزالمسالك شرح المؤطاللامام مالك نقلاًعن الباجيؒ: و ماروي عن ابن عباس في ذلك من روايةطاؤس،قال فيه بعض المحدثين: هوروي ابن طاؤس عن ابيه عن ابن وهب خلاف ذلك وانماوقع الوهم في التاويل،قال الباجي:وعندي أن الروايةعن ابن طاؤس بذلك صحيحة فقدرواه عنه الأئمة معمروابن جريج وغيرهما))[3]

((وفي السنن الكبريٰ للبيهقي :وهٰذاالحديث أحدمااختلف فيه البخاري ومسلم فأخرجه مسلم وتركه البخاري وأظنه انماتركه لمخالفته سائرالروايات عن ابن عباس))[4]

"اس حدیث کے بارے میں حضرت امام بخاریؒ اورامام مسلمؒ کا اختلاف ہوا،سوامام مسلمؒ نے اس کو اپنی کتاب میں نقل کیااورامام بخاریؒ نے چھوڑ دیا،اور میرے خیال میں امام بخاریؒ نے اس روایت کو اس لیے نہیں لیا کہ یہ روایت حضرت ابن عباسؓ کی دیگر روایات کے خلاف ہے.

((وفي الجوهرالنقي علي هامش الكبريٰ:وذكرصاحب الاستذكار:أن هٰذه الرواية وهم وغلط لم يعرج عليهاأحدمن العلماء))[5]

"صاحب استذکارؒ نے فرمایا:یہ روایت وہم اور غلط ہے علماء میں سے کسی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے".

ب:اگر وہم وغیرہ سے قطع نظر بھی کی جائے تو بھی اس حدیث کے کئی معنی ومطلب ہو سکتے ہیں،ایک مطلب وہ بھی بن سکتا ہے جو غیر مقلدین نے لیا ہے ، لیکن یہ مطلب نہیں نکالا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین نہیں بلکہ ایک شمار ہوں گی ،لہذا اس کا سب سے زیادہ صحیح اور قوی معنی ومطلب ذیل میں بیان کیا جاتا ہے جسے حضرت امام قرطبیؒ نے پسند فرمایا ہے اور جس کو خود حضرت عمر رضي الله تعالی عنہ کے قول سے تقویت ملتی ہے.

اس حدیث شریف میں کسی عام قاعدہ کا ذکر نہیں ،بلکہ اس کا تعلق ایک خاص صورت سے ہے اوروہ یہ کہ شوہر لفظ طلاق کو "تاکید" کی نیت سے دہرائے ،ہر جملہ سے الگ الگ طلاق کی نیت نہ ہو،تو اس صورت میں شوہر کی

---

[1] ۔ابو محمد عبد اللہ بن محمد (291ھ-378ھ) بن علی بن شریعہ لخمی اشبیلی،جو ابن باجی کے نام سے مشہور تھے،ایک مالکی فقیہ تھے وہ اشبیلیہ کے قاضی احمد بن عبد اللہ باجی کے والد ہیں۔ابن الباجی اشبیلیہ میں پیدا ہوئے ،وہیں پلے بڑھے اور بنیادی تعلیم حاصل کی۔(الحميدي، عبد الله بن محمد . جذوة المقتبس في ذكر ولاة الأندلس . تحقيق بشار عواد معروف. بيروت: دار الغرب الإسلامي، 1989.)

[2] ۔عبد اللہ بن طاؤس بن کیسان ،ابو محمد الیمانی۔(132ھ) آپ صغار تابعی، محدث ،فقیہ اور حدیث نبوی کے راوی تھے۔ معمر نے کہا:وہ عربی کے سب سے زیادہ جاننے والے اور بہترین اخلاق والے تھے۔ہم نے ان جیسا فقیہ کا بیٹا نہیں دیکھا۔ آپ کا انتقال سنہ ایک سو بتیس ہجری میں ہوا۔(الذهبي، شمس الدين . سير أعلام النبلاء . بيروت: مؤسسة الرسالة، 1985، ج6، ص112)

[3] ۔(اوجزالمسالک شرح المؤطاامام مالک:ج4، ص231)

[4] ۔"(نشرالسنة:ج7،ص337)

[5] ۔(نشرالسنة:ج7،ص337)

تصدیق کی جائے گی اور ایک ہی طلاق کے واقع ہونے کا حکم جاری کیا جائے گا، لیکن شوہر کی تصدیق اس وقت تک کی جاتی تھی اور شوہر پر اس وقت تک اعتماد کیا جاتا تھا جب لوگوں کے سینے اور دل دھوکا وفریب سے صاف شفاف تھے، لیکن جب حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں لوگوں میں جھوٹ، دھوکا اور فریب کا رواج ہونے لگا اور اب کسی کی دیانت پر بھروسہ کرکے اس کے دعویٰ کی تصدیق مشکل ہوگئی، تو حضرت عمرؓ نے ظاہراً تکرار کو دیکھ کر اس کے مطابق تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا اور نیتِ تاکید کے دعوی کو قبول نہیں فرمایا.

((في تكملة فتح الملهم:وهذاالجواب ارتضـاه القرطبي وقواه بقول عمر:ان الناس اسـتعجلوافي أمركانت لهم فيه اناةوكذا قال النووي:ان هذاأصح الاجوبة))۔[1]

اس جواب کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے پسند فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے اس کی تائید بھی فرمائی جس میں انہوں نے فرمایا کہ: لوگوں نے مہلت والی چیز میں جلد بازی سے کام لیا، حضرت امام نووی رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا اور یہ صحیح ترین جواب ہے.

اب چند مشہور اور کبار صحابہ کرام کے فتاوی ملاحظہ ہوں جن میں تین طلاقیں تین ھی شمار کی ہیں، یہ فتاوی مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور ہیں:

((كان عمراذا أتي برجل قدطلق امرأته ثلاثافي مجلس أوجعه ضرباوفرق بينهما))[2]

"حضرت عمر فاروق رضي اللہ عنہ کي خدمت میں جب کسی ایسے شخص کو حاضر کیا جاتا جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہوں، تو حضرت عمر اس کو سزا دیتے اور میاں بیوی کے درمیان علیحدگی بھی فرماتے"۔

((جاءرجل الي عثمانؓ فقال: اني طلقت امرأتي مائة،قال:ثلاث تحرمها عليك وسـبعةوتسـعون عدوان))[3]

"ایک آدمی حضرت عثمان رضي اللہ عنہ کے پاس آیا اور کھا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں، اس پر انہوں نے فرمایا کہ: تین طلاقوں سے بیوی تمہارے اوپر حرام ہو گئی اور باقی ستانوے حد سے تجاوز ہے".

((جاء رجل الي علي رضی اللہ عنہ فقال:اني طلقت امراته مائةتطليقة ،قال :بانت منك ثلاث))[4]

"ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آکر عرض کرنے لگا کہ: میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: تین طلاقوں سے بیوی تم سے الگ ہوگئی".

---

[1] ۔عثمانی محمد تقی، تکملۃ فتح الملھم۔مکتبہ معارف القرآن، کراچی، نادارد، (ج1، ص158)

[2] ۔ابی بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ،، مصنف ابن ابی شیبۃ: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراتشی، 2007، ج9، ص519، رقم الحدیث:18089

[3] ۔ایضاًج9، ص522، رقم الحدیث:18104

[4] ۔ ایضاًج9، ص521، رقم الحدیث:18101

((عن عبداللہؓ أنه سئل عن رجل طلق امرأته مائة تطليقة،قال:حرمتها ثلاث))[1]

"حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے کسی شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی تھیں، تو انہوں نے فرمایا کہ: وہ تین طلاقوں سے حرام ہو گئی"۔

ان حضرات صحابہ کرامؓ کے علاوہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عمران بن حصین اور حضرت مغیرہ بن شعبہ وغیرہم رضی اللہ عنہم کا فتوی بھی یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔

اب مذاہب اربعہ کی عبارت ملاحظہ ہوں:

((قال ابن الهمام الحنفيؒ:وذهب جمهور الصحابةوالتابعين ومن أئمةالمسلمين الي أنه يقع ثلاث))[2]

جمہور صحابہ، تابعین اور بعد میں آنے والے اماموں کا مذہب یہی ہے کہ تین طلاق دینے کی صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوں گی۔

((وقال العلامةالحطاب المالكي رحمه الله:وكلما طلق من ذلك يلزمه))[3]

تین طلاقیں شوہر جس طریقے سے بھی دیدے، وہ تینوں نافذ ولازم ہوں گی۔

((وقال العلامةالنووي الشافعيؒ:فقال الشافعي ومالك وأبوحنيفة وأحمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلث))''[4]

حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابو حنیفہ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور اگلے پچھلے علماء میں سے جمہور علماء کرام کا مذہب یہی ہے کہ تین طلاق دینے کی صورت میں تین ہی واقع ہوں گی۔

---

[1] ۔ایضاً ج9، ص521، رقم الحدیث:18098

[2] ۔(فتح القدیر ج3، ص25)، ردالمختار، ج3، ص233

[3] ۔(أبو عبد اللہ محمد بن محمد بن عبد الرحمن الرعيني المعروف بالحطاب، دار الفکر، مواهب الجليل: ج4، ص39

[4] ۔النووی، أبو زکریا محيي الدين يحيى بن، المنهاج شرح النووي شرح صحيح مسلم، دار إحياء التراث العربي- بيروت، ج1 ص478

طلاقِ تفویض اور اس کے احکام

بنیادی طور پر طلاق خاوند کا حق ہے کہ وہ خود بیوی کو طلاق دے، لیکن نکاح کی طرح شریعت نے اس میں بھی توکیل کو جائز رکھا ہے۔ طلاق میں وکالت کی دو صورتیں ہیں:

1-خاوند طلاق دینے کے لیے کسی غیر کو وکیل مقرر کرے، جسے "توکیل" کہا جاتا ہے۔

2-خاوند بیوی ہی کو اس مقصد کے لیے وکیل مقرر کر دے، یہ صورت "تفویض" کہلاتی ہے۔[1]

توکیل اور تفویض میں فرق

توکیل اور تفویض میں فرق یہ ہے کہ:

1- توکیل میں وکیل اپنے لیے نہیں، کسی اور کے لیے یہ حق استعمال کرتا ہے، جب کہ تفویض کی صورت میں وہ یہ حق اپنے لیے استعمال کرتا ہے۔

2- توکیل میں وکیل اپنے مؤکل کی مرضی و منشا پر عمل کرتا ہے، جب کہ تفویض میں مفوض اس حق کی ملکیت میں شریک ہو جاتا ہے اور اپنی مرضی و ارادہ پر عمل کرتا ہے۔

3- توکیل میں مؤکل کسی وقت بھی توکیل سے رجوع کر کے وکیل کو معزول کر سکتا ہے جب کہ تفویض میں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ایک بار حقِ طلاق تفویض کرنے کے بعد اسے واپس لینا ممکن نہیں رہتا۔

4- توکیل مؤکل کے جنون کی صورت میں زائل ہو جاتی ہے، کیونکہ مؤکل یا وکیل کی اہلیت زائل ہونے کی صورت میں وکالت بھی باطل ہو جاتی ہے جب کہ تفویض جنون کی صورت میں باطل نہیں ہوتی، کیونکہ یہ تعلیق (Contingency) کی طرح ہے جو باطل نہیں ہوتی۔

البتہ توکیل و تفویض دونوں صورتوں میں خاوند اپنے حقِ طلاق سے محروم نہیں ہوتا۔ کسی غیر کو وکیل بنانے یا بیوی کو حقِ طلاق تفویض کرنے کے بعد بھی وہ حقِ طلاق کا مالک رہتا ہے اور اسے استعمال کر سکتا ہے۔[2]

طلاقِ تفویض کی مشروعیت

طلاقِ تفویض کی مشروعیت کا استنباط قرآن حکیم سے ہوتا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا۔ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾۔[3]

(اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں

---

[1]-عبد الرحمن الجزیری، کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ: دار الکتب العلمیۃ، ج ۴، ص ۱۷۳

[2]-حوالہ سابقہ، أبو زہرہ، محمد مصری، الأحوال الشخصیۃ: ص 323-325 دار الفکر، بیروت

[3]-الاحزاب: 28-29

اور اچھی طرح رخصت کر دوں اور اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور عاقبت کے گھر کی طلب گار ہو تو جو نیکی کرنے والی ہیں، ان کے لیے اللہ نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے)

ان آیات سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات کو اپنے رشتۂ زوجیت میں رہنے یا اسے ختم کر کے چلے جانے کا اختیار دیا تھا۔ یہی اختیار فقہی اصطلاح میں "تفویض" کہلاتا ہے۔[1]

اس آیت کی تفسیر میں یہ رائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور تابعین میں سے مجاہد، عکرمہ، شعبی اور محمد بن شہاب الزہری رحمہم اللہ کی ہے۔[2]

دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ، حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ ان آیات سے تفویض پر استدلال کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کو 'بقا' یا 'طلاق' کا اختیار نہیں دیا تھا، بلکہ یہ دنیا و آخرت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا اختیار تھا، البتہ طلاقِ تفویض کے شرعی ہونے کے تمام قائل ہیں۔

فقہاء میں سے صرف ابن حزم ظاہریؒ توکیل یا تفویض کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص بھی اپنے کلام کا کسی دوسرے کو وکیل نہیں بنا سکتا۔ ظہار، لعان اور ایلاء میں توکیل یا تفویض جائز نہیں تو طلاق میں بھی یہ جائز نہیں ہونی چاہیے۔ وکالت و نیابت صرف انہی معاملات میں جائز ہے جن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اجازت دی ہے اور طلاق کا تذکرہ جہاں بھی اللہ نے کیا ہے خاوندوں ہی کو مخاطب کیا ہے، نہ کسی غیر کو۔[3]

جمہور اپنی روایت کے حق میں یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ آیاتِ تخییر کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:"

((إني ذاكرلك أمرافلاعليك أن لا تعجلي حتى تستأمري أبويك))[4]

(میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ جلدی نہ کرنا اور فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کر لینا۔)

اس روایت کی تخریج بخاریؒ، ترمذیؒ اور احمد بن حنبلؒ نے کی ہے۔ جمہور اس روایت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر آیت سے مراد بقا اور طلاق میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا نہ ہوتا تو آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کو فیصلے سے

---

[1] - أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي، أحكام القرآن للجصاص: أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي ، ج2، ص375؛ الجامع لأحكام القرآن، للقرطبی: ج17، ص128: أحکام القرآن لابن العربی مالکی، محمد بن عبد اللہ (ت 540ھ): ج3، ص562، دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

[2] - بخاری کتاب التفسیر، باب قل لازواجک۔۔۔ سراحا جمیلا (رقم الحدیث:4785)؛ أحکام القرآن للجصاص: ج 3، ص 357- 358؛ تفسیر الکشاف للزمخشری: ج3، ص258؛ تفسیر فتح القدیر للشوکانی: ج4، ص276؛ بخاری کتاب الطلاق باب من خیر أزواجہ (رقم الحدیث:5263-5264)؛ مسلم کتاب الطلاق، باب بیان أن تخییر امرأتہ لایکون طلاقا إلا بالنیۃ

[3] -ابن حزم الظاهری، أبو محمد علی بن أحمد (ت 452ھ)، المحلی شرح المجلی: ج9، ص58، مسئلہ رقم 1363، دار إحیاء التراث العربی، بیروت 1998ء

[4] - بخاری کتاب التفسیر باب قل لازواجک--- سراحًا جمیلا (رقم الحدیث:4785)؛ سنن الترمذی کتاب الطلاق واللعان باب ما جاء فی الخیار (رقم الحدیث: 1179)؛ المسند للإمام أحمد بن حنبل، مسند عائشۃ (رقم الحدیث:26637)

قبل اپنے والدین سے مشورہ کرنے اور رائے لینے کا نہ فرماتے۔[1]

طلاقِ تفویض کی اقسام

فقہائے کرام تفویض کو چھے اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

۱- تفویضِ صریح (Expressive delegation)

۲- تفویض بالکنایہ (Allusive delegation)

۳- تفویض غیر مشروط (Unconditional delegation)

۴- تفویضِ مشروط (Conditional delegation)

۵- تویض مقید یا موقت (Temporary delegation)

۶- تفویضِ غیر مقید یا غیر موقت (Permanent delegation)

تفویضِ صریح یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو صریح الفاظ میں حقِ طلاق تفویض کرے، مثلاً یوں کہے کہ "تو اپنے آپ کو طلاق دے لے"، "تو جب چاہے اپنے آپ کو طلاق دے لے"، "میں حقِ طلاق تجھے تفویض کرتا ہوں"، "میں نے حقِ طلاق تجھے تفویض کر دیا ہے"، حتی کہ اگر یوں کہے کہ "میں تجھے طلاق کے لیے وکیل بناتا ہوں"، تو اس سے بھی تفویض ہی مراد ہو گی، کیونکہ بیوی اس صورت میں بھی اپنے ہی حق میں وکالت کو استعمال کرتے ہوئے کارروائی کرے گی، جو تفویض ہے۔

تفویض بالکنایہ یہ ہے کہ خاوند ایسے الفاظ استعمال کرے جو کنایہ طلاق کیلئے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً: "تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے"، "تو اپنے لیے اختیار کر لے"، "تجھے اختیار حاصل ہے"، یا ان جیسے دوسرے الفاظ۔[2]

تفویض غیر مشروط یہ ہے کہ اسے کسی شرط کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے، یا حقِ طلاق تفویض کرتے وقت کسی شرط کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ایسی صورت میں بیوی بغیر کسی شرط کے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے اور تفویض مشروط یہ ہے کہ اس حق کو کسی شرط کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے، ایسی صورت میں جب تک وہ شرط نہ پائی جائے، بیوی حقِ طلاق استعمال نہیں کر سکتی۔[3]

تفویض موقت کی دو قسمیں ہیں: اول یہ کہ حقِ طلاق استعمال کرنے کے لیے خاوند کوئی وقت متعین کر دے، مثلاً: یوں کہے کہ "صبح تک، یا دو دونوں کے اندر، یا اس ہفتے کے اندر (کوئی بھی وقت متعین کر دے) تو اپنے

[1]- أحکام القرآن للجصاص: ج3، ص357؛ الجامع لأحکام القرآن، للقرطبی: ج17، ص128-129

[2]- کتاب الفقہ علی المذاھب الأربعۃ: ج4، ص372

[3]- الفتاویٰ الھندیۃ (فتاویٰ عالمگیری): ج1، ص432، طبع بیروت

آپ کو طلاق کر لے"۔ اس صورت میں بیوی کو یہ اختیار صرف اسی وقت کے لیے حاصل ہو گا جو خاوند نے متعین کیا ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ خاوند وقت تو متعین نہ کرے لیکن تفویض مجلس کے ساتھ مقید ہو۔ جب طلاق کے الفاظ کسی طرح بھی عموم پر دلالت نہ کرتے ہوں تو ایسی تفویض مجلس کے ساتھ مقید ہو گی، مجلس ختم ہوتے ہی حقِ طلاق ختم ہو جائے گا۔ اگر خاوند حقِ طلاق تفویض کرتے وقت "جب چاہے"، "جس وقت چاہے"، یا ان جیسے دوسرے الفاظ استعمال کرے تو تفویض غیر موقت ہو گی اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ بیوی جب چاہے اسے استعمال کر سکتی ہے۔[1]

فقہائے احناف و مالکیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر تفویض کے الفاظ کسی طرح بھی عموم پر دلالت نہ کرتے ہوں تو پھر تفویض مجلس کیساتھ مقید ہو گی، مجلس ختم ہوتے ہی تفویض کردہ حقِ طلاق بھی ختم ہو جائے گا، لیکن اگر تفویض میں عموم پایا جاتا ہو، یا کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جو عموم پر دلالت کرتا ہو، تو پھر تفویض کردہ حق تعلیق کی طرح ہمیشہ قائم رہے گا۔ شافعی فقہاء کے نزدیک تمام عقود کی طرح تفویض بھی بغیر ایجاب و قبول کے ثابت نہیں ہو گی۔ خاوند کی طرف سے ایجاب اور بیوی کی طرف سے قبول ہونا چاہیے، اگر قبول سے پہلے خاوند ایجاب سے رجوع کر لے تو تفویض باطل ہو جائے گی اور بیوی کی طرف سے قبول کے بعد خاوند کبھی بھی تفویض سے رجوع نہیں کر سکتا۔[2]

تفویض کا وقت

خاوند کی طرف سے حقِ طلاق بیوی کو کس وقت تفویض کیا جا سکتا ہے؟ نکاح کے وقت یا نکاح کے بعد کسی بھی وقت حقِ طلاق تفویض کرنے پر تمام فقہاء متفق ہیں۔ احناف نکاح سے قبل بھی تفویض کو درست سمجھتے ہیں، تاہم ان کے نزدیک ضروری ہے کہ تفویض میں نکاح کی طرف نسبت ہو، بغیر نسبت کے ان کے نزدیک تفویض درست نہیں۔ البتہ ائمۂ ثلاثہ نکاح سے قبل تفویض کو کسی طرح درست نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک نکاح سے قبل عورت محلِ طلاق ہی نہیں ہوتی، تو اسے یہ حق بھی تفویض نہیں کیا جا سکتا ہے۔[3] بوقتِ نکاح تفویض کردہ حقِ طلاق میں فقہائے احناف و مالکیہ عموم کے قرینہ کو تسلیم کرتے ہوئے اسے غیر مقید مانتے ہیں، کیونکہ اس وقت تفویض کردہ حق معاہدۂ نکاح کا جزو ہوتا ہے اور جس طرح نکاح مجلس سے مقید نہیں ہوتا بلکہ مستقل ہوتا ہے، اسی طرح اس کے ساتھ موجود حقِ طلاق بھی مجلس سے مقید نہیں ہوتا، مستقل ہوتا ہے۔

تفویض کردہ حقِ طلاق استعمال کرنے کے الفاظ

عورت اگر تفویض کردہ حقِ طلاق استعمال کرنا چاہے تو ان تمام الفاظ کے ذریعے اپنے آپ کو طلاق دے

1- المبسوط للسرخسی: ج6، ص217-218

2- الأحوال الشخصية، أبو زهره: ص329

3- بداية المجتهد و نهاية المقتصد، لابن رشد: ج2، ص53؛ ابن عابدين، محمد بن أمين (ت 1252ھ)، رد المحتار على الدر المختار شرح تنوير الأبصار: ج4، ص 543

سکتی ہے جو الفاظ مرد طلاق کے لیے استعمال کرتا ہے، مثلاً: ”میں اپنے آپ کو طلاق دیتی ہوں“، ”میں نے اپنے آپ کو تجھ پر حرام کر دیا“، ”میں تجھ سے بائن ہو گئی“، ”میں نے تیرا دیا ہوا حق استعمال کر لیا“، ”تو مجھ پر حرام ہو گیا“، یا ان جیسے دوسرے الفاظ،[1] کیونکہ وہ اس حق کے تحت مرد کو طلاق نہیں دیتی بلکہ اس کے تفویض کردہ حق کو اپنے اوپر نافذ کرتے ہوئے اپنے آپ کو طلاق دیتی ہے۔

طلاقِ تفویض کا حکم

تفویض کردہ حقِ طلاق کو استعمال کرنے سے کون سی طلاق واقع ہو گئی؟ رجعی یا بائن؟ فقہاء کا اس میں اختلاف ہے۔ شافعی فقہاء کہتے ہیں کہ اگر بیوی اپنے آپ کو طلاق دیتی ہے تو اس کا اعتبار عرفِ شرعی ہی پر کیا جائے گا اور ایک رجعی طلاق یا طلاقِ سنت واقع ہو گی۔ خاوند کو عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل رہے گا۔ احناف کے نزدیک اس طرح کی طلاق، طلاقِ بائن ہو گی اور خاوند کا حقِ رجوع ساقط ہو جائے گا، کیونکہ اگر اسے رجعی قرار دیا جائے تو پھر تفویض کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، البتہ دونوں میاں بیوی باہمی رضامندی سے مہرِ جدید پر تجدیدِ نکاح کر سکتے ہیں۔ جب کہ امام مالکؒ کے نزدیک بیوی جب تفویض کردہ حقِ طلاق استعمال کرتی ہے تو تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور رجوع یا تجدیدِ نکاح کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ تفویض تملیک ہے اور جب بیوی کو خاوند کی طرف سے حقِ طلاق تفویض کیا جاتا ہے تو وہ ان تمام طلاقوں کی مالک بن جاتی ہے جن کا خاوند خود مالک ہوتا ہے اور استعمال کی صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہو کر طلاقِ مغلظہ (Absolute) ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تفویض کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ان میں سے احناف کا مسلک بہتر اور معتدل ہے کہ تفویض کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے اور اگر وہ دوبارہ باہمی رضامندی سے رشتۂ زوجیت میں منسلک ہونا چاہیں تو اس کا راستہ بھی بند نہیں ہوتا۔

خلاصۂ بحث

خلاصۂ بحث کو مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

1- طلاقِ تفویض ایک شرعی طریقۂ طلاق ہے اور نکاح نامہ کا کالم ۱۸ شریعت کے مطابق ہے، غیر شرعی نہیں۔ طلاقِ تفویض سے بیوی خاوند کو طلاق نہیں دیتی بلکہ خاوند کے دیے ہوئے حقِ طلاق کو اس کی طرف سے اپنے اوپر استعمال کرتی ہے۔

2- نکاح نامہ میں تفویض کردہ حقِ طلاق مستقل، غیر مؤقت ہوتا ہے اور خاوند اسے منسوخ نہیں کر سکتا۔

3- حقِ طلاق بیوی کو تفویض کرنے کے بعد خاوند حقِ طلاق سے محروم نہیں ہو جاتا، بلکہ اسے خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔

[1] -الکاسانی، علاء الدین أبو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: ج 3، ص 117؛ سید سابق، فقہ السنۃ: ج 3، ص 185، دار الحدیث القاھرہ

نشے کی طلاق اوراسکے لیے عقل وہوش کامطلوبہ معیار

نشے کی حالت میں دی گئی طلاق کا مسئلہ اسلامی فقہ میں ایک نازک اور پیچیدہ معاملہ ہے، کیونکہ یہ مسئلہ انسانی عقل و شعور، ارادے اور شرعی ذمہ داری سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ طلاق ایک ایسا معاملہ ہے جو نہ صرف زوجین بلکہ پورے خاندان کے مستقبل پر گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ نشہ، جو عقل کو ماؤف کر دیتا ہے، ایسے فیصلوں کی صحت پر سوال اٹھاتا ہے جو اس حالت میں کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر فقہاء اور علماء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"كُلُّ طَلَاقٍ جَائِزٌ إِلَّا طَلَاقَ الْمَعْتُوهِ الْمَغْلُوبِ عَلَى عَقْلِهِ "۔[1]

اگرچہ اس حدیث کی سند پر محدثین کا اختلاف ہو سکتا ہے اور امام ترمذیؒ نے عطاء بن عجلان کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن فقہاء کے ہاں اس مضمون کو تسلیم کیا گیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے ضعیف قرار دینے کے بعد کہا کہ اہلِ علم کا عمل اسی پر ہے۔ یہ مضمون حضرت علیؓ سے موقوفاً صحیح سند کے ساتھ نقل ہوا اور امام بخاریؒ نے بھی اسے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

اس حدیث کی بنیاد پر فقہاء میں یہ اتفاق پایا جاتا ہے کہ عقل کے زوال کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی، یعنی اگر کسی کی عقل زائل ہو چکی ہو تو اس کی طلاق معتبر نہیں ہو گی۔ تاہم، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل کا زوال کس درجے تک پہنچنا ضروری ہے؟ کیا جنون کی حد تک عقل کا زائل ہونا شرط ہے، یا اس سے کم درجے کا زوال بھی کافی ہے؟ نشے کی حالت میں دی گئی طلاق کا حکم سمجھنے سے پہلے اس سوال کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

اس مسئلے کے علاوہ بھی فقہاء، خاص طور پر فقہائے حنفیہ، نے مختلف مواقع پر عقل کے زوال کی وجہ سے طلاق کے نافذ نہ ہونے کا حکم دیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ شوہر معتوہ ہو تو طلاق کا حکم:

فقہائے حنفیہ کے مطابق، جس طرح مجنون کی طلاق واقع نہیں ہوتی، اسی طرح "معتوہ" کی طلاق بھی واقع نہیں ہوتی۔[2] "عتہ" کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامیؒ (مصنفِ در مختار) لکھتے ہیں:

((ھو إختلال فی العقل))۔

علامہ شامیؒ نے "البحر الرائق" کے حوالے سے وضاحت کی ہے کہ معتوہ وہ ہے جس کی عقل کمزور ہو، گفتگو بے ربط ہو، اور تدبیر ناقص ہو، لیکن وہ گالی گلوچ یا مار پیٹ نہ کرے، جبکہ مجنون کی علامات اس سے مختلف ہیں۔ علامہ شامیؒ کے نقل کردہ الفاظ یہ ہیں:

((وأحسن الأقوال فی الفرق بینهماأن المعتوہ هوقلیل الفهم،المختلط الکلام،الفاسدالتدبیر،لکن

[1] الترمذی، کتاب الطلاق، واللعان عن رسول اللہ ﷺ باب ماجاء فی طلاق المعتوہ، ج3، ص496، (رقم الحدیث: 1191)

[2] ابن عابدین، حاشیۃ ابن عابدین ج3 ص243

لایضرب ولایشتم بخلاف المجنون))۔[1]

2۔جائز نشے کی حالت میں طلاق

اگر نشہ کسی جائز سبب سے ہو، مثلاً کچھ دوائیاں ایسی ہیں جن میں نشے کا اثر ہوتا ہے، انہیں علاج کی نیت سے استعمال کیا، لیکن اچانک اس سے نشہ آگیا اوراسی حالت میں طلاق دے دی تو اکثر فقہاء کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوتی، لیکن اس نشے کی تعریف کیا ہے یا نشے کا کون سا درجہ مراد ہے؟ امام ابو حنیفہؒ کے حوالے سے "سکران" سے مراد وہ شخص ہے جس کی عقل اتنی زائل ہو چکی ہو کہ اسے زمین و آسمان یا مرد و عورت میں تمیز باقی نہ رہے، جبکہ صاحبین کے مطابق نشے کی حالت وہ کیفیت ہے جس میں آدمی بے ربط اور بے معقول باتیں کرتا ہو۔ اس مسئلے میں اکثر مشائخ حنفیہ نے صاحبین کے قول کو اختیار کیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

((ومال أكثرالمشايخ إلى قولهما،وهوقول الأئمةالثلاثة،واختاروه للفتوى،لأنه المتعارف،وتأيد بقول علي ؓ:إذاسكر هذى--- وبه ظهر أن المختار قولهما في جميع الأبواب فافهم))۔[2]

دوسرے علامہ شامیؒ نے ابن الہمامؒ[3] سے نقل کیا ہے کہ امام صاحبؒ نے جو نشے کیلئے یہ شرط رکھی ہے کہ زمین و آسمان کی تمیز نہ رہے، اسکا مطلب وہ نشہ ہے جسکی وجہ سے حد واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر نشہ کم درجے کا ہو تو شبہ پیدا ہو سکتا ہے، اور شبہ کی بنیاد پر حد ساقط ہو جاتی ہے۔ جہاں تک دیگر احکام کا تعلق ہے، جیسے اسکے تصرفات کا نفاذ نہ ہونا، تو امام صاحبؒ کے نزدیک بھی نشے کی وہی تعریف ہے جو صاحبین کے مطابق ہے۔۔ ابن الہمامؒ کے الفاظ یہ ہیں:

((وأما تعريفه عنده في غير وجوب الحد من الأحكام فالمعتبر فيه عنده اختلاط الكلام والهذيان كقولهما))۔

پچھلی عبارت میں جو اکثر مشائخ کی دلیل میں کہا گیا تھا "لأنه المتعارف" اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی شخص کے نشے میں ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار عرف پر مبنی ہوتا ہے۔ عرفاً جس شخص کو نشے میں سمجھا جائے، وہ شرعاً بھی سکران شمار ہو گا۔ یہی بات شافعیہؒ کے امام نوویؒ نے تفصیل سے بحث کے بعد نقل کی ہے اور اسے اقرب قرار دیا ہے۔[4]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طلاق کے عدم وقوع کے لیے زوالِ عقل کا یہ درجہ ضروری نہیں ہے کہ شخص کو اپنی ذات، ماحول یا کہی گئی باتوں کا ہوش نہ ہو، بلکہ یہ کافی ہے کہ وہ اپنی گفتگو پر قابو نہ رکھ سکے۔

---

[1] ابن عابدین، حاشیۃ ابن عابدین، ج3 ص243

[2] أيضاً، ج3 ص239

[3] ۔ابن ہمام (پیدائش:1388ء—وفات:29جولائی1457ء) فقہ حنفی کے معروف مصنف صاحب فتح القدیر ہیں۔ محمد بن عبد الواحد بن عبد الحمید ابن مسعود، السیواسی الاسکندری، کمال الدین، المعروف ابن الہمام۔ ابن ہمام کی پیدائش 790ھ بمطابق 1388ء اسکندریہ میں ہوئی۔(شمس الدين السخاوي، الضوء اللامع لأهل القرن التاسع الهجري .بيروت: دار الجيل، 1992، ج9، ص215-217۔)

[4] روضة الطالبين: 8/63

3۔نابالغ بچے کی طلاق

حنفیہ اور دیگر کئی فقہاء کے ہاں نابالغ کی طلاق بھی واقع نہیں ہوتی، اگرچہ وہ قریب البلوغ ہو یا صبی ممیز ہو یعنی اسے طلاق وغیرہ ایسے تصرفات کی سمجھ ہو، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ابن الہامؒ لکھتے ہیں:

((معلوم من كليات الشريعة أن التصرفات لا تنفذ إلا ممن له أهلية التصرف وأدرناها بالعقل والبلوغ خصوصا ما هو دائر بين الضرر والنفع خصوصا ما لا يحل إلا لانتفاء مصلحة ضده القائم كالطلاق فإنه يستدعي تمام العقل ليحكم به التمييز في ذلك الأمر، ولم يكف عقل الصبي العاقل؛لأنه لم يبلغ الاعتدال---))۔[1]

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کے لیے صرف عقل یا ہوش و حواس کا موجود ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ "تمام العقل" کا ہونا ضروری ہے، یعنی ایسی ذہنی حالت کا ہونا جس میں وہ شخص تصرف کرنے سے پہلے اور لفظ زبان سے نکالنے سے قبل اس عمل کے ممکنہ نفع و نقصان کا موازنہ کرنے کی پوزیشن میں ہو۔۔

4۔غصے کی حالت میں طلاق

علامہ شامیؒ نے رد المحتار میں "طلاق المدھوش" اور "طلاق الغضبان" پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ شامیؒ نے ابن القیمؒ کے رسالے "طلاق الغضبان" کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ، غصے کی تین مختلف حالتیں ہیں: پہلی حالت وہ ہے جس میں آدمی کو اپنے الفاظ کا مکمل شعور ہوتا ہے اور وہ ارادے سے بات کرتا ہے، تو ایسی حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ دوسری حالت وہ ہے جس میں غصے کے شدت سے آدمی کو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور الفاظ بغیر ارادے کے اسکے منہ سے نکلتے ہیں، تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔ تیسری حالت ان دونوں کے درمیان ہے، جہاں طلاق کا حکم محتاط طور پر دیکھا جاتا ہے، مگر دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی طلاق کے واقع نہ ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

ابن القیمؒ کے حوالے سے مذکورہ بالا تفصیل ذکر کرنے کے بعد علامہ شامیؒ نے اس پر اٹھائے گئے اشکالات کا جواب دیتے ہوئے ابن القیمؒ کی رائے کی طرف رجحان ظاہر کیا ہے کہ "مدھوش" اور "غضبان" کے بارے میں فقہاء کی مثالوں اور وضاحتوں سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ طلاق کے وقوع کیلئے عقل کا ایک مخصوص درجہ ضروری ہے۔ صرف علم اور ارادے کی موجودگی کافی نہیں، بلکہ تصرف سمجھ بوجھ کی حالت میں ہونا چاہیے۔ سمجھ بوجھ سے مراد یہ نہیں کہ وہ تمام نتائج پر غور کرے، بلکہ اتنا کہ وہ اپنی عقل استعمال کرنے کے قابل ہو۔ اگر ذہنی حالت نارمل ہو اور وہ بغیر سوچے طلاق دے، تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ تاہم اگر کوئی ایسا عارضہ لاحق ہے جسکی وجہ سے اس کی ذہنی حالت غیر عادی اور ابنارمل ہو گئی ہے اور وہ سمجھ بوجھ کر بات نہیں کر سکتا جیسے سکران (بسبب جائز) مدھوش، معتوہ، مجنون اور نائم وغیرہ میں ہوتا ہے یا اس کی سمجھ بوجھ شریعت کی نظر میں ابھی نشوونما کے مراحل میں ہے، جیسے نابالغ میں ہوتا ہے تو طلاق واقع نہیں ہو گی۔

---

[1] ابن الھمام، کمال الدین، فتح القدیر: 3/ 487

حاصل یہ ہے کہ طلاق کے وقوع کے لیے ضروری ہے کہ طلاق دینے والا شرعی طور پر عقل کی تکمیل (بلوغ) کے بعد اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہو، چاہے وہ عملاً اسے استعمال کرے یا نہ کرے۔ دوسرے الفاظ میں، اس کی ذہنی حالت اس کے قابو میں ہونی چاہیے۔ حدیث کے الفاظ "المعتوہ المغلوب علی عقلہ"[1] کا مفہوم بھی یہی ہے، کیونکہ حدیث میں جسے طلاق کے وقوع سے مستثنیٰ کیا جا رہا ہے وہ مفقود العقل نہیں، بلکہ مغلوب العقل ہے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد سرخسیؒ کی ایک عبارت ہے جس میں وہ نشے کی حقیقت بیان کرتے ہیں:

((لأن بالسکر لایزول عقلہ إنما یعجز عن استعمالہ لغلبۃ السرورعلیہ))۔[2]

اس میں بالکل وہی بات کہی گئی ہے جو اوپر فقہاء کے ذکر کردہ متفرق احکام سے اخذ کی گئی تھی۔

یہ بات مسلم ہے کہ اگر نشہ کسی حرام سبب سے نہ ہو تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کے عدم وقوع کے لیے عقل کے مکمل زوال کی شرط نہیں، بلکہ عقل کے استعمال سے معذوری کافی ہے۔ مدہوش اور غضبان کی طلاق کے عدم وقوع کے لیے یہ لازم نہیں کہ بدحواسی اس حد تک ہو کہ انہیں اپنے الفاظ کا شعور نہ رہے، بلکہ غلبۂ ہذیان اور سنجیدہ وغیر سنجیدہ گفتگو کا امتزاج ہی کافی ہے۔

علامہ شامیؒ نے اس موقف کی تائید میں "سکران" (جبکہ نشہ کسی حرام سبب سے نہ ہو) کی مثال دی ہے کہ حنفیہ کے مفتی بہ قول کے مطابق نشے کا یہ درجہ کافی ہے۔ مزید وضاحت میں انہوں نے بیان کیا کہ اگر مدہوش، غضبان یا سکران اپنی گفتگو کو سمجھتے ہوں اور قصداً بات کر رہے ہوں، لیکن ان کی عمومی گفتگو سے عقل کا اختلال ظاہر ہو، تو بھی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ سمجھ بوجھ کے فقدان کی وجہ سے ان کا قصد و ارادہ شرعاً غیر معتبر ہے، جیسا کہ صبی ممیز کی حالت میں ہوتا ہے۔ وہ قصداً طلاق دیتا ہے، لیکن مکمل سمجھ بوجھ نہ ہونے کی بنا پر اس کی طلاق نافذ نہیں ہوتی۔ علامہ شامیؒ کی بحث کے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

((والذی یظہر لی أن کلامن المدھوش والغضبان لایلزم فیہ أن یکون بحیث لایعلم مایقول، بل یکتفی فیہ بغلبۃالھذیان واختلاط الجدبالھزل کماھو المفتی بہ فی السکران علی مامر))۔[3]

وہ مزید لکھتے ہیں:

((والذی ینبغی التعویل علیہ فی المدھوش ونحوہ إناطۃ الحکم بغلبۃ الخلل فی أقوالہ وأفعالہ الخارجۃعن عادتہ،وکذا یقال فیمن اختل عقلہ لکبر أو مرض أو لمصیبۃ فاجأتہ: فما دام فی حال غلبۃ الخلل فی الأقوال والأفعال لاتعتبر أقوالہ وإن کان یعلمھا ویریدھا، لأن ہذہ المعرفۃ والإرداۃ غیر معتبرۃ لعدم حصولھا عن الإدراک صحیح کما لا تعتبر من الصبی العاقل))۔[4]

---

[1] سنن الترمذي، كتاب الطلاق، باب ماجاء في طلاق الثلاث، ج3، ص496، رقم الحديث: 1191۔

[2] السرخسي، شمس الدين أبو بكر محمد بن أبي سهل، المبسوط (بيروت: دار الفكر للطباعة والنشر، 2000م)، 6/315-316

[3] ۔، رد المحتار: 3/244

[4] ۔ رد المحتار: 3/244

5۔ذہنی مریض کی طلاق

مذکورہ تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتاہے کہ ان افراد کی طلاق کا حکم بھی واضح ہو جاتا ہے جوڈپریشن یا دیگر نفسیاتی بیماریوں کے دوران طلاق دے دیتے ہیں۔ آج کل نفسیاتی امراض عام ہیں، اور اکثر ان کا تعلق ازدواجی یا خاندانی مسائل سے ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات دیگر عوامل بھی ان کی وجہ بنتے ہیں، لیکن اکثر یہ نفسیاتی دباؤ گھریلو معاملات پر ہی اثرانداز ہوتا ہے، اور مریض اسی دائرے میں اپنا غصہ یا اشتعال نکالتا ہے۔

ایسے حالات میں جب مریض کسی نفسیاتی دباؤ یا دورے کی شدت کے دوران طلاق دیتا ہے، تو غالب امکان ہے کہ وہ غیر معمولی حالت میں ہو۔ اس صورت میں، جیسا کہ مذکورہ تفصیل اور علامہ شامیؒ کی عبارت "وکذا یقال فیمن اختل عقلہ لکبر أو مرض أو لمصیبۃ فاجأتہ "سے مستفاد ہوتا ہے، ایسی طلاق واقع نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ نفسیاتی عدم استحکام کے سبب عقل اور ارادے کی وہ حالت موجود نہیں ہوتی جو طلاق کے وقوع کے لیے شرعاً ضروری ہے۔

آج کل یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ طلاق دینے والا بعض اوقات واقعی نفسیاتی مریض ہوتا ہے اور کسی ماہر نفسیات کے زیر علاج ہوتا ہے۔ اس کے معالج کی اس بات پر تصدیق بھی ہوتی ہے کہ مریض کی بیماری اس درجے کی ہے کہ کسی ناخوشگوار بات یا واقعے پر اس کی ذہنی حالت قابو سے باہر ہو سکتی ہے، اور وہ بغیر کسی سوچ سمجھ کے جو کچھ منہ میں آئے، کہہ دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کو استعمال کرنا اس کے قابو میں نہیں ہوتا۔

اس کے باوجود، اکثر ایسے افراد کی طلاق کے وقوع کا فتویٰ دے دیا جاتا ہے، جو کہ مذکورہ اصولی تفصیل کے مطابق درست معلوم نہیں ہوتا۔ فقہی اصول یہ ہے کہ طلاق کے وقوع کیلئے عقل کا ایسادرجہ لازم ہے جو تصرفات پر قابو اور ارادے کے مکمل اختیار کو ظاہر کرے۔ نفسیاتی مریض کی ایسی حالت میں طلاق کو نافذ ماننا شرعی اصولوں اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

البتہ یہ الگ معاملہ ہے کہ طلاق دینے والا یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کے طلاق دینے کے وقت یہی کیفیت تھی تو کب اس کی بات تسلیم کی جائے گی، کب نہیں، بہر حال اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ پہلے سے اس طرح کا مریض چلا آرہاہے تو اس کی یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے۔

اس تفصیل کے بعد اب ہم آتے ہیں اصل مسئلے کی طرف، یعنی نشے کی حالت میں دی گئی طلاق کا حکم کیا ہے، تو اس سلسلے میں پہلے فقہاء کے مذاہب پر نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حنفیہ کے معروف اور مفتی بہ قول کے مطابق، اگر نشہ ایسے سبب سے ہو جو معصیت کا سبب نہ ہو، تو سکران کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ تاہم، اگر نشہ کسی معصیت کی وجہ سے ہو، جیسے کہ خمر (شراب)، تو ایسی حالت میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی۔

جہاں تک دیگر ناجائز نشوں کا تعلق ہے، جیسے بھنگ، افیون، یا غیر مائع نشہ آور چیزیں (مثلاً یوا ہ)، ان کے بارے میں فقہاء کے اقوال میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم، متأخرین کا عمومی رجحان یہ ہے کہ ان چیزوں کے نشے کی حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، بشر طیکہ ان کا استعمال بطور دوا نہ ہو۔ اگر ان اشیاء کو دوا کے طور پر استعمال کیا جائے تو طلاق کا حکم مختلف ہو سکتا ہے۔

فقہ حنفیہ کے مشہور فقیہ طحاویؒ اور کرخیؒ[1] نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ کسی بھی قسم کے نشے کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہو گی۔ امام زفرؒ اور محمد بن سلمہؒ کا بھی یہی مذہب نقل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، علامہ علاؤالدین شامیؒ کی ایک عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حسن بن زیادؒ کا بھی یہی مذہب تھا۔[2] امام غزالیؒ نے الوسیط میں امام ابویوسفؒ کا مذہب بھی یہی نقل کیا ہے،[3] تاتارخانیہ میں بعض کتب سے اس کا مفتی بہ قول ہونا بھی نقل کیا ہے، لیکن شامیؒ نے اسے عام متون کے خلاف قرار دیا ہے۔

مالکیہ کے بعض علماء کے نزدیک نشے کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی، تاہم امام مالکؒ کی تصریح کے مطابق مالکیہ میں معروف رائے یہ ہے کہ نشے کی حالت میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس مسئلے پر مالکیہ میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ طلاق کے وقوع کی اصل وجہ کیا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ چونکہ نشے کی حالت میں عقل مکمل طور پر زائل نہیں ہوتی بلکہ کچھ نہ کچھ باقی رہتی ہے، اس لیے اس شخص کا تصرف نافذ ہو گا۔ اس قول کے مطابق، اگر نشہ اپنی انتہاء کو پہنچ جائے اور عقل بالکل زائل ہو جائے، تو طلاق واقع نہیں ہو گی۔ اس توجیہ کے مطابق مالکیہ اور حنفیہ کے نظریات میں بنیادی اختلاف ہو گا، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک طلاق کے عدم نفاذ کے لیے عقل کا زائل ہونا ضروری نہیں، بلکہ عقل کا مغلوب ہونا کافی ہے۔ دوسری توجیہ مالکیہ میں یہ ہے کہ چونکہ نشہ کرنے والا اپنے اختیار سے حرام سبب سے اپنی ذہنی حالت کو تبدیل کرتا ہے، اس لیے اس کا تصرف معتبر نہیں ہوتا، اور اس پر ہوش و حواس والے شخص کے احکام لاگو ہوں گے۔ اس توجیہ کے مطابق، اگر نشہ اپنی انتہاء کو پہنچ جائے، تو اسکی طلاق واقع ہو جائے گی۔[4]

اگر شافعیہ کے ہاں نشہ کسی ایسے سبب سے ہو جس میں شخص کی تعدّی اور غلطی نہ ہو، تو بالاتفاق طلاق واقع

---

[1] ۔ ابوالحسن کرخی یہ حنفی فقیہ اور عراق میں حنفیہ کے امام و شیخ ہیں۔ عبید اللہ کرخی سے بھی معروف ہیں۔ پورا نام عبید اللہ ابن الحسین بن دلال بن دلہم المکنی الکرخی ہے۔ فقہ حنفی کے معتبر ائمہ میں سے ہیں۔ پورا نام عبید اللہ ابن الحسین بن دلال بن دلہم المکنی الکرخی ہے۔ فقہ حنفی کے معتبر ائمہ میں سے ہیں۔ ان کی وفات بغداد (340ھ بمطابق 951ء) میں ہوئی۔ (ابن خلکان، احمد بن محمد۔ وفیات الأعیان وأنباء أبناء الزمان . تحقیق: احسان عباس۔ بیروت: دار صادر، 1994، ج3، ص10)

[2] تکملة حاشیة رد المحتار: 8/ 197

[3] الغزالي، أبو حامد محمد بن محمد، الوسیط في المذهب (القاهرة: دار السلام، 1417ھ)، 5/ 390

[4] أبو البركات أحمد بن محمد العدوي، الشهير بالدردير و الشرح الكبير: ج2، ص365؛ محمد بن یوسف بن أبي القاسم العبدري أبو عبد الله، التاج والإكليل لمختصر خليل (بیروت: دار الفكر، 1398ھ): ج4 ص43

نہیں ہو گی۔ تاہم، اگر نشہ کسی ناجائز سبب سے ہو، تو امام شافعیؒ کے اس مسئلے میں دو مختلف اقوال ہیں: ایک یہ کہ طلاق واقع نہیں ہو گی، دوسرا یہ کہ طلاق واقع ہو جائے گی۔ پہلے قول کو "قول قدیم" قرار دیا گیا ہے، جسے ابو ثور، مزنی، ابو سہل اور ابو طاہر الزیادی[1] نے اختیار کیا، اور امام غزالیؒ نے اسے ترجیح دی۔ دوسرے قول کو "قول جدید" کہا گیا ہے، اور زیادہ تر شافعی علماء نے اسی کو اپنایا ہے۔

سکران (نشے) کے بارے میں مرداوی نے "الإنصاف" میں امام احمدؒ سے پانچ مختلف روایتیں ذکر کی ہیں، جن میں سے تین کے مطابق طلاق واقع نہیں ہو گی، اور دو کے مطابق طلاق واقع ہو جائے گی۔ ترجیحی مسئلے میں بھی حنبلیوں کے اقوال مختلف ہیں۔

صحابہ و تابعین میں سے سعید بن المسیب، حسن بصری، ابراہیم نخعی، زہری اور شعبی وغیرہ وقوعِ طلاق کے قائل ہیں، اور حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح کا فیصلہ نقل کیا جاتا ہے۔ تاہم، حضرت عثمانؓ سے سندِ صحیح کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ طلاق واقع نہیں ہو گی، اور یہی رائے قاسم بن محمد، طاؤس، عکرمہ، عطا اور ابو الشعثاء وغیرہ سے منقول ہے۔ عمر بن عبد العزیزؒ پہلے طلاق کے واقع ہونے کے قائل تھے، لیکن بعد میں رجوع کر کے انہوں نے طلاق کے عدم وقوع کے موقف کو اختیار کیا۔

جو حضرات طلاق سمیت سکران کے اقوال کو معتبر اور نافذ مانتے ہیں، ان حضرات نے اس مسئلے پر کوئی واضح نص پیش نہیں کی۔ جو نصوص پیش کی گئی ہیں، وہ ان حضرات کیلئے مفید ہو سکتی ہیں جو مطلقاً نشے کی حالت کو اہلیت میں کمی کا سبب نہ مانتے ہوں، کیونکہ ان میں عقل بالکلیہ زائل نہیں ہوتی، خواہ نشہ جائز سبب سے ہو، مثلاً قرآنی آیت:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ تَقْرَبُوا الصَّلاَةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى ﴾[2]

بعض فقہائے حنفیہ نے بھی اس مسئلے پر استدلال کیا ہے، تاہم قطع نظر اس بات کے کہ یہ استدلال کس حد تک واضح ہے، اس پر یہ اشکال باقی رہتا ہے کہ یہ آیت اس دور میں نازل ہوئی تھی جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس آیت سے جو اصول اخذ کیا گیا ہے، اس کا اطلاق جائز نشے کی حالت پر بھی ہونا چاہیے۔ تاہم، حنفیہ کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔

دوسری طرف، جن حضرات کے نزدیک نشے کی حالت میں اقوال نافذ اور معتبر نہیں ہیں، ان کا ایک اہم استدلال ماعز اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے واقعات سے ہے۔ جب ماعز رضی اللہ عنہ نے اقرار کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ کیا انہوں نے شراب پی ہوئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نشے کی حالت میں کیا گیا اقرار

---

[1] ۔ ابو طاہر محمد بن محمد بن محمش بن علی بن داؤد زیادی (317ھ–410ھ بمطابق 929ء–1019ء، اپنے زمانے کے محدثین اور فقہاء کے امام، اور شافعیہ میں مجتہدین میں شامل اصحابِ وجوہ میں سے تھے (الذهبي، شمس الدين . سير أعـلام النبلاء . بیروت: مؤسسة الرسالة، 1996، ج17، ص233۔)

[2] ۔ النساء:43

معتبر نہیں ہوتا۔ تاہم، یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدود شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، اور نشے کی حالت میں اقرار بھی شبہ سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے اس اقرار کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود، حدیث کے الفاظ "المعتوة المغلوب علی عقلہ" کا عموم ان حضرات کی اہم دلیل ہے، جو کہتے ہیں کہ اس میں اس بات کی وجہ سے فرق نہیں کیا گیا کہ یہ غلبۂ عقل جائز سبب سے ہو یا ناجائز سے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو حضرات حرام نشے کی حالت میں وقوعِ طلاق کے قائل ہیں، بالخصوص حنفیہ اور شافعیہ، ان کا مذہب کسی نص صریح پر مبنی نہیں ہے، بلکہ یہ رائے قیاس اور اصولوں پر بھی قائم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک طلاق کے نفاذ کے لیے جنون کی حالت کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ عقل کا مغلوب ہونا کافی ہے، اور یہ حالت نشے میں پائی جاتی ہے۔ اس بات کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ اگر نشہ جائز سبب سے ہو تو ان حضرات کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوتی۔

اگرچہ بعض حنفیہ نے حرام نشے کی حالت میں طلاق کے وقوع پر اصول سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم ان استدلالات پر ایک عمومی اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دلائل کے مطابق حلال نشے کی حالت میں بھی طلاق واقع نہیں ہونی چاہیے۔

ناجائز نشے میں دی گئی طلاق کے واقع ہونے کی اصل وجہ وہی ہے جو تقریباً تمام فقہائے حنفیہ اور شافعیہ نے ذکر کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ نشے کی حالت بذاتِ خود طلاق کے وقوع کا مانع ہے، لیکن یہاں یہ مانعیت اس لیے اثر انداز نہیں ہو گی کہ یہ حالت خود معصیت کے راستے سے پیدا کی گئی ہے۔ گویا نہ صرف یہ کہ وقوعِ طلاق کا فتویٰ اصول کے مطابق نہیں ہے، بلکہ یہ فتویٰ ایک اصول کی تاثیر کو نظر انداز کرتے ہوئے خلافِ قیاس دیا گیا ہے۔

نشے کی حالت زوالِ اہلیتِ طلاق کا ایک سبب ہے، لیکن یہاں معصیت کے راستے سے اس حالت کا پیدا ہونا اس سبب کے اثر کو مرتب نہیں ہونے دیتا۔ اس سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ کوئی اصول ہے کہ معصیت کسی سبب کی تاثیر میں رکاوٹ بن جاتی ہے؟ کم از کم حنفیہ کے ہاں عموماً ایسا نہیں ہوتا، اور اس کی ایک واضح مثال سفر معصیت میں قصر، حالتِ حیض میں طلاق، اکٹھی تین طلاقیں اور ارضِ مغصوبہ میں نماز وغیرہ ہیں۔ اسی طرح غصب اور دیگر کئی مسائل میں بھی اس کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہی اعتراض حافظ ابن حجرؒ نے امام طحاویؒ کے وقوعِ طلاق کے قائلین پر نقل کیا ہے۔[1] اگر بغور دیکھا جائے تو وقوعِ طلاق کے قائلین کو امام طحاویؒ کی بات کی معقولیت سے بظاہر انکار نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ وقوعِ طلاق کے قائلین پر یہ اعتراض تب ہوتا جب وہ یہ کہتے کہ وقوعِ طلاق کا فیصلہ اصول، قواعد یا قیاس کی بنیاد پر ہے، حالانکہ ان حضرات کا منشا ہرگز ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ ان حضرات نے جو الفاظ

[1] حافظ ابن حجر، فتح الباری:9/193

استعمال کیے ہیں، وہ عموماً دو نوعیت کے ہوتے ہیں: ایک تغلیظ کا، دوسرے زجر کا۔ تغلیظ کا معنی یہ ہے کہ اگرچہ وہ اصولی طور پر اس "رعایت" کے مستحق تھے کہ ان کی طلاق واقع نہ ہو، لیکن ان کے غلط طریقِ کار کی وجہ سے بطورِ سزا یہ رعایت انہیں نہیں دی جائے گی۔ زجر کا معنی یہ ہے کہ جب نشے کی حالت میں دی گئی طلاق نافذ کر دی جائے گی، تو یہ نہ صرف اس شخص کو بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی آئندہ نشہ کرنے سے گریز کرنے کی ترغیب دے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کم از کم حنفیہ کے ہاں وقوعِ طلاق کا حکم محض انتظامی نوعیت کا ہے، نہ کہ اصولی یا منصوص۔ مذکورہ بالا بحث کا مقصد دلائل کے اعتبار سے کسی قول کو راجح یا مرجوح قرار دینا نہیں ہے، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ وقوعِ طلاق کے قائلین کا اصل منشا کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کو حکمِ انتظامی نہ قرار دیا جائے تو اشکالات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ انتظامی نوعیت کے حکم کا انحصار حالات پر بھی ہوتا ہے، جیسے سدِّ ذرائع وغیرہ پر مبنی احکام میں ہوتا ہے۔ اس لیے حالات کی تبدیلی کی صورت میں ایسے احکام میں بھی تبدیلی ہو سکتی ہے۔

آج کے حالات کے پیشِ نظر نشے کی حالت میں دی گئی طلاق کا فتویٰ کئی وجوہ سے نظرِ ثانی کا محتاج معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

1۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، بیشتر فقہاء بالخصوص فقہائے حنفیہ نے سکران کی طلاق کو "تغلیظاً"، "عقوبۃً" اور "تشدیداً" نافذ قرار دیا ہے۔ اس مسئلے میں فقہاء کی عبارات اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ "تغلیظ"، "تشدید" اور "عقوبت" اسی شخص پر ہونی چاہیے جس سے معصیت کا صدور ہوا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان فقہاء کے پیشِ نظر عموماً وہ صورتیں تھیں جن میں وقوعِ طلاق کا نقصان خاوند کو ہوتا ہے، جب کہ ہمارے زمانے میں، بالخصوص برصغیر کے سماجی حالات میں، عموماً طلاق کے اثرات بد مرد سے کہیں زیادہ بیوی اور اس کے بچوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک کے کیے کی سزا دوسروں کو دینا، جبکہ جس حکم کے ذریعے سزا دی جا رہی ہے وہ غیر منصوص ہو، اور نص (المغلوب علی عقلہ) کے عموم اور عام اصول کے بھی خلاف ہو، قرینِ مصلحت اور قرینِ انصاف نہیں ہے۔۔

2۔ فقہاء نے وقوعِ طلاق کی ایک وجہ "زجر" بیان کی ہے، لیکن اول تو ہمارے زمانے میں یہ سوال اہم ہے کہ وقوعِ طلاق کے فتوے سے یہ مقصد حاصل ہو رہا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ حکم ایک مصلحت کے حصول یا ایک مفسدہ کے ازالے کے لیے ہے، یعنی لوگوں کو نشے سے بچانا۔ نشہ بھی ایک مفسدہ ہے اور طلاق بھی ایک مفسدہ ہے، جسے "ابغض الحلال" قرار دیا گیا ہے، اور حدیث شریف میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس اپنے اس چیلے کو زیادہ شاباش دیتا ہے جو زوجین میں تفریق کر کے آتا ہو۔ بالخصوص ہمارے ماحول میں اس کے مفاسد پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ معاشی تنگی، مفاد پرستی اور خود غرضی کے ماحول کی وجہ سے بیوی اور بچوں کی کفالت کے بے شمار

مسائل پیدا ہوتے ہیں، اور بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل اس سے بھی سنگین ہیں۔ ان حالات میں وقوعِ طلاق اور عدمِ وقوع دونوں پر مرتب ہونے والے مفاسد کے توازن کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے پر از سرِ نو غور کی ضرورت ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عموماً وقوعِ طلاق کے مفاسد اس متوقع فائدے (زجر عن السکر) سے زیادہ ہیں۔ نیز، زجر کا فائدہ محتمل ہے، اور وقوعِ طلاق کے مفاسد یقینی ہیں، اس لیے ہمارے زمانے میں عدمِ وقوعِ طلاق کا فتویٰ ہی انسب معلوم ہوتا ہے۔

3۔ یوں لگتا ہے کہ سکران کی طلاق واقع کرنے میں فقہاء کے پیشِ نظر احتیاط کا پہلو بھی تھا، چنانچہ شہد یا اناج سے بنے ہوئے نبیذ مسکر پر بحث کرتے ہوئے ابن نجیم بزازیہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:

((المختار فی زماننا لزوم الحد، لأن الفساق یجتمعون علیه، وکذا المختار وقوع الطلاق، لأن الحد یحتال لدرئه والطلاق یحتاط فیه، فلما وجب ما یحتال لأن یقع ما یحتاط أولی))۔[1]

اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق ان احکام میں سے ہے جنہیں فقہاء بطورِ احتیاط بھی ثابت کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ احتیاط کو اسی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب کہ اس پر دیگر مفاسد و مضار مرتب نہ ہو رہے ہوں۔

4۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، سکران کی طلاق واقع ہونے کا حکم منصوص یا اصولی نہیں، بلکہ انتظامی ہے۔ اول تو، لزومِ مفاسد وغیرہ کی وجہ سے دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کی بیسیوں مثالیں فقہاء کے ہاں ملتی ہیں۔ حکم کے انتظامی ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ اور بھی آسان ہو جاتا ہے، اور پھر اس وجہ سے بھی کہ خود حنفیہ میں سے امام زفرؒ، حسن بن زیادؒ، طحاویؒ اور کرخیؒ جیسی شخصیات کی آراء عدمِ وقوع کے بارے میں موجود ہیں۔

مزید بر آں، ہمارے زمانے میں نشہ یا تو غیر مائع چیزوں سے ہوتا ہے یا ایسے مائعات سے جو انگور یا کھجور سے بنے ہوئے نہ ہونے کی وجہ سے اشربہ اربعہ سے خارج ہوتے ہیں۔ ان نشوں کی حالت میں طلاق کے بارے میں مشائخِ حنفیہ کے درمیان مزید اختلاف موجود ہے اور تصحیح میں بھی اختلاف ہے۔ مثلاً، صاحب بحر نے قاضی خان سے عدمِ وقوع کی تصحیح نقل کی ہے۔ اس لیے عدمِ وقوعِ طلاق کا فتویٰ دینے میں کوئی زیادہ خروج عن المذہب بھی نہیں پایا جا رہا ہے۔ اس لیے وقوعِ طلاق والے حکم کی اصل حیثیت اور تعلیل کو اور ہمارے زمانے اور علاقوں کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رجحان اس طرف ہو رہا ہے کہ طلاق واقع نہ ہونے کا فتویٰ دیا جائے۔ البتہ اس میں نشے کی نوعیت کی تفصیل میں جانے سے اور قاضی خان وغیرہ کے قول اختیار کرنے کی صورت میں چونکہ بعض نشوں کی شناعت کم ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام زفرؒ، حسن بن زیادؒ، طحاویؒ اور کرخیؒ جیسے حضرات کی رائے اختیار کرتے ہوئے کہا جائے کہ نشے کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی، قطع نظر نشے کی نوعیت سے۔

---

[1] ۔ الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین، رد المحتار ج3، ص239

سب سے اہم بات یہ ہے کہ خلافتِ عثمانیہ میں جس طرح سول مقدمات کے لیے "مجلۃ الأحکام العدلیۃ" کے نام سے ایک مدون قانون جاری ہوا تھا، اسی طرح اس خلافت کے آخری دور میں خاندانی مسائل کے لیے بھی ایک قانون "قرار حقوق العائلۃ" کے نام سے نافذ ہوا تھا، جس کی تیاری میں اس وقت کے بڑے بڑے علماء شریک ہوئے تھے۔ اس قانون کی دفعہ 104 میں یہی کہا گیا ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی، چاہے نشہ جائز سبب سے ہو یا ناجائز سے۔ اس قانون کی ابتدا میں توضیحی مقدمے میں اس مسئلے پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ اگر خاوند نے نشہ کر کے غلط کام کیا ہے تو اس کی وجہ سے اسے سزا کسی اور طریقے سے بھی دی جا سکتی ہے۔ اس ایک آدمی کی غلطی کی وجہ سے پورا خاندان توڑ دینا درست نہیں ہے۔ جائز اور ناجائز نشے میں فرق خاندان کو ہلاکت کے کنارے پر لے آئے گا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق واقع نہ ہونے کا قول حضرت عثمانؓ سے بھی مروی ہے۔ چنانچہ اس میں ہے:

((ويلزم أن لا يكون ثمة فرق في الطلاق بين أن يكون السكر بالطريق الحرام أو بالطريق المباح. نعم يمكن معاقبة الزوج لارتكابه أمرا محرّما ، ولكن لا مناسبة بين معاقبته على أمر ممنوع وبين إلزامه أثر فعل صدر منه في حال جنون مؤقت لا ينبغي أن يترتب عليه حكمٌ ومحوُ عائلة بسبب ذلك)).

مفقود الخبر کے متعلق شرعی احکام

فقہی اصطلاح میں لا پتہ شخص کو "مفقود الخبر" کہتے ہیں۔ مفقود الخبر سے مراد وہ شخص ہے جس کی زندگی یا موت سے متعلق تلاش کے باوجود کوئی سراغ نہ مل سکے کہ آیا وہ زندہ ہے یا دنیا سے چل بسا ہے؟ امام سرخسی نے مفقود الخبر کی تعریف یوں کی ہے:

((المفقودالرجل يخرج في سفرولايعرف موته ولاحياته ولاموضعه ولايأسره العدوولايستبين موته ولا قتله فهذا مفقود))۔[1]

" مفقود وہ شخص ہوتا ہے جو سفر پر نکلے اور اس کی موت، زندگی اور ٹھکانہ معلوم نہ ہو، نہ اسے دشمن نے پکڑا ہو، نہ اس کی موت یا قتل کا علم ہو۔" مفقود وہ شخص ہوتا ہے جو سفر پر نکلے اور اس کی موت، زندگی اور ٹھکانہ معلوم نہ ہو، نہ اسے دشمن نے پکڑا ہو، نہ اس کی موت یا قتل کا علم ہو۔"

دورِ حاضر میں اکثر یہ صورتحال پیش آتی ہے کہ ملکی یا غیر ملکی ایجنسیاں دہشت گردی کے الزامات یا مشکوک ہونے کی بنیاد پر کسی فرد کو گرفتار کر لیتی ہیں، جس کے بعد طویل عرصے تک اس کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ پرنٹ میڈیا میں روزانہ اس قسم کی خبریں سامنے آتی ہیں، خاص طور پر خیبر پختونخوا، بلوچستان، اور قبائلی علاقوں میں، جہاں کئی افراد دس دس سال سے لا پتہ ہیں، اور ان کی زندگی یا موت کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہوتیں۔ اس پس منظر میں تحقیق کا بنیادی سوال یہ ہے کہ ان لا پتہ افراد کی بیویوں کا کیا شرعی اور قانونی حکم ہوگا؟ کیا انہیں ہمیشہ اپنے شوہر کے لوٹنے کا انتظار کرنا ہوگا، یا پھر تنسیخِ نکاح کے بعد کسی دوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اگر تنسیخِ نکاح ممکن ہے، تو اس کے لیے کیا مدت اور طریقہ کار ہوگا؟ اس مسئلے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ لا پتہ افراد کی بیویوں کے نکاحِ ثانی سے متعلق عوامی شعور اور آگاہی کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیبر پختونخوا، بلوچستان، اور قبائلی علاقوں میں شوہر کی گمشدگی کی صورت میں عورت کے نکاحِ ثانی کو ایک سماجی بدنامی سمجھا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں لا پتہ افراد کی بیویاں ساری زندگی شوہر کے انتظار میں اذیت اور کرب میں گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

مفقود الخبر کے بارے میں اہل علم کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ لا پتہ شخص کو ہم عصر کے زندہ ہونے تک زندہ سمجھا جائے گا۔ جب اس کے ہم عصر مر جائیں گے تو اسے بھی مردہ تصور کیا جائے گا۔ پھر اس کی بیوی عدتِ وفات گزار کر، یعنی چار ماہ دس دن انتظار کر کے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس کے بعد مفقود کا ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ ابراہیم نخعیؒ، حمادؒ، جابر بن زیدؒ، اور امام محمدؒ کی یہی رائے ہے۔ احناف کا اصل مذہب بھی یہی ہے۔[2]

مذکورہ موقف اختیار کرنے میں جو مفاسد ہیں وہ کسی صاحبِ عقل سے مخفی نہیں ہیں۔ جب کسی لڑکی کا خاوند لا پتہ ہو جائے اور لڑکی کی عمر اٹھارہ یا بیس سال ہو، تو اسے 70، 80 یا 90 سال (علیٰ اختلاف الأقوال) اپنے لا پتہ شوہر کے انتظار

[1]۔ شمس الدين أبو بكر محمد بن أبي سهل السرخسي، المبسوط للسرخسي (دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، لبنان، 11/67

[2]۔ فخر الدین، عثمان بن الزیلعی، الحنفی، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق (دار الکتاب الاسلامی، قاہرہ مصر 1313ھ) 3/311

میں گزارنے ہوں گے، تاکہ اس کی موت یقینی ہو جائے۔ تو گویا100 سال (بعض اقوال کے مطابق120 سال) پورے ہونے کے بعد وہ بے چاری عورت کیا شادی کرے گی؟ عصرِ حاضر میں اور بالخصوص پاکستانی سماج میں ان مظلوم خواتین میں سے ایک وہ خواتین ہیں جن کے شوہروں کو دہشت گردی کے الزام میں اٹھایا گیا ہے اور زندگی کا ایک معتد بہ حصہ گزرنے کے بعد بھی ان کی موت یا حیات کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقہ جات میں یہ ایک عیب تصور کیا جاتا ہے کہ اس عورت کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ مفقود الخبر شوہر سے تنسیخِ نکاح کرکے دوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کرلے، جس کے نتیجے میں لاپتہ افراد کی بیویاں علاقائی و معاشرتی روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے پوری زندگی شوہر کے انتظار میں گزار کر غم اور سسکیوں کی ایک داستان رقم کر دیتی ہیں۔

تمام ائمہ سلف لاپتہ شوہر کی بیوی کو کچھ شرائط کے ساتھ نکاحِ ثانی کرنے کی اجازت دیتے ہیں، ان میں اختلاف صرف مدتِ انتظار میں ہے۔ اس لیے ائمہ کے اختلاف کو مد نظر رکھتے ہوئے لاپتہ افراد کی بیویوں کے لیے نکاحِ ثانی، فقہ الواقع کے تناظر میں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح اُن علاقوں میں اس مسئلے سے متعلق عوامی شعور و آگاہی عصری تقاضا ہے، جہاں لاپتہ افراد کی بیویوں کو ملکیت سمجھ کر ان کو نکاحِ ثانی کی اجازت دینا ایک عیب تصور کیا جاتا ہے۔ اس ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس حوالے سے چند معروضات اس مقالے میں پیش کی گئی ہیں:

فقہائے احناف کا قدیم مؤقف

علمائے احناف کے نزدیک لاپتہ شخص کو اسکے ہم عصر افراد کی زندگی تک مال و جائیداد کے معاملات میں زندہ تصور کیا جائے گا۔ جب اس کے تمام ہم عصر وفات پا جائیں، تو اسے بھی قانونی طور پر مردہ شمار کیا جائے گا۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ مدت انتظار کتنی ہو گی جسکے بعد غالب گمان کے مطابق لاپتہ شخص کی موت واقع ہو چکی ہو گی؟ "ہم عصر کی موت" کا اندازہ بعض فقہاء نے ستّر سال، بعض نے80 سال، بعض نے90سال اور بعض نے120 سال لگایا ہے۔ احناف کے ہاں اس سلسلہ میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ شیخ ابوزہرہ نے ستر سال کو ترجیح دی ہے۔ ان کی دلیل محمد ﷺ کی یہ روایت ہے:

((أعمار أمتی ما بین الستین و السبعین)) [1]

میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی۔ صاحب جامع الرموز نے80 سال کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے:

((و علیه الفتوی فی زماننا)) ۔[2]

یعنی ہمارے زمانے میں اس پر فتوی ہے، جب کہ فتاوی عالمگیری میں ان الفاظ کے ساتھ نوے سال کو مفتیٰ بہ قول قرار دیا گیا ہے:

---

[1]۔ محمد أبوزہرہ، الأحوال الشخصیۃ، (دار الفکر العربی، مصر، 1957ء) ص497

[2]۔ شمس الدین محمد القہستانی، الخراسانی، جامع الرموز، شرح مختصر الوقایہ المسمی بالنقایہ (مظہر العجائب کلکتہ، انڈیا1858ء) 576

((وَحُكِمَ بِمَوْتِهِ بِمضِيّ تِسْعِينَ سَنَةً وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى وفي ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ يُقَدَّرُ بِمَوْتِ أَقْرَانِهِ فإذا لم يَبْقَ أَحَدٌ من أَقْرَانِهِ حَيًّا حُكِمَ بِمَوْتِه))۔[1]

ترجمہ: نوے سال گزر جانے کے بعد مفقود کی موت کا فیصلہ کیا جائے گا، اسی قول پر فتوی ہے، اور ظاہر الروایہ کے مطابق ہم عصروں کی موت کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا جب اس کے ہم عصروں میں سے کوئی زندہ نہ رہے تو اس کی موت کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس رائے کی تائید حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس میں وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرکے فرماتے ہیں:

((امْرَأَةُ الْمفْقُودِ امْرَأَتُهُ حَتَّى يَأْتِيَهَا الْبَيَانُ))۔[2]

ترجمہ: مفقود الخبر کی بیوی اس کی بیوی ہے جب تک اس کی (موت اور زندگی کی واضح) خبر نہ ہو جائے۔"

اس روایت کے ایک راوی "سوّار" ہے جو ضعیف ہے[3] اور اس کی وجہ سے اہلِ علم نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔[4]

عقلی اعتبار سے اگر اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو موجودہ دور فتنہ وفساد کا دور ہے، اس دور میں اگر عورت کو 80 / 90 سال تک شوہر کے انتظار میں بغیر نکاح کے رہنے کا حکم دیا جائے تو اس فیصلے سے کئی مفاسد کا اندیشہ ہے۔ ہمارے ملک میں اس حوالے سے قانون سازی تو ہوئی ہے، لیکن سماجی روایات کی وجہ سے ایسی مظلوم خواتین کی گلو خلاصی ممکن نہیں ہے۔ بنابریں اس وقت کی ضرورت ہے کہ ایسی مظلوم خواتین کے لیے آسانی کی راہ نکالی جائے۔ اگر عدالت نہ ہو یا مسلمان جج میسر نہ ہو تو عدالت کی جگہ جرگہ یا پنچائیت کو جج اور عدالت کا قائم مقام مقرر کیا جاسکتا ہے، جس کی وضاحت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فقہ مالکی کے تناظر میں چند شرائط کے ساتھ کی ہے۔[5] وہ لکھتے ہیں:

اگر فیصلہ پنچائیت کے سپرد کیا جائے تو عوام کی پنچائیت کو کوئی اعتبار نہیں۔ نہ معلوم کہاں کہاں قواعد شرعیہ کے خلاف کر بیٹھیں، اس لیے اول چاہیے کہ پنچائیت کے ارکان سب اہلِ علم ہوں، اگر یہ میسر نہ ہو تو کم از کم ایک عالم معاملہ شناس کو پنچائیت میں اسطرح شریک کرلیں کہ اول سے آخر تک جو کچھ بھی کریں اُن سے پوچھ کر کریں۔[6]

مفقود الخبر سے متعلق امام مالکؒ کا معتدل مؤقف

امام مالکؒ نے لاپتہ شوہر کی بیوی کے متعلق یہ فیصلہ دیا ہے کہ وہ خاوند کے لاپتہ ہونے کے بعد جب اپنا مقدمہ

---

[1]-الشيخ نظام وجماعة من علماء الهند / العالمكيرية، الفتاوى الهندية (دار الفكر، سنة النشر 1411ه-- 1991م) 2/300

[2]- أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقي، السنن الكبرى، باب مَنْ قَالَ امْرَأَةُ الْمَفْقُودِ امْرَأَتُهُ حَتَّى يَأْتِيَهَا يَقِينُ وَفَاتِهِ، رقم الحديث: 15973

[3]-وَكَذَلِكَ رَوَاهُ زَكَرِيَّا بْنُ يَحْيَى الْوَاسِطِىُّ عَنْ سَوَّارِ بْنِ مُصْعَبٍ. {ج} وَسَوَّارٌ ضَعِيفٌ. السنن الكبرى وفي ذيله الجوهر النقي ط. الهند (7/445)

[4]محمد ناصر الدين الألباني، صحيح وضعيف الجامع الصغير وزيادته، (المكتب الإسلامي، س ن) 318

[5]مولانا اشرف علی تھانویؒ، الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة (امارت شرعیہ ہند، 2014ء) 51

[6]الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة: 59، 60

عدالت میں لے جائے تو اس وقت سے لے کر چار سال تک اس کی بیوی کو انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ پھر اس کے شوہر کی زندگی اور موت کا کچھ پتہ نہ چلے تو اس کے بعد اس کے اس خاوند کے فوت ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، اس کے بعد وہ عدتِ وفات چار ماہ دس دن گزارے گی، پھر اسے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہو گی۔[1] ابن رشدؒ نے لکھا ہے:

((وَاخْتَلَفُوافِي الْمَفْقُودِالَّذِي تُجْهَلُ حَيَاتُهُ أَوْمَوْتُهُ فِي أَرْضِ الْإِسْلَامِ حكم زواجه وميراثه:فَقَالَ مَالِكٌ يُضْرَبُ لِامْرَأَتِهِ أَجْلٌ أَرْبَعُ سِنِينَ مِنْ يَوْمِ تَرْفَعُ أَمْرَهَا إِلَى الْحَاكِمِ،فَإِذَاانْتَهَى الْكَشْفُ عَنْ حَيَاتِهِ أَوْمَوْتِهِ فَجُهِلَ ذَلِكَ ضَرَبَ لَهَا الْحَاكِمُ الْأَجَلَ،فَإِذَاانْتَهَى اعْتَدَّتْ عِدَّةَالْوَفَاةِأَرْبَعَةَأَشْهُرٍ وَعَشْرًا وَحَلَّتْ))۔[2]

ترجمہ:"اہلِ علم نے لاپتہ شخص کے بارے میں اختلاف کیا جس کی زندگی یا موت کا علم اسلامی ریاست میں نہ ہو، اس کی شادی اور وراثت کا حکم: امام مالکؒ نے کہا:"اس کی بیوی کو اس دن سے چار سال تک مقرر کیا جائے گا جس دن وہ اپنا معاملہ جج کے سامنے پیش کرے گی۔ اور اگر یہ دورانیہ ختم ہو جائے اور اس کی زندگی یا موت کا کوئی پتہ نہ چلے تو جج اس کے لیے مدت مقرر کرے گا اور جب وہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو وہ موت کی عدت چار مہینے اور دس دن گزار کر نکاح سے نکل جائے گی"۔

دراصل امام مالکؒ نے لاپتہ شوہر کے متعلق جو موٴقف اختیار کیا ہے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلے کو بنیاد بنایا ہے۔ ان کے ہاں اس طرح کا ایک معاملہ آیا تو انہوں نے فرمایا:"لاپتہ آدمی کی بیوی چار سال انتظار کرے، پھر شوہر کے فوت ہونے کی عدت گزارے یعنی چار ماہ دس دن، اسکے بعد اگر چاہے تو شادی کرے"۔[3] بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی موٴقف کو اختیار کیا تھا اور اس کے مطابق فیصلہ دیا تھا۔[4]سعید بن المسیبؒ سے روایت ہے:

((أن عمر بن الخطابؓ وعثمان بن عفانؓ قالا في امرأة المفقود : تربص أربع سنين وتعتد أربعة أشهر وعشرا))

ترجمہ:"حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ نے مفقود الخبر شخص کی بیوی کے بارے میں فرمایا: مفقود شخص کی بیوی چار سال تک انتظار کرے گی، اس کے بعد وہ چار ماہ دس دن عدت گزارے گی۔"

متاخرین احناف کا امام مالکؒ کے قول پر فتوی:

متاخرین احناف نے زمانے کے حالات اور وقت کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے امام مالکؒ کے قول کو اختیار کیا، کیونکہ مفقود الخبر شخص کی بیوی کو زندگی بھر نکاح سے محروم رکھنا نہ صرف شدید مشکلات بلکہ متعدد فتنوں کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

((وقدكان بعض أصحابنا يفتون بقول مالك في هذه المسألة للضرورة"))۔[5]

---

[1]،مالک بن أنس بن مالک بن عامر الأصبحي المدني، المدونۃ الکبری (دار صادر، بیروت، لبنان، س ن)4/178

[2]محمد بن أحمد بن محمد بن أحمد بن رشد، بدایۃ المجتہد ونھایۃ المقتصد (دار الحدیث–القاھرۃ،2004م)435

[3]بیہقی، السنن الکبری للبیھقي، بابُ مَن قال: تَنتَظِرُ أربَعَ سِنِینَ ثُمَّ أربعَۃَ أشھُرٍ وعَشرًا، ثُمَّ تَحِلّ، رقم الحدیث:15659

[4]مصنف ابن أبي شیبۃ، کتاب النکاح، باب ومن قال: تعتد وتزوج ولا تربص، رقم الحدیث:113

[5]ابن عابدین، حاشیۃ ابن عابدین (دار الفکر للطباعۃ والنشر. بیروت،2000م)(3/509)

"ہمارے بعض فقہائے کرام ضرورت کے پیش نظر اس مسئلے میں امام مالکؒ کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔"

علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

((قَدْسَمِعْنَاأَنَّ امْرَأَتَهُ تَتَرَبَّص أَرْبَعَ سِنِينَ، وَلَيْسَ ذَلِكَ بِشَيْءٍ هِيَ امْرَأَةٌ أُبْتُلِيَتْ فَلْتَصْبِرْ، وَتَرَبُّص أَرْبَعِ سِنِينَ كَانَ يَقُولُ بِهِ عُمَرُ - رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ"))۔[1]

ترجمہ:"ہم نے سنا ہے کہ مفقود کی بیوی چار سال تک انتظار کرے گی، مگر یہ کچھ نہیں، کیوں کہ وہ عورت آزمائش میں ہے، اسے چاہیے کہ صبر کا دامن تھام لے۔ چار سال کا قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔"

شیخ ابوزہرہ مصریؒ بھی امام مالکؒ کے اس موقف کی حمایت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

((يحكم بموت المفقودالذى يغلب عليه الهلاك بعدأربع سنين من تاريخ فقده))۔

ترجمہ:"وہ مفقود جس کی موت کا غالب گمان ہو، چار سال گزارنے کے بعد اس کی موت کا فیصلہ کیا جائے گا"۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علمائے احناف کے قدیم موٴقف کی سنگینی کو خود حنفی مفکرین نے محسوس کیا اور اس کو متروک قرار دیا، چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایسی "قابلِ رحم عورتوں" کے لیے ایک کتاب "الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة" لکھی۔[2] وہ اس میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقہائے حنفیہ میں سے بعض متاخرین نے وقت کی نزاکت اور فتنوں پر نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں حضرت امام مالکؒ کے مذہب پر فتویٰ دے دیا ہے۔۔۔ اور ایک عرصہ سے اربابِ فتویٰ اہلِ ہندو بیرونِ ہند تقریباً سب نے اس قول پر فتویٰ دینا اختیار کر لیا ہے اور یہ مسئلہ اس وقت ایک حیثیت سے فقہ حنفی ہی میں داخل ہو گیا۔[3]

اسلامی نظریاتی کونسل نے "قانونِ تنسیخ ازدواجِ مسلمانان 1939ء" کی دفعہ 2، شق 1 کے تحت مفقود الخبر کے معاملے کو 12 فروری 1983ء کو ڈاکٹر تنزیل الرحمن کی سربراہی میں زیر بحث لایا، جس کے مطابق:

"خاوند کے چار سال سے مفقود الخبر ہونے کی صورت میں بیوی کو بذریعہ عدالت تفریق کا حق دیا گیا ہے لیکن عدالت کے اس حکم کے نفاذ کو چھے ماہ کی مدت پر موقوف رکھا گیا ہے۔[4] چنانچہ اگر چھے ماہ کی مدت میں خاوند واپس آجائے اور حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر بھی آمادہ ہو تو عدالت کی ڈگری موٴثر نہ ہو گی۔"[5]

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات میں تنسیخ نکاح کی بعض وجوہ:

اسلامی نظریاتی کونسل نے مفقود الخبر کے ضمن میں تنسیخِ نکاح کی بعض وجوہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس حوالے سے "مسلم عائلی قوانین آرڈیننس 1961ء" نظر ثانی وسفارشات" کے ضمیمہ نمبر: 3 میں "تنسیخِ نکاح ایکٹ" کے

---

[1] المبسوط للسرخسي 11/35

[2] (،الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة:29)

[3] الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة، ص:86

[4] چھے ماہ تک موقوف رکھنے کے حوالے سے کتب فقہ میں کوئی قول تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا۔

[5] دسویں سالانہ رپورٹ، مسلم عائلی قوانین، اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد، ص:43

ضمن میں شادی کی تنسیخ کیلئے ڈگری کی وجوہ کا عنوان قائم کرکے لکھا گیا ہے کہ مسلم قوانین کے تحت شادی شدہ عورت مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک یا زیادہ وجوہات کی بناپر شادی کی تنسیخ کیلئے ڈگری حاصل کرنے کی حقدار ہے:

1. اس کے خاوند کا چار سال سے پتہ نہیں چل رہا ہو۔
2. اس کا خاوند کسی معقول وجہ کے بغیر تین سال تک حقوقِ زوجیت ادا کرنے میں ناکام رہا ہو۔
3. اسکا خاوند دو سال سے پاگل پن کا شکار ہو، یا اخلاقی روگ یا شدید قسم کے امراضِ خبیثہ کا شکار ہو۔[1]

لاپتہ شوہر سے آزاد ہونے کا شرعی و قانونی طریقہ کار:

شوہر کے لاپتہ ہونے کی صورت میں، عورت عدالت میں دعویٰ دائر کرے گی۔ اس کے بعد وہ گواہوں کے ذریعے اپنے نکاح کو مفقود شخص سے ثابت کرے گی اور یہ بھی واضح کرے گی کہ اس کا شوہر ایک مخصوص مدت سے لاپتہ ہے اور اس کے نان و نفقہ کا کوئی انتظام موجود نہیں۔ اس حالت میں عدالت عورت کو چار سال انتظار کا حکم دے گی اور اپنے ذرائع سے لاپتہ شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ تلاش کے باوجود نہ مل سکے، تو عدالت نکاح فسخ کرنے کی ڈگری جاری کرے گی۔ اس کے بعد عورت عدت گزارے گی۔ اس بارے میں بدرالدین العینیؒ نے تحریر کیا ہے:

((إذامضى أربع سنين يفرق القاضي بينه وبين امرأته وتعتددة الوفاة ثم تتزوج من شاءت؛لأن عمررَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ هكذاقضى في الذي استهواه الجن بالمدينة))[2]

ترجمہ: "چار سال گزرنے پر قاضی مفقود اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کا فیصلہ کرے گا اس کے بعد بیوی عدتِ وفات گزارے گی۔ پھر جس کے ساتھ چاہے نکاح کر سکتی ہے کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے بارے میں یہ فیصلہ دیا تھا جسے جنات نے اغوا کیا تھا"۔

اس کے بعد یہ عورت آزاد شمار کی جائے گی اور اسے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کی اجازت ہو گی۔ تاہم، اگر عدالت گواہوں کی شہادتوں کے بعد یہ محسوس کرے کہ مزید چار سال انتظار ضروری نہیں، تو نکاح فسخ کرنے کا فیصلہ کم مدت میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تفصیلات اس مضمون کے اختتام پر بیان کی گئی ہیں۔

مفقود الخبر کی واپسی کی صورت میں بیوی کا حکم

سوال یہ ہے کہ اگر مفقود الخبر شخص واپس آجائے اور اس کی بیوی نے قاضی کی اجازت سے دوسرا نکاح کر لیا ہو تو وہ عورت کس کی بیوی سمجھی جائے گی؟ اس حوالے سے اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ وہ عورت مفقود الخبر کی بیوی ہی تصور کی جائے گی۔ تاہم، قاضی مفقود الخبر شخص کو یہ اختیار دے گا کہ وہ اپنی بیوی کو واپس لے لے یا وہ مہر جو اس نے ادا کیا تھا، واپس لے لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کا فیصلہ کیا تھا اور سعید بن المسیبؒ نے حضرت عثمان

[1] مسلم عائلی قوانین آرڈیننس 1961ء، نظر ثانی و سفارشات، اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد، ص:19

[2] البنایۃ شرح الھدایۃ 7/ 362

رضی اللہ عنہ کی اسی رائے کو نقل کیا ہے۔ امام سرخسیؒ نے مبسوط میں اس کا ذکر کیا ہے:

((فَإِنَّهُ كَانَ يَقُولُ تُرَدُّإِلَى زَوْجِهَا الْأَوَّلِ، وَيُفَرَّقُ بَيْنَهَا وَبَيْنَ الْآخَرِ،وَلَهَاالْمَهْرُبِمَااسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا، وَ لَايَقْرَبُهَا الْأَوَّلُ حَتَّى تَنْقَضِيَ عِدَّتُهَامِنْ الْآخَرِ وَبِهَذَا كَانَ يَأْخُذُ إبْرَاهِيمُ-رَحِمَهُ اللَّهُ - فَيَقُولُ: قَوْلُ عَلِيٍّ-رضی اللہ عنہ-أَحَبُّ إلَيَّ مِنْ قَوْلِ عُمَرَ-؟-،وَبِهِ نَأْخُذُأَيْضًا؛لِأَنَّهُ تَبَيَّنَ أَنَّهَاتَزَوَّجَتْ،وَهِيَ مَنْكُوحَةٌ وَمَنْكُوحَةُ الْغَيْرِ لَيْسَتْ مِنْ الْمُحَلَّلَاتِ بَلْ هِيَ مِنْ الْمُحَرَّمَاتِ فِي حَقِّ سَائِرِ النَّاسِ كَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنْ النِّسَاءِ﴾"۔[1]

”ترجمہ: "اسے (اس عورت کو) پہلے شوہر کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور اس کے اور اس کے دوسرے شوہر کے درمیان تفریق کی جائے گی۔ جماع کی وجہ سے وہ اس دوسرے شوہر سے مہر کی حقدار ہے اور جب تک عدت نہ گزارے تو پہلا خاوند اس کے ساتھ ہمبستری نہیں کرے گا۔ اس قول کو ابراہیم رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے زیادہ پسند ہے۔ (علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ) یہی ہمارا بھی مذہب ہے کیونکہ یہ بات واضح ہوئی کہ اس نے نکاح کیا اور وہ منکوحۃ الغیر تھی اور منکوحۃ الغیر حلال نہیں ہے، بلکہ وہ تمام لوگوں کے لیے محرمات میں سے ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور شوہر والی عورتیں (تم پر حرام کی گئی ہیں)"۔

مفقود الخبر شخص کی بیوی کو دوسرے نکاح کی اجازت اس بنیاد پر دی گئی تھی کہ "شوہرِ اول "فوت ہو چکا ہے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ شوہرِ اول زندہ ہے تو بنیاد ہی منہدم ہو گئی۔ اس لیے فقہائے احناف نے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دیا۔ حنفی مکتبِ فکر کے مشہور مصری فقیہ شیخ ابوزہرہؒ اس تناظر میں لکھتے ہیں:

((إذاجاءالمفقودأولم يجئي،وتبين أنه حى،فزوجته له مالم يتمتع الثانى بهاغيرعالم بحياة الأول فإن تمتع بها الثانى غير عالم بحياته كانت للثانى مالم يكن عقده فى عدة وفاة الأول))۔[2]

"اگر گمشدہ شخص آیا یا نہیں آیا اور یہ واضح ہو گیا کہ وہ زندہ ہے تو اس کی بیوی اسی کے لیے ہے جب تک کہ دوسرے شخص نے پہلے کی زندگی کو نہ جانتے ہوئے اس سے استمتاع نہ کیا ہو۔ اگر دوسرے شخص نے اس کی زندگی کو نہ جانتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھایا ہو تو یہ دوسرے کی بیوی ہو گی، بشرطیکہ اس نے اس کے ساتھ پہلے کی عدت میں نکاح نہ کیا ہو"۔

امام مالکؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر نکاحِ ثانی سے پہلے پہلے لاپتہ خاوند گھر آجائے تو وہ بیوی اسی کی ہو گی اور اگر وہ نکاحِ ثانی اور خلوتِ صحیحہ کے بعد بازیاب ہو تو اسے بیوی سے محروم ہونا پڑے گا۔[3] اگرچہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان حالات میں اسے حق مہر اور بیوی میں سے کسی ایک کا اختیار دیا جائے گا لیکن پہلا موقف ہی زیادہ قرینِ قیاس ہے، یعنی اگر اس کی بیوی نے نکاحِ ثانی کر لیا ہے تو مفقود کو اپنی بیوی سے محروم ہونا پڑے گا۔[4] امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ اہلِ مدینہ کا

---

[1] المبسوط للسرخسي، دار المعرفۃ، 34/11

[2] محمد أبو زہرہ، تنظیم الأسرۃ وتنظیم النسل، دار الفکر العربی (1976ء) ص28

[3] المدونۃ الکبری، 450/5

[4] أبو محمد حافظ عبد الستار حماد، فتاوی أصحاب الحدیث (مکتبہ اسلامیہ لاہور، 2014) 322/3

عمل نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

((وَقَالَ أهل الْمَدِينَةِفِي امْرَأَةالْمَفْقُودإنه إن أدرک امْرَأَته قبل أن تتَزَوَّج كَانَ أحق بهَاوان أدركها بعدأن تزوجت بعدانْقِضَاء عدتهَا دخل بهَا الأخر أَوْ لم يدْخل لا سَبِيل لَهُ عَلَيْهَا وَلَا مهر لَهَا عَلَيْهِ وَلَاعلى زَوجهَاالآخروَهِي امْرَأَةالآخروَقَالَ مُحَمَّدكَيفَ امْرَأَةالأول إذاتزوجت صَارَت امْرَأَة الآخر))[1]

ترجمہ: "اہلِ مدینہ نے مفقود کی بیوی کے بارے میں کہا کہ اگر اس (مفقود الخبر) نے اس کی بیوی کو اس کی (دوسری) شادی سے پہلے پالیا تو اس کا اس پر زیادہ حق ہے اور اگر اس نے عدت ختم ہونے کے بعد (دوسری) شادی کے بعد اسے پایا۔ دوسرے نے خواہ اس کے ساتھ جماع کیا ہو یا نہیں۔ اس کا اس پر کوئی اختیار نہیں اور اس عورت کے لیے نہ اس پر مہر ہے، نہ اس کے دوسرے شوہر پر اور وہ دوسرے کی بیوی ہو گی۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں: کیسے یہ پہلے شوہر کی بیوی ہو گی جب اس نے شادی کی تو دوسرے کی بیوی بن گئی"۔

امام ربیعہؒ کے مطابق، اس صورت میں یہ عورت بہر حال دوسرے شوہر کی بیوی شمار ہو گی اور پہلے شوہر کا اس پر کوئی حق باقی نہیں رہے گا، جیسے کہ امام ابن حزمؒ نے بھی فرمایا ہے:

((فلا سبيل للأول ولا رجعة دخل بها أو لم يدخل))۔[2]

ترجمہ: "پس پہلے کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں چاہے اس نے دخول کیا ہو یا نہیں۔"

متأخرین احناف کے رجحان کے مطابق امام مالکؒ کا مؤقف صحیح ہے کیوں کہ اسے حضرت عمرؓ و دیگر صحابہ کرامؓ کے ایک فیصلے کی تائید حاصل ہے۔ معاشرتی حالات بھی اس کا تقاضا کرتے ہیں لیکن مدتِ انتظار کا تعین حالات و ظروف کے تحت کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں ذرائع مواصلات اس قدر وسیع اور سریع ہیں جن کا تصور زمانہ قدیم میں محال تھا۔ آج ہم کسی شخص کے گم ہونے کی اطلاع ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ایک دن میں ملک کے کونے کونے تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعے چند منٹوں میں گم شدہ شخص کی تصویر بھی دنیا کے چپہ چپہ تک پہنچائی جا سکتی ہے، اس بنا پر چار سال کی مدتِ انتظار کو مزید کم کیا جا سکتا ہے۔

اندیشہ عفت وعصمت، یا عدمِ نان ونفقہ کی صورت ایک سال کے بعد تنسیخ نکاح کا عدالتی اختیار

مفقود الخبر کی بیوی کو اگر نان ونفقہ کا مسئلہ ہو یا اس کی عفت وعصمت کے لیے خطرہ ہو تو ایک مدت تک انتظار کے بعد قاضی کی طرف رجوع کرے گی اور قاضی ایک سال کی مہلت دے گا۔ ایک سال کے بعد اگر شوہر نہ آیا تو قاضی کے پاس نکاح فسخ کرنے کا صوابدیدی اختیار موجود ہے۔[3] امام مالکؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ "فتن المسلمین" میں ایک سال کی مدت ہو گی۔ ابن القاسم امام مالکؒ سے نقل کرتے ہیں:

((وروى ابن القاسم،عن مالك في المفقودفي فتن المسلمين أنه يضرب لامرأته سنةثم تتزوج واحتج المهلب لهذا القول

[1] محمد بن الحسن الشيباني أبو عبد الله، الحجة على أهل المدينة (عالم الكتب، بیروت، 1403ھ)4/52

[2] ابن حزم، المحلی بالاثار، ت: محمد منیر الدمشقی، ادارة الطباعة المنیریة، القاهرة، مصر، 1352ھ، ج10، ص134، 133

[3] ابو محمد حافظ عبد الستار حماد، فتاوی اصحاب الحدیث: 3/322

بحديث اللقطة ؛ لأنه حكم فيها عليه السلام بتعريف سنة))۔[1]

ترجمہ:"ابن القاسم نے مسلمانوں کے دور فتن میں مفقود الخبر کے بارے یہ نقل کیاہے کہ اسکی بیوی ایک سال انتظار کرے گی، اس کے بعد شادی کرے گی۔ مھلب نے اس قول پر حدیث میں "اللقطۃ (گری ہوئی چیز) کے لفظ سے استدلال کیاہے کیوں کہ محمد ﷺ نے اس (گری ہوئی چیز) کی پہچان کے لیے ایک سال کا حکم دیاہے"

امام بخاریؒ کارجحان ایک سال کی مدت کی طرف ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی صحیح میں ایسے شخص کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کرکے لکھاہے:

((بَابُ حُكْمِ المَفْقُودِفِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ،وَقَالَ ابْنُ المُسَيِّبِ:إِذَافُقِدَفِي الصَّفِّ عِنْدَالقِتَالِ تَربص امْرَأته سَنَةً،وَاشْتَرَى ابْنُ مَسْعُودٍ جَارِيَةً،وَالتَمَس صَاحبهاسَنَةً،فَلَمْ يَجِدْهُ،وَفُقِدَ،فَأَخَذَيُعْطِي الدِّرْهَمَ وَالدِّرْهَمَيْنِ،وَقَالَ:"اللَّهُمَّ عَنْ فُلاَنٍ فَإِنْ أَتَى فُلاَنٌ فَلِي وَعَلَيَّ، وَقَالَ:هَكَذَا فَافْعَلُوا بِاللُّقَطَةِ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ نَحْوَهُ وَقَالَ الزُّهْرِيُّ: فِي الأَسِيرِ يُعْلَمُ مَكَانُهُ:"لاَتَتَزَوَّجُ امْرَأَتُهُ،وَلاَيُقْسَمُ مَالُهُ،فَإِذَا انْقَطَعَ خَبَرُهُ فَسُنَّتُهُ سُنَّةُ المَفْقُود))۔[2]

باب: مفقود الخبر کے اہل وعیال اور مال ومتاع کے متعلق کیا حکم ہے؟ اور ابن المسیبؒ نے کہا: جب جنگ کے وقت صف سے کوئی شخص گم ہو جائے تو اس کی بیوی ایک سال تک اس کا انتظار کرے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ نے کسی سے ایک لونڈی خریدی (اس کا مالک قیمت لیے بغیر کہیں چلا گیا اور گم ہو گیا) تو آپ نے اس کے پہلے مالک کو ایک سال تک تلاش کیا، پھر جب وہ نہیں ملا تو غریبوں کو اس لونڈی کی قیمت میں سے ایک ایک دو دو درہم دینے لگے اور دعا کرتے: اے اللہ! یہ فلاں کی طرف سے ہے۔ اگر وہ آگیا تو لونڈی میری رہے گی اور اس کی قیمت مجھ پر واجب ہو گی۔ اور فرماتے کہ گری پڑی چیز کے بارے میں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ نے بھی اسی طرح کا موقف اختیار کیاہے۔ امام زہریؒ نے ایسے قیدی کے بارے میں، جس کی جائے قیام معلوم ہو، کہا کہ اس کی بیوی دوسرا نکاح نہ کرے اور نہ اس کا مال تقسیم کیا جائے، پھر جب اس کی خبر ملنی بند ہو جائے تو اس کا معاملہ بھی مفقود الخبر کی طرح ہو جاتاہے۔

امام بخاریؒ کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ تبویب میں اجتہادی نکتہ سوال کی صورت میں پیش کرنے کے بعد اس کے متنوع پہلو ترجمۃ الباب میں ائمہ فقہا کے حوالے سے واضح کرتے ہیں۔ پھر بطورِ دلیل حدیث کو پیش کر دیتے ہیں کہ اس میں غور کرکے اطمینان کر لیا جائے۔ باب کے تحت مذکور حدیث کا ایک حصہ یوں ہے:

((وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ، فَقَالَ:«اعْرِفْ وِكَاءَهَا وَعِفَاصَهَا، وَعَرِّفْهَا سَنَةً، فَإِنْ جَاءَ مَنْ يَعْرِفُهَا، وَإِلَّا فَاخْلِطْهَا بِمَالِكَ"))[3]

نبی کریم ﷺ سے لقطہ (گری پڑی چیز) کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی رسی (جس سے وہ بندھی ہو) اور اس کے ظرف کا (جس میں وہ رکھی ہو) ایک سال تک اعلان کرو، پھر اگر کوئی ایسا شخص آجائے جو اسے پہچانتا ہو) اس کا مالک ہو تو اسے دے دو) ورنہ اسے اپنے مال کے ساتھ ملا لو۔

امام بخاریؒ نے مذکورہ باب کے تحت یہ حدیث بیان کرکے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مفقود الخبر

---

[1] أبو الحسن علي بن خلف بن عبد الملك بن بطال، شرح صحيح البخارى (دار النشر: مكتبة الرشد- السعودية / الرياض، 2003م) 7/ 449

[2] صحيح البخاري، 7/ 50

[3] صحيح البخاري، كتاب الطلاق، بَابُ حُكْمِ المَفْقُودِ فِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ، رقم الحديث: 5292

شوہر کی بیوی ایک سال تک انتظار کرے گی اور اگر ایک سال تک اس کے شوہر کا کوئی پتہ نہ چل سکے تو وہ آگے نکاح کر سکتی ہے۔[1]

جنگ کے علاوہ اگر ایسی حالت ہو جہاں پر مفقود الخبر کی بیوی کے ابتلاء کا اندیشہ ہو تو فقہائے مالکیہ کے نزدیک کم از کم ایک سال کے بعد تنسیخِ نکاح کا اختیار قاضی کے پاس ہوتا ہے۔ متأخرین احناف میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "الحیلۃ الناجزۃ" میں یہی رائے دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> "مفقود الخبر شوہر کی زوجہ کیلئے مزید چار سال کا حکم اس صورت میں ہے کہ وہ صبر و تحمل کے ساتھ عفت اور پاک دامنی کی زندگی گزار رہی ہو، لیکن اگر ایسی صورت ممکن نہ ہو یعنی زوجہ اندیشہ ابتلاء ظاہر کر دے تو فقہ مالکیہ کے چار سال کے موافق تخفیف کی جائے، کیونکہ عورت کے ابتلاء کے شدید اندیشہ کی صورت میں فقہ مالکیہ کے مطابق کم از کم ایک سال صبر کرنے کے بعد تفریق جائز ہے اور جب قرائنِ قویہ سے ابتلا کا قوی اندیشہ ہو یا زنا کا خوف ہو، تو حاکم کو ایک سال کے قول پر تفریق کا حکم دینے کی گنجائش ہے"۔[2]

ایک سال سے متعلق مذکورہ نقطہ ہائے نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل نے 1983ء میں یہ تجویز دی کہ عدالت ایک سال انتظار کا حکم دے۔ اس دوران ایسے ذرائع ووسائل کے ذریعے جن کو وہ مناسب سمجھے شوہر کا پتہ چلانے کی کارروائی کرے گی۔ ایک سال کے اندر اگر شوہر نہ آئے اور اس کا کچھ سراغ نہ مل سکے تو عدالت ایک سال کی مدت کے انتظار پر بربنائے مفقود الخبری شوہر کے نکاح کو فسخ کر دے گی۔[3]

خلاصۂ کلام یہ کہ عمومی حالات میں بیوی "چار سال" انتظار کرے گی۔ چار سال میں شوہر آیا تو اس کی بیوی ہو گی، اگر شوہر نہ آیا تو اس کو عدالت یا بصورتِ دیگر جرگہ وپنچائیت ڈگری دے گی اور وہ دوسرے شوہر سے نکاح کر سکے گی، جس کی تصریح فقہائے کرام نے کی ہے، جب کہ مخصوص حالات میں جب نان ونفقہ نہ ملنے کا اندیشہ ہو یا جنسی اعتبار سے گناہ میں مبتلا ہونے کا خدشہ ظاہر ہو تو پھر قاضی اپنی صوابدید سے حالات ومصالح کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک سال کا حکم جاری کرے گا، اس ایک سال میں شوہر نہ ملنے کی صورت میں عدالت ڈگری دے گی اور بیوی نکاحِ ثانی کی مجاز ہو گی۔

---

[1] أبو محمد حافظ عبد الستار حماد، فتاوی أصحاب الحدیث، 3/322

[2] الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ، ص:110

[3] دسویں سالانہ رپورٹ، مسلم عائلی قوانین، اسلامی نظریاتی کونسل، ص:45

باب چہارم: عائلی مسائل میں پاکستانی مراکز افتاء کا کردار

فصل اول: نکاح کے مسائل

فصل دوم: طلاق اور خلع کے مسائل

فصل سوئم: وراثت اور دیگر عائلی مسائل

فصل اول

نکاح کے مسائل

اس فصل میں آن لائن نکاح سے متعلق مذکورہ مراکز افتاء کے فتاویٰ کو منتخب کیا جائے گا اور ان کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ اس تجزیے کے ذریعے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ان اداروں نے آن لائن نکاح کو کس حد تک شریعت کے مطابق جائز قرار دیا ہے، اس میں کون سی شرعی مشکلات سامنے آئی ہیں اور ان کے حل کے لیے کیا اصول وضع کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ، ان فتاویٰ کا مجموعی تجزیہ کر کے یہ سمجھا جائے گا کہ ان اداروں کی رہنمائی سے آن لائن نکاح کے حوالے سے ایک جامع اور واضح موقف قائم کیا جاسکتا ہے جو مسلمانوں کی عائلی مسائل کو بہتر طریقے سے حل کرنے میں مدد فراہم کرے گا۔

آن لائن نکاح سے متعلق منتخب مراکز افتاء کے فتاوی جات اوران کا جائزہ

آن لائن نکاح، جو جدید دور میں تیز تر رابطے اور ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال کے پیش نظر ایک اہم اور حساس مسئلہ بن چکا ہے، اسلامی فقہ اور شریعت کے اصولوں کے مطابق نئی پیچیدگیاں پیدا کر رہا ہے۔ جہاں یہ سہولت اور سرعت فراہم کرتا ہے، وہیں اس کے جواز اور شرعی حیثیت پر مختلف سوالات بھی اٹھائے جارہے ہیں۔
آن لائن نکاح کی اہمیت اس وقت مزید بڑھ گئی ہے جب دور دراز علاقوں میں رہنے والے افراد یا مختلف ممالک میں مقیم مسلمان اس طریقے سے اپنے نکاح کو مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کئی شرعی اور قانونی پہلو ہیں جن پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور جامعۃ الکوثر جیسے اہم دینی ادارے اپنے فتاویٰ جاری کرتے ہیں تاکہ اس جدید مسئلے کے بارے میں عوامی رہنمائی فراہم کی جا سکے۔ ان اداروں کے فتاویٰ میں نکاح کے مکمل ہونے کی شرائط، ایجاب وقبول، گواہوں کی موجودگی اور دیگر اہم شرعی اصولوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

آن لائن نکاح سے متعلق مرکز افتاء جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کا موقف

سوال 1: آن لائن نکاح کی شرائط کیا ہیں؟ اور کیسے آن لائن نکاح کرایا جاتا ہے؟

جواب: مذکورہ مسئلے کے جواب سے پہلے یہ واضح رہے کہ جان دار کی تصویر یا ویڈیو بنانا اور دیکھنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ آن لائن ویڈیو کالنگ کے عنوان سے کیوں نہ ہو۔

بصورتِ مسئولہ نکاح کے درست ہونے کیلئے ایجاب وقبول کی مجلس ایک ہونا ضروری ہے؛ لہذا آن لائن

نکاح کے جواز کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فریقین (مرد و عورت) میں سے کوئی ایک فریق فون پر کسی ایسے آدمی کو اپنا وکیل بنادے جو دوسرے فریق کے پاس موجود ہو اور وہ وکیل شرعی گواہوں (یعنی دو مسلمان عاقل بالغ مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں) کی موجودگی میں فریقِ اول (غائب) کی طرف سے ایجاب کرلے اور دوسرا فریق اسی مجلس میں قبول کرلے تو اتحادِ مجلس کی شرط پوری ہونے کی وجہ سے یہ نکاح صحیح ہو جائے گا۔

الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار):(3/ 14)

"ومن شرائط الإيجاب والقبول: اتحاد المجلس لوحاضرين(قوله: اتحاد المجلس) قال في البحر: فلو اختلف المجلس لم ينعقد."

الفتاوى الهندية:(1/ 269)

(ومنها)أن يكون الإيجاب والقبول في مجلس واحدحتى لواختلف المجلس بأن كانا حاضرين فأوجب أحدهما فقام الآخر عن المجلس قبل القبول أو اشتغل بعمل يوجب اختلاف المجلس لاينعقد،وكذاإذاكان أحدهماغائباًلم ينعقدحتى لوقالت امرأة بحضرة شاهدين: زوجت نفسي من فلان وهو غائب فبلغه الخبر فقال: قبلت،أوقال رجل بحضرة شاهدين: تزوجت فلانةً وهي غائبة فبلغها الخبر فقالت: زوجت نفسي منه لم يجز وإن كان القبول بحضرة ذينك الشاهدين وهذاقول أبي حنيفةومحمدرحمهما الله تعالى - ولو أرسل إليها رسولاً أو كتب إليها بذلك كتاباً فقبلت بحضرة شاهدين سمعا كلام الرسول وقراءة الكتاب؛ جاز لاتحاد المجلس من حيث المعنى."

بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع:(2/ 231)

"ثم النكاح كماينعقدبهذه الألفاظ بطريق الأصالةينعقدبهابطريق النيابة، بالوكالة، والرسالة؛ لأن تصرف الوكيل كتصرف الموكل، وكلام الرسول كلام المرسل، والأصل في جواز الوكالة في باب النكاح ماروي أن النجاشي زوج رسول الله ﷺ أم حبيبة فلايخلو ذلك إماأن فعله بأمرالنبي ﷺ أو لا بأمره، فإن فعله بأمره فهو وكيله، وإن فعله بغير أمره فقد أجاز النبي صلى الله عليه وسلم عقده، والإجازة اللاحقة كالوكالة السابقة."

الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار):(3/ 21)

(و) شرط (حضور) شاهدين (حرين) أو حر وحرتين."

الفتاوى الهندية:(1/ 267)

"ويشترط العددفلاينعقدالنكاح بشاهدواحدهكذافي البدائع،ولايشترط وصف الذكورة حتى ينعقد بحضور رجل وامرأتين،كذا في الهداية. ولاينعقدبشهادةالمرأتين بغيررجل وكذاالخنثيين إذالم يكن معهمارجل هكذافي فتاوى قاضي خان[1]".

مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا موقف

سوال 2: لڑکی اور اسکے والدین امریکہ میں ہیں، جبکہ لڑکا اور اس کے والدین پاکستان ہیں۔ تو ان کا نکاح کیسے پڑھایا جائے؟

جواب: ایسی صورت میں جب لڑکا کسی ایک ملک میں اور لڑکی کسی دوسرے ملک میں ہو، تو نکاح کیلئے دونوں کا موجود ہونا، اور دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول وغیرہ کی شرائط کیسے پوری ہوں گی؟

مختصر جواب تو یہی ہے کہ نکاح کے لیے فریقین کا ایک جگہ پر موجود ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر آن لائن یا ٹیلیفون کے ذریعے بھی شناخت اور پہچان اسی طرح ممکن ہو، جس طرح روبرو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کروایا جاتا ہے، تو آن لائن نکاح بھی منعقد ہو جائے گا۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ اہم ہے، اور اس میں غلط فہمی، غلط بیانی یا دھوکہ دہی کے امکانات کافی ہیں، لہذا ہم قدرے تفصیل کے ساتھ، اس کا عملی طریقہ کار بھی بیان کر دیتے ہیں، تاکہ

[1] ۔ دار الافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتوی نمبر 144201200719

اس عظیم بندھن کی انجام دہی میں، کسی قسم کی کوتاہی اور الجھن باقی نہ رہے۔ [1]

مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور کا موقف

سوال نمبر3: قبل ازیں بعض لوگ ٹیلی فون پر نکاح کرواتے رہے ہیں لیکن آج کل انٹرنیٹ جیسا جدید ذریعہ ابلاغ بھی اس مقصد کیلئے استعمال ہو رہا ہے، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جواب سے نوازیں۔ [2]

جواب: آپ کا سوال بڑا اہم ہے اور اس کا تعلق عصر حاضر کے جدید ترین مسائل کے ساتھ ہے۔ ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر شادیوں کی خبریں آئے روز اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں، اسلامی ممالک کے علماء و مفتیانِ کرام کا نقطہ نظر بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ بعض لوگ جواز اور بعض عدم جواز کے قائل ہیں۔ اصل مسئلہ نکاح کی شرائط کا ہے وہ پوری ہو رہی ہوں تو نکاح جائز ہوتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد شرطیں پوری نہ ہو سکیں تو نکاح بھی منعقد نہیں ہوگا۔ اب مسئلہ ہے نکاح پڑھنے کا، لڑکا اِدھر لڑکی اُدھر۔ نکاح کیلئے دونوں کا موجود ہونا اور دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول وغیرہ کی شرائط کیسے پوری ہوں؟

عملی ترکیب:

(1) سب سے پہلے پاکستان سے نکاح فارم لیں اور ان کو مکمل فِل کریں۔ جو فریق ملک سے باہر ہے، اس کا نام، پتہ اور دستخط کرنے کیلئے وہ کاغذات اس کے پاس بھیجیں۔ مثلاً لڑکا باہر ہے تو دولھا، اس کا وکیل اور اس کے وکیل کے دو گواہ کم سے کم ان تینوں کے نام، مکمل پتے اور ان کے مخصوص جگہ پر دستخط کرنے کیلئے چاروں نکاح فارمز باہر بھیجیں۔ وہ اسے فِل کرکے واپس بھیج دیں گے۔ باقی فارم یہاں پُر کریں۔ لڑکے اور ان تینوں کو لڑکی کی تمام ضروری معلومات اور حق مہر کی تفصیل بتا دیں۔

(2) لڑکی یہاں ہے، اس کا نام پتہ اس کے وکیل کا نام، پتہ اور وکیل بنانے کے دو گواہوں کے نام و پتہ لکھیں اور ان سب کے دستخط کروائیں۔ پھر شادی کے دو گواہ بنالیں ان کے نام و پتہ اور دستخط کروائیں۔

(3) جب اِدھر اُدھر کے دونوں فریقوں کو تمام حقیقت معلوم ہو گئی تو ٹیلی فون سیٹ نکاح خوان کے سامنے رکھیں۔ تمام متعلقہ لوگ جن کے نام فارم پر لکھے ہیں۔ اِدھر کے بھی اور اُدھر کے بھی ایک جگہ بیٹھ جائیں۔ اِدھر کے یہاں اور اُدھر کے وہاں۔ اب نکاح خوان فارم ہاتھ میں لے اور ٹیلی فون یا انٹرنیٹ کی صورت میں مائیک پر لڑکے کا نام

[1] ۔ دارالافتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد، فتوی نمبر نہ دارد۔

[2] دارالافتاء جامعہ نعیمہ لاہور، سوال نمبر 1164۔ تاریخ اشاعت: 13 اگست 2011ء

اسی سے پوچھے۔ والد کا نام اور یہ بھی معلوم کرے کہ کیا اس کا آج نکاح ہو رہا ہے؟ کس لڑکی سے ہے اور وہ کس جگہ سے ہے؟ لڑکی کے والد کا نام، حق مہر، کوئی اور شرائط ہو تو نکاح خواں وہ بھی اس سے پوچھے۔ سپیکر آن ہونے چاہیے تاکہ دوسرے لوگ بھی سن سکیں۔

(4) جب لڑکا یہ تمام باتیں کرلے اور نکاح کی اجازت بھی دے دے تو اس سے کہا جائے کہ اس کا یہاں وکیل کون ہے۔ اس کا والد کون ہے وغیرہ۔ اب لڑکی سے اجازت لیکر اس لڑکی کا اس لڑکے سے نکاح کریں۔ ٹیلیفون پر لڑکے سے اس کے گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کروائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لڑکے کا جو وکیل آپ کے پاس موجود ہے اُس سے بھی نکاح کا ایجاب وقبول کروایا جائے۔ یعنی لڑکے کا وکیل کہے کہ میں نے فلاں لڑکی اتنے حق مہر کے عوض ان شرائط کے تحت ان گواہوں کے روبرو اپنے فلاں موکل کے نکاح کیلئے قبول کی۔ اگر ٹیلیفون پر پورا بندوبست ہو۔ فریقین ایک دوسرے کو پہچان لیں، نکاح ہو جائے گا۔ اس نکاح میں تین پہلو نمایاں ہونگے۔

(i) چونکہ دونوں نے اپنا اپنا وکیل بنایا ہوا ہے، اور نکاح فارم میں ہر ایک کا وکیل اور اس کے دستخط موجود ہیں۔ وکیل بنانے کے دو گواہ اور ان کے دستخط بھی موجود ہیں، لہٰذا یہ نکاح وکالتاً صحیح ہوا۔

(ii) ٹیلی فون پر جب نکاح فارموں کے مطابق فام ولدیت، پتہ اور دوسرے فریق سے ان کا تعلق، ہونے والے نکاح کے بارے میں اجازت ورضامندی، شرائطِ مکتوبہ کی تائید وتوثیق وغیرہ صراحتاً موجود ہے اور دوسری طرف سے پوری احتیاط کے ساتھ تمام مراحل طے کرالئے گئے اور گواہوں کی موجودگی میں یہ نکاح پڑھا گیا تو نکاح درست رہا۔

(iii بالفرض ٹیلیفون پر گفتگو میں کوئی غلط بیانی ہو گئی تو ایسا امکان لڑکے اور لڑکی کی موجودگی میں بھی ممکن ہے۔ مثلاً، یہاں ہم آئے دن نکاح پڑھتے ہیں، نکاح خوان کو کیا معلوم کہ یہی لڑکی ہے، یہی لڑکا ہے اور یہی ان کی پہلی شادی ہے وغیرہ۔ محض اعتماد واعتبار کی بات ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک میں جب ٹیلیفون پر شادی ہو گی تو اس میں بھی خطاو غلطی کا امکان رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہاں، محض غلطی کے اتنے سے امکان سے فرق نہیں پڑتا۔ آخر ٹیلیفون پر کاروبار، لین دین، ٹھیکے، درآمد وبرآمد، موت وحیات کے بہت سے دوسرے امور بھی انجام پاتے ہیں۔ غلطی کا امکان ان میں زیادہ ہے کیونکہ نکاح کے سلسلے میں ہم نے جتنی بھی احتیاط برتی، دوسرے معاملات میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ جب اس کے باوجود دوسرے معاملات میں ٹیلیفون وغیرہ سے استفادہ کرتے ہیں تو نکاح وشادی کے معاملات بھی اس احتیاط کے ساتھ کرلئے جائیں تو شرعاً جائز ہے۔

غلطی کا امکان

جس طرح آج کل نکاح پڑھا جاتا ہے۔۔۔ یونہی جن جن کا نام کسی بھی حیثیت سے نکاح فارم پر لکھا ہوا ہے،

ان میں سے وہ لوگ جو اس ملک اور اس شہر میں رہتے ہیں' ان کو مجلسِ نکاح میں حاضر رکھیں۔ اب نکاح خوان سے بیرونِ ملک متعلقہ لوگوں کا رابطہ کروائیں۔۔۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ نکاح خوان دو طرح سے ایجاب و قبول کرے:

(1) جہاں نکاح خوان موجود ہے وہاں لڑکا ہے یا لڑکی اُس سے اجازت اور شرائط وغیرہ بالمشافہ طے کرے اور دوسرے فریق سے بذریعہ ٹیلیفون پر مسئلہ طے کرے۔ ہر اس آدمی سے ٹیلیفون پر رابطہ کرے جس کا فارم کے اوپر نام درج ہے اور اس کی قانونی حیثیت کی اُس فارم پر وضاحت کرے۔ اب اس محفل میں ایک فریق اصالۃً موجود ہے، دوسرے فریق سے ٹیلیفون پر رابطہ ہے۔ یوں ایجاب و قبول آسانی سے کر سکتا ہے۔

(2) نکاح پڑھنے کا دوسرا طریقہ بھی استعمال کرے' اس طرح کہ جو فریق حاضر ہے وہ تو اصالۃً ایجاب و قبول کرے گا۔ مگر جو فریق بیرون ملک ہے، اس کا وہ وکیل جس کا نام نکاح فارم پر لکھا ہے، وہ یہاں موجود ہے۔ نکاح خوان اُن گواہوں کے رُوبرو جن کا نام بطور وکیل کے تقرر کے گواہان فارم پر موجود ہے، اس وکیل سے یوں کہے "کہ فلاں لڑکا' لڑکی ولد فلاں' بنت فلاں کا نکاح اتنے حق مہر معجل' موجل یا عند الطلب کے بدلے ان مسلمان گواہوں کے روبرُو کرتا ہوں' تمہیں اپنے موکل کے نکاح کیلئے یہ لڑکی ان شرائط کے ساتھ قبول ہے، وہ کہے ہاں قبول ہے۔ تین بار (احتیاطاً) یہ ایجاب و قبول کیا جائے' یہ نکاح شرعاً ہو جائے گا۔ بالفرض اتنی احتیاطوں کے باوجود کوئی ابہام یا غلطی ہو گئی تو اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اتنی احتیاط کے باوجود اگر ثابت ہو جائے کہ ٹیلیفون پر متعلقہ لڑکے' لڑکی کا ایجاب و قبول نہیں ہوا، دھوکہ سے کسی اور سے کروایا گیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ دار و مدار صرف ٹیلیفون پر نہیں تھا، تحریری طور پر مقررہ وکیل اور گواہان موجود ہیں۔ ان کے وکالتاً نکاح کرنے سے نکاح ہو گیا۔

بالفرض یہاں کوئی خرابی نکل آئے تو رخصتی کے بعد قربت سے پہلے نکاح ہو سکتا ہے' گویا یہ ممکنہ غلطیاں ہو بھی جائیں تو ان کا ازالہ ممکن ہے۔

مرکز افتاء جامعۃ الکوثر کا موقف

سوال نمبر 4: آن لائن نکاح کا شرعی جواز کیا ہے؟

جواب: اگر لڑکا لڑکی خود نکاح کا صیغہ پڑھ رہے ہوں اور جس آن لائن سورس (ذریعہ) سے نکاح کا صیغہ پڑھ رہے ہوں وہ محفوظ اور قابلِ اعتماد اور اطمینان بخش ہو تو درست ہے۔ اکثر نکاح کا صیغہ وکیل کے ذریعے پڑھوایا جاتا ہے اس صورت میں بھی متعلقہ آن لائن سورس اطمینان بخش ہونا چاہیے۔ [1]

[1] ۔ جامعۃ الکوثر اسلام آباد، انٹرویو

تجزیہ

یہ چاروں مسائل آن لائن نکاح سے متعلق ہیں جن میں بریلوی دیوبندی، اہل حدیث اوراہل تشیع مکتب فکر کے مسائل ذکر کیے گئے اور ان کے تفصیلی جوابات بھی ساتھ مذکور ہیں۔ ان مسائل کا تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں چار الگ مراکز کے فتاوی جات ہیں مگر بنیادی طور پر دو نطقہ نظر ہیں۔واضح رہے کہ آن لائن نکاح اس وقت ہوتا ہے جب دولہا اور دلہن کسی ایک جگہ پر موجود نہیں ہیں تو آن لائن نکاح کے ذریعے ایجاب و قبول ممکن ہے۔اس کاطریقہ کار ان دونقطہ نظر سے الگ الگ ہے

دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر کے ہاں بالعموم یہ ضروری ہے کہ ایک طرف سے وکیل بنایا جائے کیونکہ ان کے ہاں اتحاد مجلس شرط ہے۔نکاح میں اتحادِ مجلس ایک اہم شرعی اصول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے ایجاب (پیشکش)اور قبول (منظوری)کا عمل ایک ہی مجلس (یعنی ایک ہی وقت اور جگہ) میں مکمل ہوناضروری ہے۔

اتحادِ مجلس کی وضاحت

1.ایک جگہ پر موجودگی

ایجاب (دلہن یااس کے ولی کی طرف سے نکاح کی پیشکش)اور قبول (دلہا کی طرف سے اس پیشکش کو قبول کرنا) ایک ہی مجلس میں ہونا چاہیے۔یہ مجلس جسمانی طور پر ایک جگہ پر ہوسکتی ہے یا آن لائن نکاح کی صورت میں ایک ویڈیو کال یا کسی دوسرے معتبر مواصلاتی ذریعے سے۔

2. مسلسل عمل

ایجاب کے فوراًبعد قبول کیا جاناچاہیے،اور درمیان میں غیر ضروری تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔اگر ایجاب کے بعد مجلس ختم ہو جائے یا کوئی دوسرا غیر متعلقہ موضوع چھیڑ دیا جائے تو اتحادِ مجلس ختم ہو جاتاہے،اور نکاح دوبارہ نئے ایجاب و قبول سے کیا جائے گا۔

3. گواہوں کی موجودگی

ایجاب و قبول کے وقت گواہوں کا بھی موجود ہوناضروری ہے تاکہ وہ اس عمل کی گواہی دے سکیں۔اتحادِ مجلس میں گواہوں کا بھی شامل رہنالازمی ہے۔

آن لائن نکاح میں اتحادِ مجلس

آن لائن نکاح میں ایجاب و قبول ویڈیو کال یا کسی ایسے ذریعے پر کیا جاسکتاہے جہاں دلہا، دلہن (یاان کاولی) اور گواہ سب ایک وقت میں موجود ہوں۔نکاح کی کارروائی ایک ہی تسلسل میں مکمل ہونی چاہیے۔

اتحادِ مجلس کی اہمیت

نکاح اسلامی معاشرت کا ایک بنیادی رکن ہے، اور اس کے معتبر ہونے کے لیے چند اہم اصولوں کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ان اصولوں میں اتحادِ مجلس کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ نکاح کو شریعت کے مطابق مؤثر اور واضح بناتا ہے۔ اتحادِ مجلس سے مراد یہ ہے کہ ایجاب (نکاح کی پیشکش) اور قبول (نکاح کی منظوری) ایک ہی مجلس میں انجام پائیں، تاکہ ان میں کوئی ابہام یا غلط فہمی نہ ہو۔ اگر ایجاب و قبول مختلف مجلسوں یا مختلف مواقع پر ہوں تو اس سے نکاح کی درستگی متاثر ہو سکتی ہے اور ایسا نکاح شریعت کے مطابق باطل یا ناقص قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر دلہن کا ولی کہے: "میں نے اپنی بیٹی کا نکاح مثال سے کیا۔" اور دلہا فوراً جواب دے: "میں نے قبول کیا۔" تو یہ اتحادِ مجلس کا بہترین نمونہ ہے، جہاں ایجاب و قبول ایک ہی مجلس میں انجام پایا، اور نکاح درست تسلیم کیا جائے گا۔

اتحادِ مجلس نہ صرف شرعی نکاح کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ دونوں فریقوں کے درمیان باہمی رضامندی اور وضاحت کو بھی یقینی بناتا ہے، جس سے ازدواجی زندگی کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔

لیکن اگر دلہا جواب دینے سے پہلے مجلس چھوڑ دے یا طویل وقفہ کرے، تو اتحادِ مجلس ٹوٹ جائے گا اور نکاح دوبارہ کرنا ہوگا۔ لہٰذا اس موقف کے پیشِ نظر کسی ایک جانب وکیل بنانا ضروری ہے ورنہ نکاح نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس دارالافتاء جامعہ سلفیہ (یعنی اہل حدیث مکتب فکر اور اہل تشیع) کے ہاں اتحاد مجلس شرط نہیں ہے اور ان کے ہاں وکیل بنانا ضروری بھی ضروری نہیں ہے بلکہ آن لائن نکاح میں دونوں فریقین ایک دوسروں سے خود کال میں ہی ایجاب و قبول گواہوں کی موجودگی میں کر سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دنیا ایک عالمگیریت اختیار کر چکی ہے۔ فاصلے مٹ چکے ہیں، مگر رشتوں کی بندش کے لیے بعض اوقات یہی فاصلے سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ نکاح جیسا پاکیزہ اور عظیم فریضہ، جو نہ صرف دو افراد بلکہ دو خاندانوں کے درمیان محبت، سکون اور رحمت کا ذریعہ بنتا ہے، آج کے پیچیدہ سماجی ڈھانچے میں بسا اوقات عملی مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب لوگ مختلف شہروں یا ملکوں میں مقیم ہوں، اور کسی ایک جگہ پر جمع ہو کر روایتی انداز میں نکاح انجام دینا ممکن نہ ہو، تو ایسے میں حل کیا ہے؟

انہی حالات میں دارالافتاء جیسے دینی و علمی مراکز کی بصیرت، حکمت اور دوراندیشی اُجاگر ہوتی ہے۔ انہوں نے زمانے کی تبدیلیوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے انہیں دین کے دائرے میں رہتے ہوئے سمجھا، پرکھا اور ان کے لیے شرعی رہنمائی فراہم کی۔

آن لائن نکاح، جو آج کا ایک نہایت اہم دینی مسئلہ ہے، اسی اجتہادی سوچ کا ثمر ہے۔ مرکز افتاء نے اس ضمن میں عوام کو نہ صرف آگاہی دی بلکہ انہیں ایسا حل فراہم کیا جو صدیوں سے کتبِ فقہ میں موجود تھا: یعنی وکالت

اور نیابت کے اصول پر نکاح۔

فقہائے کرام نے صراحت کی ہے کہ اگر میاں بیوی کسی وجہ سے بنفسِ نفیس موجود نہ ہوں تو وہ کسی کو اپنا وکیل بنا کر نکاح کروا سکتے ہیں۔ مرکز افتاء نے اسی اصول کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق آن لائن نکاح کی صورت میں زندہ کیا، اور امت کو ایک بڑی الجھن سے نجات دی۔ آج کوئی شخص چاہے کسی دوسرے ملک میں ہو، اگر وہ شرعی شرائط پوری کرتے ہوئے کسی کو اپنا وکیل مقرر کرلے، تو اس کا نکاح مکمل طور پر جائز اور معتبر شمار ہو گا۔

یہ صرف ایک مسئلے کا حل نہیں، بلکہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ہمارا دینی نظام ایک زندہ نظام ہے، جو ساکت و جامد نہیں بلکہ ہر دور کے مسائل کو قوت، حکمت اور نرمی کے ساتھ حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہماری فقہی روایت صرف نصوص کی پابند نہیں، بلکہ عقل، مصلحت، عرف، اور وقت کی ضروریات کو بھی شرعی دائرے میں جگہ دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آن لائن نکاح جیسے اقدامات معاشرے کیلئے آسانی، سہولت اور برکت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دینِ اسلام کی روح بھی اسی بات پر زور دیتی ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشادِ ہے: "أَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مَؤُونَةً" یعنی سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں خرچ اور تکلّف کم ہو۔

یہ حدیث گویا نکاح کے تمام پیچ و خم کو آسانی سے سلجھا دیتی ہے۔ اس کی روشنی میں ہمیں سادگی، اخلاص اور سہولت پسندی کو اپنانا چاہیے۔ آن لائن نکاح بھی اسی سہولت پسندی کا عملی عکس ہے، جو لوگوں کو شرعی دائرے میں رہتے ہوئے جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کا راستہ دکھاتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہمارے دینی ادارے اسی فہم و فراست کے ساتھ جدید دنیا کے مسائل کو دیکھتے رہے، تو دین اور دنیا کے درمیان کوئی خلیج باقی نہیں رہے گی۔ دینی رہنمائی صرف مسجد و مدرسہ تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ عملی زندگی کے ہر موڑ پر ہمارے لیے مشعلِ راہ بنے گی۔

دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت

دورِ جدید میں دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت کا مسئلہ عوامی و قانونی سطح پر توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس حساس موضوع پر ملک کے معتبر مراکز افتاء نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ جامعہ بنوری ٹاؤن، نعیمیہ لاہور، سلفیہ فیصل آباد اور جامعۃ الکوثر اسلام آباد نے اپنے فتاویٰ میں واضح کیا کہ شریعت میں اجازت کی شرط نہیں، لیکن قانونی تقاضا بطور نظمِ ریاست قابلِ لحاظ ہو سکتا ہے۔ ان مراکز نے اخلاقی، معاشرتی اور قانونی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر متوازن رائے دی، اور عوام کو شرعی رہنمائی فراہم کی۔ ان کا یہ کردار معاشرتی استحکام اور فکری توازن کے لیے نہایت مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔

مرکز افتاء جامعہ بنوریہ کراچی کا موقف

سوال: دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا شرعی لحاظ سے لازم ہے؟ یا بیوی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے؟

کیا عورت کی یہ بات درست ہے کہ اللہ تعالی نے جہاں چار شادیوں کی اجازت دی ہے، وہاں یہ بھی کہا ہے کہ اگر عدل نہیں کر سکتے تو پھر ایک ہی کرو، تو وہ کہتی ہیں کہ آپ عدل نہیں کر سکتے، اس لیے ایک ہی کرو۔

جواب: دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا شرعاً ضروری نہیں ہے البتہ بہتر اور مناسب یہ ہے کہ پہلی بیوی کو اعتماد میں لے کر دوسری شادی کی جائے تاکہ دوسری شادی کے بعد اختلافات اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی پریشانی سے محفوظ رہ سکے، لہذا اگر کوئی شخص دوسری شادی کرنا چاہے اور وہ شخص جسمانی اور مالی طاقت رکھتا ہو تو وہ دوسری شادی کر سکتا ہے۔

نیز یہ واضح رہے کہ دوسری شادی کرنے کی صورت میں دونوں بیویوں کی درمیان نان ونفقہ، لباس اور شب باشی میں برابری کرنا ضروری ہے، برابری نہ کرنے کی صورت میں آخرت کے مؤاخذہ کا سامنا کرنا پڑے گا، عورت کی یہ بات درست ہے کہ ایک سے زائد شادیوں کی اجازت اس شخص کو ہے جو دونوں بیویوں کے درمیان عدل کر سکتا ہو، جو آدمی عدل وانصاف نہ کر سکے تو اسے ایک سے زائد شادی کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

لہذا جو شخص دوسری شادی کرنا چاہتا ہو وہ نان ونفقہ اور دیگر امور کو مد نظر رکھے کہ اگر دونوں بیویوں کے درمیان نان ونفقہ اور دیگر امور میں عدل وانصاف پر قائم رہ سکتا ہو تو دوسری شادی کر لے، ورنہ ایک پر ہی اکتفا کرے۔ قرآن کریم میں ہے:"وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّاتُقْسِطُوْافِي الْيَتَامٰى فَانْكِحُوْامَاطَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّاتَعْدِلُوْافَوَاحِدَةً أَوْمَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَلَّا تَعُوْلُوْا(النساء:3)" اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے اور تین تین

عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے، پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو، یا جو لونڈی تمہاری ملک میں ہو وہی سہی، اس امر مذکور میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔(بیان القرآن)"

فتاوی شامی میں ہے:

(و)صح(نكاح أربع من الحرائروالإماء فقط للحر)لاأكثر ".(كتاب النكاح،3/ 48)

فتاوی ہندیہ میں ہے:

":وإذاكانت له امرأةوأرادأن يتزوج عليهاأخرى وخاف أن لايعدل بينهما لايسعه ذلك،وإن كان لايخاف وسعه ذلك،و الامتناع أولى،ويؤجربترك إدخال الغم عليها كذا في السراجية (كتاب النكاح،ج:1،ص:341،ط:رشيدية)[1]

مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا موقف

سوال: کیا دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کو بتانا ضروری ہے؟

جواب: شرعاً ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اس سے اجازت لی جائے یا اس کو بتایا جائے، باقی شاید قانوناً کچھ مسئلہ ہے، یہ کسی وکیل سے آپ بات کریں، شرعاً آپ آزاد ہیں، بس عدل کریں، اور نکاح کی شروط کو ملحوظ رکھیں۔[2]

مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور کا موقف

سوال نمبر: کیا دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے؟

جواب: شرعی طور پر پہلی بیوی سے اجازت لینا فرض، واجب یا سنت نہیں ہے یعنی ضروری نہیں ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا: فَانكِحُواْ مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلاَثَ وَرُبَاعَ.(النِّسَاء،3:4)"ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پسندیدہ اور حلال ہوں، دو دو اور تین تین اور چار چار (مگر یہ اجازت بشرطِ عدل ہے)۔

یہ آیت کریمہ مطلق ہے اس میں اجازت کی کوئی قید نہیں۔ صرف آگے بیان جو ہو رہا ہے کہ اگر بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی کافی ہے۔ چونکہ دوسری بیوی پہلی کے ساتھ ہی رہے گی لہذا مناسب ہے کہ پہلی بیوی سے مشورہ ہو تاکہ بعد میں آئے دن لڑائی جھگڑا نہ ہو، کیونکہ اگر اس سے مشورہ نہ لیا جائے تو دوسری کو برداشت کرنا پہلی کے لیے بہت ہی مشکل ہے لہذا ضروری نہیں ہے لیکن مناسب ضرور ہے۔ واللہ اعلم۔[3]

مرکز افتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا موقف

سوال: کیا دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی رضامندی شرعاً شرط ہے؟

جواب: حکم قرآن کے مطابق واضح ہے کہ مرد دو، تین یا چار تک شادیاں کرسکتے ہیں۔ اس بنیاد پر بنیادی

---

[1] ۔جامعہ بنوریہ کراچی، فتوی نمبر 144611100091 :

[2] ۔جامعہ سلفیہ فیصل آباد، فتوی نمبر 3715

[3] جامعہ نعیمیہ لاہور، 814

طور پر دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی رضایت شرط نہیں ہے۔[1]

تجزیہ

موجودہ دور میں دوسری شادی کا مسئلہ شرعی، سماجی اور قانونی تینوں سطحوں پر بحث طلب بن چکا ہے۔ ایک طرف اسلام نے مرد کو عدل کی شرط کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت دی ہے، تو دوسری طرف معاشرتی حساسیت اور ملکی قوانین نے اس پر کئی عملی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔

دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا شریعت کی رو سے لازم نہیں۔ اگر کوئی مرد مالی، جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے دوسری شادی کی اہلیت رکھتا ہے تو وہ بلا اجازت بھی نکاح ثانی کر سکتا ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں، تاہم بہتر اور مستحسن یہی ہے کہ بیوی کو اعتماد میں لے کر یہ قدم اٹھایا جائے تاکہ باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا نہ ہو۔

شوہر پر لازم نہیں کہ وہ دوسری شادی سے قبل بیوی کو اطلاع دے، لیکن حکمت، حسنِ معاشرت اور فتنے سے بچاؤ کیلئے یہ ایک انتہائی مفید اور بامقصد عمل ہے۔ اگر شوہر بیوی کو اعتماد میں نہ لے تو بسا اوقات معاشرتی اور خاندانی تناؤ پیدا ہو سکتا ہے، اگرچہ شرعاً وہ گناہگار نہیں ہو گا۔

یہ بات کہ مرد عدل نہیں کر سکتا، اور اس لیے دوسری شادی نہ کرے—ایک جذباتی دعویٰ ہو سکتا ہے، مگر اس کی شرعی بنیاد صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب واقعی عدل نہ کرنے کا خوف خود مرد کو ہو، یا عملی طور پر عدل نہ کرنا ثابت ہو جائے۔ شریعت نے عدل کا معیار خود متعین کیا ہے، اور یہ فیصلہ عورت یا خاندان کے جذباتی اندازوں پر نہیں چھوڑا گیا۔

اگر مرد عدل کی استطاعت نہیں رکھتا یا اسے خود علم ہے کہ وہ دونوں بیویوں کے درمیان نان ونفقہ، رہائش اور شب باشی جیسے معاملات میں انصاف نہیں کر سکے گا، تو اس کے لیے دوسری شادی کرنا جائز نہیں۔ ایسی صورت میں ایک بیوی پر اکتفا کرنا ہی واجب ہے۔

پاکستانی خاندانی قوانین کے مطابق پہلی بیوی کی اجازت اور یونین کونسل کی منظوری کے بغیر دوسری شادی کرنا قانونی جرم ہے، جس پر سزا یا جرمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ قانون بظاہر ازدواجی انصاف اور خواتین کے تحفظ کے لیے بنایا گیا ہے، لیکن شرعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اسلامی اصولوں سے متصادم ہے۔ شریعت نے مرد کو جو حق مطلقاً دیا ہے، اس پر ریاستی سطح پر شرط عائد کرنا فقہی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔

اس پورے مسئلے کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے مرد کو تعددِ ازواج کی اجازت دی ہے، مگر اس کے ساتھ عدل

---

[1] ۔ جامعۃ الکوثر اسلام آباد، انٹرویو

وانصاف کو سختی سے لازم کیا ہے۔ پہلی بیوی کی اجازت کو شرعی طور پر شرط نہیں بنایا گیا، لیکن بہتر یہی ہے کہ بیوی کو اعتماد میں لیا جائے تاکہ گھریلو ماحول متاثر نہ ہو۔ عورت کی طرف سے عدل نہ ہونے کا محض دعویٰ شرعی دلیل نہیں بنتا۔ دوسری جانب پاکستانی قانون میں اس مسئلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے تاکہ وہ شریعت کے تابع بنے، شریعت کو اپنے تابع نہ بنائے۔ مناسب یہی ہوگا کہ ریاستی قوانین اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالے جائیں تاکہ معاشرتی توازن اور دینی ہم آہنگی برقرار رہے۔

فصل دوم

طلاق اور خلع کے مسائل

اس فصل میں جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباداور جامعۃ الکوثر اسلام آباد جیسے معتبر مرکز افتاء کے فتاویٰ کو منتخب کیاجائے گاجو تین طلاق کے مسئلے پر مبنی ہیں۔ ان فتاویٰ کا تفصیلی تجزیہ کیاجائے گا تاکہ یہ جانا جاسکے کہ ان اداروں کی شرعی رہنمائی کیاہے اور تین طلاق کے حوالے سے ان کا موقف کیاہے۔ اس تجزیے میں ہم یہ دیکھیں گے کہ ان فتاویٰ میں تین طلاق کے مسئلے کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے شرعی اصول کیاہیں اور کس طرح ان فتاویٰ کی روشنی میں اس مسئلے کا ایک جامع اور واضح حل نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح، ہم اس اہم عائلی مسئلے کے بارے میں ایک بہتر اور گہری سمجھ حاصل کرسکیں گے جو معاشرتی سطح پر اس کے اثرات کو کم کرنے میں مدد فراہم کرے گا۔

تین طلاق کا مسئلہ اسلامی معاشرت میں ہمیشہ سے ایک حساس اور اہم موضوع رہاہے، اور اسکے اثرات فرد خاندان اور پورے معاشرتی ڈھانچے پر مرتب ہوتے ہیں۔ طلاق ایک سنگین معاملہ ہے، خصوصاً جب یہ تین طلاقوں کی صورت میں ایک ساتھ دی جاتی ہے، جسکے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان ازدواجی رشتہ ختم ہو جاتاہے اور دوبارہ شادی کرنے کیلئے مخصوص شرائط اور مراحل طے کرنا ضروری ہوتے ہیں۔ تین طلاق کے مسئلے پر مختلف دینی اداروں اور مفتیان کرام کی مختلف آراء رہی ہیں، جن میں بعض اوقات تشریح اور توضیحات کی کمی یااختلافات سامنے آتے ہیں

آج کے دور میں جب عائلی مسائل پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں، تین طلاق کا مسئلہ بھی بہت اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ خاص طور پر جب طلاق دی جاتی ہے، تو اس کے اثرات کا تعین شریعت کی روشنی میں ضروری ہو جاتا ہے تاکہ کسی بھی قسم کی غیر ضروری پیچیدگیاں اور معاشرتی تنازعات پیدا نہ ہوں۔

تین طلاق سے متعلق مرکز افتاء جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کا موقف

سوال نمبر 1: دارالافتاء جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی کا فتویٰ: میری شادی کو تقریباً 35 سال ہوگئے ہیں، گھر میں کچھ اختلافات کی وجہ سے میں نے غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو ان الفاظ سے طلاق دیدی، طلاق، طلاق، طلاق، طلاق اور گھر چھوڑ کر چلا گیا، میرے بچے جوان ہیں، کچھ عرصہ بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ ہم اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے نزدیک طلاق نہیں ہوئی ہے، اس واقعہ کو تین سال کا عرصہ ہوچکاہے، میں اس کے بعد سے اب تک بیوی کے پاس نہیں گیاہوں، پوچھنا یہ ہے کہ طلاق ہوئی ہے یا نہیں؟

جواب: صورتِ مسئولہ میں سائل نے تین سال قبل اپنی اہلیہ کو غصہ کی حالت میں جس وقت مذکورہ الفاظ

"طلاق، طلاق، طلاق، طلاق" سے چار بار طلاقیں دی ہیں، تو تین طلاقیں سائل کی اہلیہ پر واقع ہو گئیں، جس کی وجہ سے سائل پر اپنی اہلیہ حرمتِ مغلظہ کے ساتھ حرام ہو گئی ہے، سائل کیلئے نہ رجوع کرنا جائز ہے اور نہ تجدیدِ نکاح کرنا جائز ہے، سائل کی اہلیہ کا یہ کہنا کہ ہم اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے نزدیک طلاق نہیں ہوئی ہے، ان کی اس بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے اسلئے کہ اہلِ حدیث کے علماء جو تین طلاقوں کے ایک طلاق ہونے کا فتوی دیتے ہیں، ان کا فتوی قرآن و سنت، جمہور صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، محدثین، ائمہ مجتہدین بشمول ائمہ اربعہ (امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ) کے متفقہ فتوی کے خلاف ہے، جس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالی ہے: "الطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْتَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ---فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَتَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُحَتَّى تَنكِحَ زَوْجًاغَيْرَهُ. (البقرۃ:229،230)" وہ طلاق دو مرتبہ (کی) ہے، پھر خواہ رکھ لینا قاعدے کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کیساتھ ... پھر اگر کوئی (تیسری) طلاق دیدے عورت کو تو پھر وہ اس کیلئے حلال نہ رہے گی اسکے بعد یہاں تک کہ وہ اسکے سوا ایک اور خاوند کیساتھ (عدت کے بعد) نکاح کرے" (ترجمہ از بیان القرآن)

حدیث مبارک میں ہے: "عن عائشةأن رجلاطلق امرأته ثلاثافتزوجت فطلق فسئل النبيﷺ أتحل للأول قال: لاحتى يذوق عسيلتهاكماذاق الأول.(صحيح البخاري،كتاب الطلاق،باب من أجاز طلاق الثلاث،ج: 2،ص :300)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا اور دوسرے شوہر نے بھی طلاق دے دی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہو گئی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! یہاں تک کہ دوسرا شوہر بھی اس کی لذت چکھ لے جیسا کہ پہلے شوہر نے چکھی ہے۔"

فتاوی شامی میں ہے: "وذهب جمهور الصحابةوالتابعين ومن بعدهم من أئمةالمسلمين إلى أنه يقع ثلاث.قال في الفتح بعدسوق الأحاديث الدالة عليه:وهذايعارض ماتقدم،وأماإمضاءعمرالثلاث عليهم مع عدم مخالفةالصحابةله وعلمه بأنها كانت واحدة فلايمكن إلاوقداطلعوا في الزمان المتأخرعلى وجودناسخ أولعلمهم بانتهاءالحكم لذلك لعلمهم بإناطته بمعان علمواانتفاءهافي الزمن المتأخروقول بعض الحنابلة:توفي رسول الله ﷺ عن مائة ألف عين رأته فهل صح لكم عنهم أوعن عشرهم القول بوقوع الثلاث باطل؟ أماأولا فإجماعهم ظاهر لأنه لم ينقل عن أحد منهم أنه خالف عمرحين أمضى الثلاث، ولايلزم في نقل الحكم الإجماعي عن مائة ألف تسميةكل في مجلد كبير لحكم واحد على أنه إجماع سكوتي.
وأماثانيافالعبرةفي نقل الإجماع نقل ماعن المجتهدين والمائة ألف لايبلغ عدةالمجتهدين الفقهاءمنهم أكثرمن عشرين كالخلفاء والعبادلة وزيدبن ثابت ومعاذبن جبل وأنس وأبي هريرة،والباقون يرجعون إليهم ويستفتون منهم وقد ثبت النقل عن أكثرهم صريحا بإيقاع الثلاث ولم يظهر لهم مخالف - {فماذا بعد الحق إلا الضلال} (يونس: 32)- وعن هذا قلنا لو حكم حاكم بأنها واحدة لم ينفذ حكمه لأنه لايسوغ الاجتهادفيه فهوخلاف لا اختلاف.(كتاب الطلاق، ركن الطلاق،ج: 3 ،ص: 233 ،ط :سعيد)"[2].

---

[1] ۔ دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتوی نمبر 144604102620

[2] ۔ دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتوی نمبر 144604102620 :

تین طلاق سے متعلق مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور کا موقف

سوال نمبر2: السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کی خیر فرمائے۔ آپ کی سائٹ سے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ ایک بار میری خالہ اور خالو کا جھگڑا ہو گیا ہم 10، 12 لوگ بھی موجود تھے۔ میرے خالوں نے تین بار خالہ کو طلاق دی پھر ہم سارے رشتے دار پاس تھے تو ہم نے ان کی صلح کروادی، اور وہ اب اکھٹے رہ رہے ہیں۔ شریعت میں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے تھا؟ مہربانی کر کے جواب عنایت فرمادیں۔ [1]

جواب: آپکے قول کے مطابق تین طلاقیں دی ہیں لہذا بیوی اس پر حرام ہو گئی ہے اور اکھٹے رہنا گناہ کبیرہ ہے، جب تک حلالہ نہ ہو اس کے لیے یہ بیوی حرام ہے۔ [2]

تین طلاق سے متعلق مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا موقف

سوال نمبر3: دارالافتاء جامعہ سلفیہ کا فتویٰ: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین تین طلاق اور حلالہ کے بارے میں ؟ براہ کرم کتاب و سنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ عین کرم ہو گا۔

جواب: طلاق ایک مباح عمل ہے۔ اس کا ارتکاب کرنے سے عورت مرد کے نکاح سے باہر ہو جاتی ہے۔ اسلام نے اس کی اجازت شوہر یا شوہر کے وکیل کو ایسی ناگریز حالت میں دی ہے جب زوجین کے مابین باہمی الفت و محبت اور سکون و طمانیت کی جگہ اختلاف و افتراق اور نفرت و کدورت نے لے لی ہو اور شوہر اپنی تادیبی مراحل اور فریقین باہمی صلح و مصالحت کی پوری کوشش کر چکے ہوں اورآخری علاج کے طور پر طلاق کے علاوہ اب کوئی اور دوسرا راستہ نہ ہو تو اس نازک موقع پر اسلام نے مرد کو اختیار دیا ہے کہ وہ شرعی حدود و تعلیمات کی روشنی میں نہایت خوش اسلوبی سے سنت نبویہ کے مطابق اپنی عورت کو طلاق دیدے، تاکہ ہر ایک خوشگوار اور پر سکون زندگی کی راہیں تلاش کر سکے۔

سنت نبویہ کے مطابق طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو حالت طہر (حیض و نفاس کے ایام کے علاوہ) یا حالت حمل میں ایک طلاق رجعی دے۔ بشرطیکہ اس طلاق والے طہر (پاکی) میں دونوں ہمبستر نہ ہوئے ہوں، اور نہ مرد نے جبر و اکراہ، نشہ و جنون اور کسی دماغی خرابی کی وجہ سے طلاق دیا ہو۔

اس طور پر طلاق دینے کے بعد تمام علماء کے نزدیک دوران عدت (تین حیض یا تین ماہ) زوجین کے مابین آپسی رضا و رغبت سے شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ نیز عدت گزر جانے کے بعد بھی اگر زوجین ازدواجی تعلقات دوبارہ بحال کرنا چاہیں تو تمام علماء کے نزدیک نکاح جدید اور مہر جدید سے دوبارہ ایسا کر سکتے ہیں۔

---

[1] ۔ دارالافتاء جامعہ نعیمیہ لاہور، فتوی نمبر 952، تاریخ اشاعت: 09 مئی 2011ء

[2] ۔ ایضاً

لیکن اس مسنون طریقہ کو چھوڑ کر ایک ہی مجلس میں متعدد بار طلاق دینے کا جو خود ساختہ طریقہ رواج پا چکا ہے وہ علماء اسلام کے مابین ایک زبردست اختلافی اور نزاعی مسئلہ رہا ہے کہ اس صورت میں کیا ایک رجعی طلاق واقع ہو گی یا تین (طلاق مغلظہ)؟ کتب حدیث کے نصوص صحیحہ وصریحہ نیز علماء محدثین کی صحیح اور راجح رائے کی روشنی میں یکجائی تین طلاق ایک رجعی طلاق واقع ہو گی۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: كان الطلاق على عهدرسول الله ﷺ وأبي بكروسنتين من خلافةعمرطلاق الثلاث واحدة. (رواہ مسلم: کتاب الطلاق، باب طلاق الثلاث) یعنی دور نبوی اور دور صدیقی حتی کہ فاروقی دور خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک طلاق (رجعی) ہی شمار ہوتی تھی۔ اس حکم کی تائید وتقویت مندرجہ ذیل آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے (1): اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌ ’’ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ ’’بِاِحْسَانٍ (البقرہ:229) یعنی طلاق (جس کے بعد قولی یا تحریری یا فعلی طور پر رجوع کئے جانے کی گنجائش باقی رہتی ہے وہ) صرف دو ہی مرتبہ ہے۔ اس کے بعد یا تو عورت کو خوش اسلوبی کے ساتھ رکھا جائے یا بھلائی کے ساتھ علائدہ کر دیا جائے۔

(2) اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق:1) یعنی عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو انہیں عدت گزاری کا موقع دیتے ہوئے طلاق دو۔

ان مذکورہ نصوص شرعیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق ناگزیر حالت پیدا ہونے پر دینا ایک مباح فعل ہے۔ البتہ اس کے استعمال کے وقت سنت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک پر اکتفا کرنا چاہیے، تاکہ دورن عدت باہمی رضا ورغبت پر رجعت اور عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ ازدواجی رشتہ نکاح جدید ومہر جدید کے ذریعہ باتفاق علماء قائم کیا جانا سہل وآسان ہو۔ اور بیک وقت تین طلاق کا ارتکاب کر کے زنا بصورت حلالہ مروجہ کا فتوی حاصل کرنے سے اجتناب کیا جا سکے جس کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: لs عن رسول اللہ المحلل والمحلل لہ (احمد، نسائی، ترمذی) یعنی رسول ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے ہر ایک پر لعنت بھیجی ہے۔

دوسری جگہ حدیث میں حلالہ کرنے والے کو منگنی کا سانڈ کہا گیا ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے: الا اخبركم بالتيس المستعارقالوابلى يارسول الله قال؛فهوالمحلل لعن الله المحلل والمحلل له(ابن ماجه الحاكم) کیا میں آپ لوگوں کو منگنی کے سانڈ کے متعلق نہ بتلاؤں؟ لوگوں نے کہا کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا: وہ حلالہ کرنے والا شخص ہے۔ اللہ تعالی حلالہ کرنے والے اور کرانے والے ہر ایک پر لعنت بھیجی ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو صحیح اسلام سمجھے اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔[1]

[1] دارالافتاء جامعہ سلفیہ، فیصل آباد، فتوی نمبر۔۔۔۔، مورخہ: 15/ فروری 2024

تین طلاق سے متعلق مرکز افتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا موقف

سوال نمبر:4ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے پر شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: فقہ جعفریہ میں طلاق صحیح ہونے کے چند بنیادی شرائط ہیں۔ عادل گواہوں کی موجودگی میں عربی زبان میں طلاق کا صیغہ جاری کیا جائے۔ اور ایک ہی مجلس میں تین بار طلاق کا صیغہ پڑھا جائے تو بھی وہ ایک ہی طلاق شمار ہو گا۔[1]

تجزیہ

طلاق ایک حساس اور پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا اثر فرد کی زندگی پر گہرے اور طویل المدتی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اسلامی شریعت میں طلاق کی مختلف اقسام اور اس کے اثرات کے حوالے سے علماء کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مسئلے پر مختلف مراکز افتاء کی جانب سے مختلف فتوے ہیں بعض مرکز افتاء تین طلاقوں کو الگ الگ شمار کرتے ہیں جبکہ بعض ایک طلاق کے قائل ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے لوگوں میں یہ سوالات اٹھ رہے ہیں کہ کیا تین طلاقیں واقعی تین طلاقیں ہیں یا یہ ایک ہی طلاق سمجھنی چاہیے؟

اس کے متعلق جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی اور جامعہ نعیمیہ کا موقف تین طلاقوں کے واقع ہونے کا ہے، یعنی ایک ہی مجلس میں دی جانے والی تین طلاقیں تین ہی شمار کی جاتی ہیں اور اس کے بعد شوہر اور بیوی کا دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ حلالہ کے عمل سے نہ گزریں۔ ان فتووں کی بنیاد قرآن و سنت، جمہور صحابہ کرام، تابعین، ائمہ اربعہ اور محدثین کے متفقہ فتویٰ پر ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ تین طلاقوں کا اثر تین طلاقوں کا ہوتا ہے، اور اس کے بعد عورت شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف، جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا موقف یہ ہے کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے کا اثر صرف ایک طلاق کا ہوتا ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر کے دور میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار کی جاتی تھیں۔ اس موقف کا مقصد یہ تھا کہ طلاق کے معاملے میں لوگوں کی سہولت کے لیے ایک متبادل راستہ فراہم کیا جائے تاکہ کوئی بھی شخص ایک ہی وقت میں تین طلاقیں نہ دے کر اپنی ازدواجی زندگی کے مسائل حل کر سکے۔

تین طلاق کے مسئلے میں فقہی اختلاف پایا جاتا ہے، جو مختلف مکاتبِ فکر کی تعبیرات کی بنیاد پر ہے۔ برصغیر کے معروف فقہی مسالک، جیسے دیوبندی اور بریلوی مکاتبِ فکر، تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرتے ہیں، چاہے وہ ایک وقت میں دی گئی ہوں یا وقفے وقفے سے۔ ان کے نزدیک ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں بھی نافذ ہوتی ہیں اور نکاح

---

[1] ۔ جامعہ الکوثر اسلام آباد، انٹرویو

مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسکے بر عکس اہلِ حدیث مکتبِ فکر کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں تین طلاقیں دے، تو وہ شرعی اعتبار سے صرف ایک طلاق شمار ہو گی، اور رجوع یا باہمی صلح کی گنجائش باقی رہے گی۔

ایسی صورت میں عام آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اسی مسلک کے فتویٰ پر عمل کرے جس سے وہ وابستہ ہے اور جس کی روشنی میں اس نے اپنی زندگی گزاری ہے، کیونکہ ہر مسلک کی بنیاد مجتہدین کی شرعی بصیرت پر ہے۔ تاہم اگر کسی شخص کو کسی دوسرے معتبر مفتی پر اعتماد زیادہ ہو، تو وہ اسکے فتویٰ پر بھی عمل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ فیصلہ خلوصِ نیت، دیانت داری اور علمی رہنمائی کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔ چونکہ مسئلہ حلال و حرام کا ہے، اس لیے اس معاملے میں مکمل دیانت داری سے کام لینا چاہیے اور انسان کو چاہیے کہ وہ فیصلہ کرتے وقت اپنی قبر و آخرت کو سامنے رکھے۔ یہ بات واضح ہے کہ صرف خواہشاتِ نفس کی پیروی میں مسلک تبدیل کرنا یا مختلف مسالک کے فتاویٰ کو محض سہولت پسندی کی بنیاد پر اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں۔ شریعت ایک سنجیدہ معاملہ ہے، اور اس میں سہولت کی تلاش ضرور کی جا سکتی ہے، مگر وہ صرف اس وقت جب اس کی بنیاد علم، دیانت، اور صحیح نیت پر ہو، نہ کہ وقتی فائدے یا ذاتی خواہش کی تکمیل پر۔

اسی طرح اس مختلف مسئلے میں پاکستان کے قانون کے مطابق، اگر شوہر اور بیوی تین طلاقیں دے دیتے ہیں، چاہے وہ ایک مجلس میں ہوں یا الگ الگ، تو قانون میاں بیوی کو نوے دن کا وقت دیتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر غور کریں اور طے کریں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ صلح کر کے رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ صلح کے لیے راضی ہو جاتے ہیں تو ان کا معاملہ حل کیا جاتا ہے۔ تاہم اگر وہ صلح کے لیے راضی نہیں ہوتے تو عدالت ان کے کیس کو یونین کونسل بھیج دیتی ہے، جہاں فریقین کے درمیان جدائی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد طلاق کو مؤثر سمجھا جاتا ہے اور یونین کونسل انہیں طلاق مؤثر ہونے کا سرٹیفیکیٹ جاری کر دیتی ہے۔

عدالتی خلع سے متعلق مراکز افتاء کا کردار

عدالتی خلع دورِ حاضر کے پیچیدہ عائلی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے، جس نے فقہی، قانونی اور سماجی سطح پر متعدد سوالات کو جنم دیا ہے۔ عدالتوں کے ذریعے خلع حاصل کرنے کی بڑھتی ہوئی شرح نے اس مسئلے کو مزید حساس بنا دیا ہے۔ ایسے میں ملک کے معروف مراکزِ افتاء، جیسے جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور جامعۃ الکوثر اسلام آباد نے اس مسئلے پر شرعی رہنمائی فراہم کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ ان مراکز نے واضح کیا کہ اگر شوہر کی رضامندی کے بغیر عدالت خلع کا فیصلہ دے تو اس سے شرعی خلع واقع نہیں ہوتا، جب تک شوہر رضامند نہ ہو یا قاضی شرعی حیثیت سے خلع نہ دے۔ ان کی آراء نے عوام کو خلع کے مسئلے میں شرعی پہلوؤں سے آگاہ کرنے اور پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کی اصلاح میں مدد فراہم کی ہے۔

مرکز افتاء جامعہ بنوریہ کراچی کا موقف

سوال: اگر عدالت کے ذریعے خُلع لیا ہے تو عدت کے احکامات کیا ہوں گے؟ نیز نکاح ثانی ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اگر شوہر عدالت میں حاضر نہیں ہوا اور اس نے زبانی یا تحریری طور پر خلع کو قبول نہیں کیا تو ایسے یک طرفہ عدالتی فیصلے کو شرعی خلع قرار نہیں دیا جاسکتا؛ کیوں کہ شرعی طور پر خلع کے معتبر ہونے کے لیے میاں بیوی دونوں کی رضامندی ضروری ہے، جب کہ مذکورہ صورت میں خلع کا فیصلہ شوہر کی اجازت و رضامندی سے نہیں ہوتا اور شوہر نے اس خلع نامہ پر دستخط کر کے اس کو قبول ہی نہیں کیا۔ نیز عمومی احوال میں شوہر کی اجازت اور وکالت کے بغیر کسی اور کو طلاق دینے کا بھی اختیار نہیں ہے۔

نیز ایسے عدالتی فیصلے کو تنسیخِ نکاح قرار دینے کیلئے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ یا تو شوہر نامرد ہو، یا مجنون ہو، یا مفقود (لاپتا ہو) ہو یا متعنت (ظالم) ہو کہ بیوی کا نان نفقہ نہ دیتا ہو اور ظلم کرتا ہو۔ پھر عورت اپنے اس دعوی کو شرعی گواہوں کے ذریعے عدالت کے سامنے ثابت بھی کرے۔ نیز متعلقہ صورت میں سے ہر ایک کی شرائطِ معتبرہ کی رعایت رکھی جائے، سو اگر یہ شرائط پائی گئیں تو عدالت کا فیصلہ شرعاً تنسیخِ نکاح ہو گا اور میاں بیوی میں جدائی ہو جائیگی اور اگر یہ شرائط مکمل نہ ہوں تو ایسے یک طرفہ عدالتی فیصلے کو تنسیخِ نکاح بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

لہٰذا مذکورہ لڑکی بدستور اپنے شوہر کے نکاح میں ہے۔ اور جب نکاح نہیں ٹوٹا تو عدت بھی نہیں۔ اور اگر عدالتی خلع میں شوہر کی رضامندی پائی گئی تو وہ خلع معتبر ہو گا، اور اس کی عدت وہی ہو گی جو مطلقہ کی عدت ہوتی ہے، یعنی اگر عورت حاملہ نہ ہو تو تین مرتبہ ایام کا گزرنا، اور اگر اسے ایام نہ آتے ہوں تو تین ماہ، اور اگر وہ حاملہ ہو تو بچے کی پیدائش تک، اور عدت کے دوران اس کیلئے وہی احکام ہونگے جو طلاقِ بائن کی عدت میں ہوتے ہیں، یعنی عدت شوہر

کے گھر میں رہ کر گزارنا لازم ہے، اور اس دوران شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے، نیز بناؤ سنگھار سے اجتناب بھی لازم ہے۔

فتاوی شامی میں ہے":فقالت:خلعت نفسي بكذا،ففي ظاهرالرواية: لايتم الخلع ما لم يقبل بعده".(۳/۴۴۰، سعيد)

بدائع الصنائع میں ہے": وأماركنه فهوالإيجاب والقبول؛ لأنه عقد على الطلاق بعوض فلاتقع الفرقة، ولايستحق العوض بدون القبول". (۳/۱۴۵، سعيد)[1]

مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا موقف

سوال: عدالتی خلع کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا یہ خلع معتبر ہے اور میرا خلع ہو گیا ہے؟

جواب: خلع کی دو صورتیں ہوتی ہیں: بذریعہ عدالت خلع، اور ماورائے عدالت خلع۔

پہلی صورت بالاتفاق درست ہے، جبکہ دوسری کے متعلق بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فتوی صحیح بخاری میں موجود ہے:وأجازعمرالخلع دون السلطان" (بخاری، رقم الحدیث:5273) عمر رضی اللہ عنہ نے حاکم وقت کے بغیر بھی خلع جائز قرار دیا ہے۔یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ماورائے عدالت کے خلع کو صحیح سمجھتے تھے، جبکہ یہاں تو عدالت نے خلع کا فیصلہ کیا ہے اور عدالتی خلع کی شرعی حیثیت مسلّم ہے اسکا اعتبار کیا جائے گا۔اگر عدالت نے خلع دے دیا ہے تو سائلہ خاتون کا خلع ہو گیا ہے۔ خلع کی عدت عورت حاملہ نہ ہو تو ایک حیض ہے۔حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ان سے خلع لے لیا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک حیض عدت گزارنے کا حکم دیا۔ (سنن الترمذی:1185)

اگر ماہواری غیر منتظم ہے اور بیماری کی وجہ سے حیض آنے میں کبھی کبھار چار ماہ تک تاخیر ہو جاتی ہے تو اسے حیض آنے تک انتظار کرنا ہو گا چاہے چار ماہ بعد ہی حیض آئے، لیکن اگر بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ماہواری بالکل ہی نہیں آتی ہے تو پھر اس کی عدت ایک ماہ ہے۔

لہذا عدالت نے اگر خلع کی ڈگری جاری کر دی ہے تو اس عورت کا خلع ہو چکا ہے اور چونکہ سائلہ کو ماہواری آتی ہے اگرچہ تاخیر سے آتی ہے، اس لیے اسکی عدت بھی ایک حیض ہے۔[2]

مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور کا موقف

سوال: عدالتی خلع کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا یہ خلع معتبر ہے اور میرا خلع ہو گیا ہے؟

جواب: خلع کا معنی ہے عورت مال دے کر اپنی جان خاوند سے چھڑا لے۔ خلع میں عورت مال ادا کرے گی،

---

[1]. جامعہ بنوریہ کراچی، **فتوی نمبر** 144206200195 :

[2] ۔جامعہ سلفیہ فیصل آباد فتوی نمبر 597

خاوند نے جب مال قبول کر لیا تو یہی خلع ہے، عورت کو ایک طلاق بائن ہو جائے گی اور عورت عدت گزار کر جہاں چاہے آزاد ہے، اور اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔ اگر شوہر مال قبول نہ کرے تو خلع نہیں ہو گی، جب خلع نہیں تو طلاق بھی واقع نہیں ہو گی۔ خلع کی صورت میں چونکہ طلاق بائن ہوتی ہے، لہذا رجوع نہیں ہو سکتا۔ نکاح فوراً ٹوٹ جاتا ہے، البتہ دوبارہ رضامند ہوں اور ازدواجی تعلقات از سر نو قائم کرنا چاہیں تو فریقین باہمی رضامندی سے از سر نو نکاح جب چاہیں کر سکتے ہیں، آپس میں تجدید نکاح کی صورت میں عدت گزرنے کی قید بھی نہیں، اگر یہ عورت عدت گزرنے کے بعد کسی اور سے نکاح کرنا چاہے تو بھی کر سکتی ہے۔

آپ کا مسئلہ جیسا کہ آپ نے ذکر کیا کہ آپ نے نہ تو زبانی طلاق دی اور نہ ہی تحریری یعنی آپ نے طلاق نہیں دی۔ اور عدالت نے بیوی کے حق میں خلع کا فیصلہ فرمایا اور آپ نے قبول کیا اور خلع واقع ہو گئی۔ اب آپ کی بیوی نے کسی اور سے بھی نکاح نہیں کیا اور اب آپ دوبارہ اپنے تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں، تو اب آپ پر لازم ہے کہ تجدید نکاح یعنی دوبارہ نکاح پڑھیں، تجدید نکاح کے بغیر رجوع ناجائز ہے۔ کیونکہ ایک طلاق بائن واقع ہوئی ہے اور طلاق بائن کی صورت میں تجدید نکاح ہوتا ہے۔ لہذا آپ فوری طور پر دوبارہ نکاح کر کے اکھٹے رہ سکتے ہیں، اور آئندہ ایسی جذباتی باتوں سے، لڑائی جھگڑوں سے پرہیز کریں۔ جس سے آپ کو بعد میں ندامت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑے، اس سے آپ دونوں کے ساتھ آپ کی اولاد پر بھی اثر پڑے گا اور وہ بھی پریشان ہو نگی۔ لہذا سارے اختلافات بھلا کر از سر نو تجدید نکاح کر کے نئی زندگی کا آغاز کریں، اپنے اور اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے۔[1]

مرکز افتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا موقف

سوال نمبر 4: عدالت کی جانب سے یک طرفہ خلع (عورت کی درخواست پر) کا شرعی درجہ کیا ہے؟

جواب: خلع عورت کا حق ہے اور خلع کے لیے عورت اپنے شوہر سے مطالبہ کرتی ہیں پھر شوہر کی مرضی ہے کہ وہ طلاق دیں یا نہ۔ اگر یہ معاملہ کسی بھی اہم وجہ سے حاکمِ شرع تک پہنچے تو حاکم شرع کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ اُس خاتون کو اس کے شوہر کی جانب سے طلاق کا صیغہ جاری کرے۔[2]

تجزیہ

موجودہ دور میں جب میاں بیوی کے درمیان نباہ ممکن نہ رہے اور ساتھ ہی شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو عورت عدالت کے ذریعے خلع لینے پر مجبور ہو جاتی ہے، عدالتی خلع کی شرعی حیثیت، اس کے نتیجے میں عدت کے احکام اور نکاحِ ثانی کی گنجائش جیسے مسائل پر فقہی مکاتبِ فکر اور مفتیانِ کرام کی آراء مختلف ہیں۔ اس مضمون میں انہی

[1] ۔ جامعہ نعیمیہ لاہور، فتوی نمبر 1319

[2] ۔ جامعہ الکوثر اسلام آباد، انٹرویو

مختلف آراء اور ان کے فقہی تجزیے کو واضح کیا جائے گا۔

فقہ حنفی کے معروف اور معتمد اصول کے مطابق خلع ایک مالی معاہدہ ہے جس میں عورت ایجاب (پیش کش) کرتی ہے اور شوہر اس پیش کش کو قبول کرتا ہے۔ خلع کی تکمیل کے لیے فریقین کی رضامندی لازم ہے۔ اس لیے اگر عورت عدالت میں خلع کی درخواست دے، لیکن شوہر عدالت میں نہ آئے یا خلع کو قبول نہ کرے، تو محض عدالت کا یکطرفہ فیصلہ خلع شمار نہیں ہوگا۔ بدائع الصنائع میں واضح طور پر لکھا ہے کہ: "فلاتقع الفرقة،ولایستحق العوض بدون القبول[1]"، یعنی شوہر کے قبول کے بغیر خلع مکمل نہیں ہوتا۔ ردالمحتار میں بھی یہی تصریح موجود ہے۔ اس صورت میں عورت بدستور نکاح میں باقی رہے گی، اس پر عدت واجب نہیں ہوگی، اور نہ ہی وہ نکاحِ ثانی کر سکتی ہے۔

تاہم فقہائے کرام نے ان خاص حالات میں عدالت کو تنسیخِ نکاح کا اختیار دیا ہے جہاں شوہر بیوی پر ظلم کرتا ہو، نان نفقہ نہ دیتا ہو، ازدواجی تعلقات سے انکار کرتا ہو، مجنون ہو، یا طویل عرصے سے غائب ہو۔ اگر عورت ان وجوہات کو معتبر شرعی دو گواہوں اور ثبوتوں کے ذریعے عدالت میں ثابت کر دے، تو عدالت کا فیصلہ محض خلع نہیں بلکہ تنسیخِ نکاح قرار پائے گا، جسے تمام فقہی مکاتب تسلیم کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں نکاح ختم ہو جائے گا، عورت پر عدت واجب ہوگی (جیسا کہ طلاقِ بائن میں ہوتی ہے)، اور عدت کے بعد وہ نکاحِ ثانی کر سکتی ہے۔

بعض معاصر علماء (خصوصاً بعض اہل حدیث اور اہل تشیع) اس بات کے قائل ہیں کہ اگر عورت عدالت کے ذریعے خلع لے اور عدالت فیصلہ سنا دے، تو وہ خلع نافذ ہو جائے گا، خواہ شوہر نے رضامندی ظاہر نہ بھی کی ہو۔ اس کی دلیل میں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ "أجازعمر الخلع دون السلطان"[2] یعنی حضرت عمرؓ نے بغیر حکومتی دائرہ اختیار کے خلع کو جائز قرار دیا۔ ایسے علماء کی رائے میں عدالتی خلع کے بعد نکاح ختم ہو جاتا ہے، اور عدت واجب ہوتی ہے۔ خلع کی عدت ان کے نزدیک ایک حیض ہے، جیسا کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔[3]

تاہم اصل نکتہ جس پر سب مکاتبِ فکر متفق ہیں وہ یہ ہے کہ اگر عورت عدالت سے خلع اس بنیاد پر حاصل کرے کہ شوہر ظالم ہے، نان نفقہ نہیں دیتا، ازدواجی تعلقات قائم نہیں کرتا، یا طلاق دینے سے انکاری ہے، اور یہ باتیں عدالت میں شرعی شہادت یا دیگر معتبر ثبوتوں سے ثابت ہو جائیں، تو ایسی صورت میں عدالتی فیصلہ تنسیخِ نکاح کے درجے میں معتبر ہوتا ہے۔ اسکے بعد وہ عورت شرعی طور پر عدت گزارنے کے بعد دوسرے نکاح کی مجاز ہوگی۔

البتہ اگر عورت خلع محض ناپسندیدگی، جذباتی فیصلے، یا جھوٹے دعوے کی بنیاد پر حاصل کرے اور شوہر کے خلاف شرعی طور پر ثابت شدہ وجوہات موجود نہ ہوں، اور عدالت نے بغیر تحقیق یا محض بیوی کے یک طرفہ دعوے

---

[1] ۔بدائع الصنائع، ج3، ص145

[2] ۔ صحیح بخاری، رقم الحدیث:5273

[3] ۔ترمذی، رقم الحدیث:1185

پر خلع کی ڈگری جاری کر دی ہو، تو ایسی صورت میں شوہر کی رضامندی کے بغیر وہ خلع شرعاً معتبر نہیں ہو گا۔ وہ عورت بدستور شوہر کے نکاح میں رہے گی، اس پر عدت لازم نہیں ہو گی، اور نہ ہی نکاحِ ثانی جائز ہو گا۔ ایسی صورت میں اگر وہ نکاحِ ثانی کرے تو وہ زنا کے زمرے میں آسکتا ہے، جو شرعی اعتبار سے انتہائی سنگین گناہ ہے۔

لہٰذا عدالتی خلع کی شرعی حیثیت کا تعین محض عدالتی ڈگری سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں موجود اسباب، شوہر کی رضامندی یا عدالت کی تحقیق، اور شرعی ثبوت سب کو دیکھنا ضروری ہے۔ شرعی لحاظ سے اگر خلع معتبر بنیاد پر ہو اور عدت گزاری جائے، تو عورت نکاحِ ثانی کر سکتی ہے؛ لیکن اگر خلع شرعی اسباب کے بغیر لیا گیا ہو تو ایسی عورت شوہر کی بیوی ہی شمار ہوتی ہے اور نکاحِ ثانی اس کے لیے جائز نہیں۔

ایسے حساس معاملات میں فتویٰ حاصل کیے بغیر عمل کرنا سخت خطرناک ہو سکتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہر عورت جو عدالتی خلع کی راہ اختیار کرے، کسی مستند مرکز افتاء سے رہنمائی لے تاکہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے مستقبل کا فیصلہ کر سکے۔ اس طرح خاندانی نظام بھی بگڑنے سے بچتا ہے اور عورت کی عزت، دین اور معاشرتی مقام بھی محفوظ رہتا ہے۔

فصل سوم

وراثت اور دیگر عائلی مسائل

اسلامی قانونِ وراثت خاندان کے افراد کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے عدل و انصاف پر مبنی تقسیمِ وراثت کا ایک جامع نظام فراہم کرتا ہے۔ یہ نظام اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ہر وارث کو اس کے شرعی حق کے مطابق حصہ ملے اور کسی بھی حق تلفی یا ناانصافی کا امکان نہ رہے۔ تاہم، عملی زندگی میں وراثت کے معاملات بعض اوقات پیچیدہ صورت حال اختیار کر لیتے ہیں، خاص طور پر ایسے معاملات جن میں قرآن و سنت میں براہ راست وضاحت موجود نہ ہو یا جہاں حالات جدید دور کے تقاضوں سے مختلف ہوں۔ ان پیچیدہ مسائل میں یتیم پوتے کی وراثت کا معاملہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق، اگر کسی شخص کا بیٹا فوت ہو چکا ہو اور اسکے پوتے موجود ہوں، تو وہ پوتے دادا کی وراثت کے براہِ راست حق دار نہیں ہوتے کیونکہ بیٹے کی عدم موجودگی میں دیگر ورثاء، جیسے بیٹیاں یا دیگر قریبی رشتہ دار، وارث بن جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ نہ صرف علمی بحث کا موضوع ہے بلکہ معاشرتی سطح پر تنازعات کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس فصل میں مذکورہ چار مراکز افتاء کے کردار کا جائزہ لیا جائے گا، خاص طور پر یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے زیر بحث لایا جائے گا۔

مرکز افتاء جامعہ بنوری ٹاؤن کا موقف

سوال نمبر 1: باپ کی موجودگی میں اگر بیٹے کا انتقال ہو جائے تو مرحوم کی اولاد کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟ برائے مہربانی راہ نمائی فرمائیں!

جواب: واضح رہے کہ احکم الحاکمین نے حقِ وراثت کا مدار فقر و تنگ دستی پر نہیں رکھا اور نہ ہی مالی لحاظ سے احتیاج و ضرورت پر رکھا ہے، بلکہ اسکا تعلق قرابت داری پر رکھا ہے، اوراس میں حکمت یہ ہے کہ انسانی ضروریات واحتیاج مختلف ہوتی ہیں، اور کون زیادہ محتاج ہے اسکے بارے میں تقسیم میراث کے وقت فیصلہ کرنا انتہائی دشوار ہے اور یہ انصاف کے پیمانے پر رکھتے ہوئے کسی کی احتیاج کے بارے میں فیصلہ کرنا انسان کیلئے ممکن نہیں، اور باہمی اختلاف کا باعث بھی ہے۔ پس قرابت داری پر مدار ہونے کی بنا پر میت کے ساتھ رشتہ میں جو زیادہ قریب ہو گا وہ استحقاقِ وراثت میں مقدم بھی ہو گا، اور اسکی موجودگی میں دیگر وہ رشتہ دار جو قرابت داری میں دور ہوں گے وہ محروم قرار پائیں گے۔ پوتا علی الاطلاق محروم نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت محروم ہوتا ہے جب کہ دادا کی مذکر اولاد موجود ہو۔

اور اسکی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے ترکے کی تقسیم میں اقرب فالا قرب کا اعتبار کیا ہے، اللہ رب العزت نے ورثہ اور انکے احوال و سہام کی تفصیل بتانے کے بعد واضح انداز میں فرمادیا ہے) آباءکم وأبناء کم لاتدرون أیھم أقرب

لکم نفعاًفریضۃمن اللہ ان اللہ کان علیماحکیما"تمہارے باپ دادااور بیٹے تم نہیں جانتے کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کونسا رشتہ تم سے زیادہ قریب ہے (اللہ تعالی کی حکمتِ بالغہ ہی اس کا فیصلہ کر سکتی ہے) اللہ تعالی نے یہ حصے ٹھہرادیے ہیں اور وہ (اپنے بندوں کی مصلحت کا) جاننے والا ہے (اپنے تمام احکام میں) حکمت والا ہے"۔

حاصل یہ ہے کہ قریب کا تعلق بعید کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے، شاخ کا حق پہلے ہے، شاخ در شاخ کا بعد میں، بیٹا چوں کہ پوتے کے مقابلہ میں اقرب ہے؛ اس لیے اصولاً وہی مستحق وراثت ہے؛ البتہ اگر میت کی وفات کے وقت اس کا کوئی بیٹا حیات نہ ہو اور پوتے پوتیاں حیات ہوں تو پوتے پوتیاں اس کے وارث بنتے؛ کیوں کہ اب ان سے اقرب کوئی موجود نہیں، یہ تو قانونی اور اصولی بات ہے، جسکو پیشِ نظر رکھے بغیر تقسیم ترکہ کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

البتہ انسان کو اپنی زندگی میں آثارِ موت و مرضِ وفات سے پہلے اپنے کل مال میں تصرف کا حق حاصل ہے، نیز موت کے بعد ایک تہائی مال کی وصیت کا حق بھی حاصل ہے، لہٰذا جو رشتہ دار شرعی طور پر وارث نہ بن رہے ہوں لیکن وہ مستحق و ضرورت مند ہوں تو آدمی اپنی زندگی میں انہیں ہبہ کر سکتا ہے اور مرنے کے بعد ایک تہائی ترکے کے اندر اندر ان کیلئے وصیت بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اخلاقی طور پر دادا کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ پوتوں کی گزر بسر کیلئے کوئی انتظام کر کے جائے، خواہ وہ رجسٹرڈ وصیت کی شکل میں ہو یا زندگی میں ہبہ کے ذریعہ ہو۔ نیز چچا کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کے ساتھ شفقت و ہمدردی اور ایثار کا معاملہ کرے، اور یتیموں کی کفالت کے متعلق جو بشارتیں آئیں ہیں ان کا مستحق بنے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ شریعت نے یتیم پوتے، پوتی کے حقوق کا خیال نہیں رکھا ہے، بلکہ یہ اسلامی احکام کا حسن ہے کہ ہر ایک کو اپنی حیثیت کے مطابق اس کا حق دیا گیا ہے، چناں چہ یتیم کی کفالت کا انتظام اسلامی تعلیمات میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اب بالفرض اگر کوئی دادا یا چچا ان بچوں کے حقوق کا خیال نہ کرے تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہوگی، ان کے اس رویہ کی بنا پر شریعت کے اصول پر انگلی اٹھانا ہرگز درست نہیں ہے۔

"عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال:قال رسول اللہ ﷺ:ألحقواالفرائض بأهلهافمابقي فهو لأولى رجل ذكر". (صحيح البخاري ٢/٩٩٧)
"وقدذكرالإمام أبوبكرجصاص الرازيؒ في أحكام القرآن،والعلامةالعيني في عمدة القاري: الإجماع على أن الحفيدلايرث مع الابن" (تكملة فتح الملهم ٢/١٨).
"ولوكان مدارالإرث على اليتم والفقروالحاجةلماورث أحدمن الأقرباءوالأغنياء،وذهب الميراث كله إلى اليتامى والمساكين ... وأن معيارالإرث ليس هوالقرابةالمحضة ولااليُتم والمسكنة،وإنماهوالأقربية إلى الميت". (تكملة فتح الملهم ٢/١٨-١٧)[1]

مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور کا موقف

سوال نمبر2: السلام علیکم! یتیم پوتے کی وراثت کے بارے میں راہنمائی کر دیں۔[2]

[1] ۔ دارالافتاء جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی، **فتوی نمبر**144008201915

[2] ۔: دارالافتاء جامعہ نعیمیہ، لاہور، سوال نمبر5110، تاریخ اشاعت: 23 اکتوبر 2018ء

جواب: میت کی مذکر اولاد کی موجودگی میں اس کا یتیم پوتا بحیثیتِ وارث حصہ نہیں پاتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تقسیمِ وراثت کے شرعی احکام کی بنیاد 'الاقرب فالاقرب' کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ اس اصول کی بناء پر یہ قانون طے کیا گیا ہے کہ اصحاب الفرائض (جن کے حصے قرآن وحدیث نے مقرر کر دیے ہیں) کو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی اموالِ وراثت میت کے قریب ترین رشتہ دار کو بطور عصبہ مل جائے گا۔ میت کیساتھ اسکے پوتے کی رشتہ داری اپنے باپ کے واسطے سے ہے جبکہ اس کی اپنی اولاد بلاواسطہ رشتہ دار ہے' اس لیے میت کے بیٹے کی موجودگی میں اس کی بیٹیاں اور بیٹے عصبہ بنیں گے اور وراثت کے اصولی مستحق ہوں گے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فهو لأولى رجل ذكر. یعنی اصحاب الفرائض کو ان کا حق دینے کے بعد جو باقی بچے وہ قریبی ترین مرد وارث کیلئے ہے۔ (صحیح البخاري، 2:997)

اس اصول کی بناپر ہی اگر میت کی وفات کے وقت اس کی کوئی مذکر اولاد زندہ نہیں ہے صرف بیٹیاں اور پوتا ہے تو بیٹیوں کو حصہ دینے کے بعد پوتا بطور عصبہ دادا کی وراثت سے حصہ پائے گا' کیونکہ اس صورت میں یہ قریبی ترین مرد رشتہ دار ہے۔ اسی طرح شریعت نے وصیت کا قانون بھی متعارف کروار کھا ہے' اس کی رو سے اگر کسی شخص کو خدشہ ہو کہ اس کی اولاد اسکے یتیم پوتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گی تو وہ اپنی زندگی میں ان کے لیے جتنی چاہے جائیداد ہبہ کر سکتا ہے یا ان کے حق میں اموالِ وراثت سے ایک تہائی مال تک کی وصیت کر سکتا ہے۔ ہمارے فقہاء کے نزدیک بعض حالات میں پوتے کیلئے وصیت کرنا مستحب اور بعض اوقات واجب بھی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کا نظامِ وراثت بڑی حکمتوں پر مبنی ہے۔ اس کے اصولوں کے مطابق اگر یتیم پوتے کو بیٹوں کے ساتھ بطور وارث حصہ نہیں دیا گیا ہے تو وقتِ ضرورت اس کی حاجت راوائی اور کفالت کے دیگر پختہ انتظامات کیے ہیں۔

مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا موقف

سوال نمبر 3: ہمارے والد صاحب محمد اسلم بھٹی یکم اپریل 2023ء کو فوت ہوئے ہیں، جب کہ ان کے تین بچے تھے، دو بیٹے (خورشید اسلم، نوید اسلم) اور ایک بیٹی۔ خورشید اسلم والد صاحب کی زندگی میں ہی مئی 2020 میں وفات پا گئے تھے، خورشید مرحوم کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ سوال یہ ہے والد صاحب کے بیٹے اور بیٹی کی موجودگی میں ان کے پوتے پوتیاں وارث ہوں گے کہ نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تحریری جواب مرحمت فرمائیں، تاکہ اسے کسی بھی جگہ پیش کیا جاسکے۔

جواب: الحمد لله وحده، والصلاة والسلام على من لا نبي بعده!

وراثت ملنے کی شرائط میں سے ہے، کہ وارث، موَرِّث کی وفات کے وقت زندہ ہو۔ جو رشتے دار موَرِّث کی

زندگی میں فوت ہو جاتے ہیں، ان کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ محمد اسلم بھٹی کا بیٹا خورشید اسلم چونکہ باپ کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا تھا، اس لیے وہ اپنے باپ کا وراث نہیں ہو گا۔ اسی طرح خورشید کی اولاد بھی اپنے دادا محمد اسلم کے وارث نہیں بن سکتے، کیونکہ دادا کی اولاد موجود ہے، تو اولاد کی موجودگی میں پوتے، پوتیوں کا حصہ نہیں ہوتا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الفرائض میں ایک عنوان قائم کیا ہے"باب ميراث ابن الابن إذا لم يكن ابن". (صحيح بخاری6735) 'پوتے کی وراثت اس وقت بنتی ہے جب بیٹے موجود نہ ہوں'۔ اور پھر اس کے ساتھ زید بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ کا فتویٰ بھی نقل کیا ہے، کہ پوتا اس وقت وارث بنتا ہے جب مرحوم کا کوئی بیٹا نہ ہو۔

البتہ ایسی صورتِ حال میں دادا کو چاہیے کہ اپنے یتیم پوتے پوتیوں کے لیے وصیت کر کے جائے، اسی طرح ان بچوں کے چچا اور پھوپھی کو چاہیے کہ اپنے بھائی کی اولاد کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہوئے، جو دے سکتے ہیں ضرور دیں، یہ یتیموں کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے، اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ بھی نیکی ہے، اسی طرح صلہ رحمی کی بھی ایک بہترین صورت ہے۔ وراثت کی تقسیم اور مالی معاملات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے:وَإِذَا حَضَرَ ٱلْقِسْمَةَ أُو۟لُوا۟ ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينُ فَٱرْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا۟ لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَلْيَخْشَ ٱلَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا۟ مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَـٰفًا خَافُوا۟ عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَلْيَقُولُوا۟ قَوْلًا سَدِيدًا(النساء:8-9) 'اور اگر تقسیمِ وراثت کے موقع پر (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم اور محتاج موجود ہوں تو اس میں سے کچھ انہیں بھی دے دو اور اچھی بات کرو، اور یتیموں سے معاملہ کرنے والے لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں بچے چھوڑ جاتے تو وہ ان بچوں سے متعلق کس قدر فکر مند ہوتے، لہذا انہیں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور سیدھی بات کہنی چاہیے۔[1]

مرکز افتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا موقف

سوال: اگر بیٹا باپ کی زندگی میں فوت ہو جائے تو کیا اس کا یتیم بیٹا (پوتا) دادا کی وراثت کا حق دار ہے؟

جواب: اگر اس یتیم بچے کے دادا کا کوئی اور بیٹا یا بیٹی زندہ موجود ہوں تو پھر اس یتیم پوتے کو نہیں ملے گا۔[2]

تجزیہ

وراثت اسلامی معاشرتی نظام کا ایک اہم حصہ ہے جس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ یہ نہ صرف افراد کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے بلکہ معاشرتی انصاف کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ وراثت کے مسائل میں مختلف مکاتب فکر جیسے دیوبندی، بریلوی، اور اہل حدیث کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں پایا جاتا، کیونکہ تمام مکاتب فکر قرآن و سنت کے اصولوں پر متفق ہیں۔ تاہم، پاکستان کا قانونی نظام ان اصولوں میں بعض تبدیلیاں اور اجتہادی فیصلے پیش کرتا ہے

[1] جامعہ سلفیہ فیصل آباد، فتوی نمبر:251 15 مئی,2023

[2] ۔جامعہ الکوثر اسلام آباد، انٹرویو

۔ جس پر تفصیلی گفتگو باب دوئم کے فصل دوئم میں گزر چکی ہے۔ اسلامی شریعت میں وراثت کے اصول بہت واضح ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ النساء (آیت 7-14) میں وراثت کی تقسیم کے اصول بیان کیے گئے ہیں، جن کے مطابق ہر وارث کو اس کا حق دیا جانا ضروری ہے۔

پوتے کی وراثت کا مسئلہ

پوتے کی وراثت کے بارے میں اسلامی فقہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ تمام مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ:

- **بیٹے کی موجودگی**

اگر میت کے بیٹے (پوتے کے والد) موجود ہوں، تو پوتے کو وراثت میں حصہ نہیں ملے گا کیونکہ بیٹا قریبی وارث ہے اور اس کی موجودگی میں پوتے کا حصہ معاف ہو جاتا ہے۔

- **بیٹے کی عدم موجودگی:**

اگر بیٹا باپ سے پہلے وفات پا چکا ہو، تو پوتے کو اس صورت میں دادا کی وراثت میں سے حصہ نہیں دیا جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ میت کے قریبی وارثوں میں شامل نہیں ہوتا ہے۔ یہ اصول تمام اسلامی مکاتب فکر کے ہاں یکساں ہیں، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

پاکستانی قانون اور پوتے کی وراثت

پاکستانی قانون میں پوتے کو وراثت میں حصہ دینے کا حق اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کے والد (یعنی میت کا بیٹا) وفات پا چکا ہو۔ اس صورت میں، پوتے کو اپنے والد کے حصے کی نمائندگی میں وراثت ملتی ہے، خواہ دیگر قریبی وارث موجود ہوں۔ یہ اجتہادی تبدیلی سماجی انصاف کے پیش نظر کی گئی ہے تاکہ یتیم پوتے کو اس کے والد کی جائیداد سے محروم نہ کیا جائے۔

شریعت اور قانون کے مابین ہم آہنگی اور تصادم

اسلامی شریعت کے مطابق، وراثت کے اصول قریبی وارث کی موجودگی میں دور کے وارث (پوتا) کو حصہ نہیں دیتے، مگر پاکستان کے قانون نے پوتے کو ایک خاص حالات میں حصہ دینے کی گنجائش رکھی ہے تاکہ سماجی انصاف کا تاثر پیدا ہو سکے۔ اس اجتہادی فیصلے کی بنیاد پر، پاکستانی قانون میں پوتے کو اس کے وفات شدہ والد کے والد یعنی دادا کی جائیداد میں حصہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ تاہم، یہ فیصلہ اسلامی فقہ کے عمومی اصولوں سے مختلف ہے، جو اس پر نظر ثانی کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے۔

ہیومن ملک بینک سے رضاعت کا حکم

دورِ جدید میں سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ طبّی میدان میں بھی نئی سہولیات سامنے آرہی ہیں۔ انہی میں سے ایک سہولت "ہیومن ملک بینک" (ماؤں کے دودھ کے بینک) کا قیام ہے، جس کا مقصد یتیم یاماں کے دودھ سے محروم بچوں کو غذائی مدد فراہم کرنا بتایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ سہولت انسانی ہمدردی اور طبی فلاح کے جذبے کے تحت پیش کی گئی ہے، لیکن اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کے کئی پیچیدہ شرعی پہلو ہیں، بالخصوص رضاعت سے جُڑے احکام اور ان سے متعلقہ حلت و حرمت کے مسائل۔

رضاعت کا تعلق محض بچے کو دودھ پلانے تک محدود نہیں، بلکہ اس سے شرعی رشتے قائم ہوتے ہیں، جو نکاح کے دائرے، وراثت اور دیگر خاندانی نظام پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ ایسے میں جب دودھ کو محفوظ کر کے مختلف بچوں کو فراہم کیا جاتا ہے اور دودھ پلانے والی عورت کی شناخت اور تعداد غیر واضح ہوتی ہے، تو یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

ایسے نازک اور دینی لحاظ سے حساس مسائل میں امت کی شرعی رہنمائی کیلئے ملک کے مختلف مکاتبِ فکر کے نمایندہ مراکز افتاء سرگرم عمل ہیں۔ یہ ادارے صرف فتوے جاری نہیں کرتے بلکہ سوسائٹی کو راہنمائی بھی دیتے ہیں کہ کیسے جدید سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شریعت کی حدود کو محفوظ رکھا جائے۔ ان میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور جامعۃ الکوثر اسلام آباد جیسے ممتاز ادارے شامل ہیں، جو دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور اہل تشیع مکاتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس تحقیقی جائزے میں انہی مراکز افتاء کے فتاویٰ، دلائل اور عملی موقف کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ موجودہ اسلامی معاشرے میں اس جدید سہولت کے حوالے سے ایک واضح اور مدلل شرعی مؤقف سامنے آسکے۔

مرکز افتاء جامعہ بنوریہ کراچی کا موقف

ماں کا دودھ بچے کے لیے ایک انمول دولت ہے

نومولود بچوں کے لیے ماں کا دودھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انمول تحفہ اور بہت بڑی نعمت ہے۔ اس میں بچے کے لیے تمام ضروری غذائی اجزاء مناسب مقدار میں اور بالکل موزوں درجۂ حرارت (temperature) کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ پیدائش کے بعد انسانی نشوونما کا یہ واحد ذریعہ ہے، جو انسان کو صحت مند بھی رکھتا ہے اور مختلف بیماریوں اور انفیکشن سے محفوظ رہنے میں بھی مدد کرتا ہے۔ یہ قدرت کا ایک نظام ہے کہ جب بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو براہِ راست سکھادیا جاتا ہے کہ اپنی غذا کیسے حاصل کرنی ہے۔ اگر بچہ پیدائش کے بعد خود سے پینا شروع نہ کرے تو کوئی طاقت، ٹیکنالوجی ایسی نہیں جو اس ننھی سی جان کو یہ سکھا سکے۔

ماں کے علاوہ کسی دوسرے دودھ کی ضرورت:

البتہ کچھ بچے جو وقت سے پہلے پیدا ہو جائیں، جن کو میڈیکل کی اصطلاح میں (premature baby) یا (preterm baby) کہا جاتا ہے، یعنی بچوں کی نارمل پیدائش کا دورانیہ جو 34 ہفتے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے، اس سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں تین درجات (levels) ہیں۔ پہلا درجہ 32 ہفتوں کے بعد سے لے کر 34 تک کا ہے۔ ایسے بچوں کو (Moderately preterm) کہتے ہیں، 28 ہفتوں سے لے کر 32 ہفتوں تک کے بچوں کو (Very preterm) کہتے ہیں جب کہ 28 ہفتوں سے پہلے جو بچے پیدا ہو جائیں ان کو (Extremely preterm) کہتے ہیں۔ ان میں سے بھی جو بچے 26 ہفتوں کے بعد ہوں ان کے بارے میں بھی امید ہوتی ہے کہ اگر ان کا پورا خیال رکھا جائے تو شاید یہ بچ جائیں، لیکن ان کے بچاؤ کا تناسب (survival rate) پاکستان میں اتنا اچھا نہیں ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ تناسب کافی بہتر ہے، اور وہاں 20 ہفتوں کے بعد والے بچوں کو بچانے پر بھی محنت کی جارہی ہے۔ ہمارے ہاں (Extremely preterm) بچوں کو اگر سانس نہ آرہی ہو تو مصنوعی سانس کی نلکی نہیں لگائی جاتی؛ کیوں کہ اس سے بچہ کو محض تکلیف ہوگی اس کے بچنے کی زیادہ امید نہیں ہوتی۔

ان بچوں کو جو 26 ہفتوں کے بعد یا 28 ہفتوں کے بعد پیدا ہوئے ہوں، ان کا اگر علاج کیا جائے، اور انفیکشنز سے بچایا جاسکے تو ان کے بچنے کی امید بہت بڑھ جاتی ہے۔ خاص طور سے وہ بچے جو 28 ہفتوں کے بعد ہوں۔ ان بچوں کو انفیکشنز سے بچانے کے لیے سب سے ضروری یہ ہے کہ ان کو صحت مند رکھا جائے، اور عمر کے حساب سے ان کا وزن اچھا بڑھ جائے۔ اور اس مقصد کے لیے ان کو کسی دوائی کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ صرف ماں کے دودھ کی ضرورت ہوتی ہے، اگر وہ ان کو ان کی ضرورت کے مطابق پوری مقدار میں مل جائے تو ان کی صحت برقرار رہتی ہے اور ان کا وزن بڑھ جاتا ہے۔

لیکن یہاں مشکل درپیش ہے کہ جن بچوں کی وقت سے پہلے پیدائش ہو جائے عام طور سے ایسے بچوں کی ماں کو شروع کے کچھ عرصہ دودھ نہیں آتا، یا پھر ان کی طبّی حالت اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ بچے کو دودھ پلاسکیں، مثلاً بچہ کی پیدائش آپریشن سے ہوئی (اور عام طور سے یہی صورتحال پیش آتی ہے) ماں الگ ہسپتال میں داخل ہے، اور بچہ کسی دوسرے ہسپتال میں ہے یا انتہائی نگہداشت وارڈ (NICU) میں ہے، عام طور سے ایسی صورت میں ماں کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلاسکیں۔ اسی طرح بعض اوقات حمل کے دوران یا پیدائش کے بعد ماں کچھ ایسی دوائیں استعمال کررہی ہوتی ہے جسکی وجہ سے بچے کو دودھ پلانا بچے کی صحت کے لیے صحیح نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ایک صورت اس مشکل کے پیش آنے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ پیدائش کے وقت بچے کا وزن دو کلو سے بھی کم ہوتا ہے ایسے بچوں کو (LBW) یعنی (Low birth weight کہتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے بچوں

(LWB) اور (preterm) بچوں میں خود دودھ چوسنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لیے انکوٹیوب کے ذریعے دودھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ماں کے دودھ نہ آنے کی ایک بڑی وجہ ہے، کیونکہ قدرتی طور پر جب بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ پینے کیلیے چوستا ہے تو دماغ کو سگنل ملتا ہے اور ایک ہارمون جس کو(prolactin) کہتے ہیں، یہ ریلیز ہو کر کام شروع کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے عورت کو دودھ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا نتیجہ ہے کہ عورت کے حاملہ ہونے سے پہلے یہ ہارمون اس میں نہیں ہوتا، اور بچہ کی پیدائش کا وقت قریب آنے پر یہ بننا شروع ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مختلف وجوہات کی بنیاد پر بچے کو ماں کا دودھ میسر نہیں ہوتا۔ ایسے بچوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے شروع زمانہ سے ہی دودھ پلانے والی مختلف خواتین کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ پھر گزشتہ صدی میں اس کے متبادل (alternative) کے طور پر فارمولا ملک (ڈبے کا دودھ) پیش کیا گیا۔

بطور متبادل، فارمولا ملک

مذکورہ بالا ضرورت کو پورا کرنے کیلئے 1943ء میں برطانیہ میں فارمولا ملک تیار کیا گیا، اور بہت جلد ایک مستقل انڈسٹری کی شکل اختیار کر گیا۔ لیکن جتنی تیزی سے اس نے ترقی کی اسی تیزی سے اسکے نقصانات سامنے آنے شروع ہو گئے۔ اصل میں ان بچوں میں دفاعی نظام بہت کمزور ہوتا ہے، یہ کسی بھی بیرونی چیز (foreign body) کو قبول نہیں کرتے۔ صرف انسانی دودھ ہی وہ واحد چیز ہے جو بآسانی ان کو ہضم بھی ہو جاتا ہے، اور ان کی نشو نما کا باعث بھی بنتا ہے، خاص طور سے ابتدائی چھ ماہ میں ان کو ماں کے دودھ کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ فارمولا ملک کے ذریعے اگرچہ ان کو مطلوب غذائیت فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن عام بچوں کے مقابلے میں ان بچوں میں یہ مسئلہ زیادہ آتا ہے کہ ان کا جسم اس کو قبول نہیں کرتا، جس کی وجہ سے ان کی بڑی آنت میں سوزش آجاتی ہے، اور وہ پھول جاتی ہے، اور کبھی وہ آنت پھٹ بھی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں بہت قوی امکان ہوتا ہے کہ بچہ کی جان چلی جائے، اور اگر وہ اس وقت بچ بھی گیا (survive) کر گیا تو بھی اس بات کا قوی اندیشہ رہتا ہے کہ مستقبل میں کسی مستقل معذوری کا شکار ہو جائے۔

بطور متبادل دوسری خواتین کا دودھ

اس ضرورت کے لیے ایک قدیم طریقہ جو بہت بہتر ہے کہ ان بچوں کو کسی دوسری خاتون کا دودھ فراہم کیا جائے، اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں بہت سی خواتین ایسی بھی ہیں جن کے ہاں بچہ کی ولادت نارمل طریقے سے ہوئی اور قدرتی طور پر ان کو بچہ کی ضرورت سے زیادہ دودھ آتا ہے، بلکہ اس اضافی دودھ کی وجہ سے بعض اوقات ان کو تکلیف ہوتی ہے اور چھاتی کے کینسر کے خدشات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ملی ہوئی اس نعمت کو ضائع ہونے، دودھ پلانے والی خاتون کو مختلف بیماریوں سے بچانے اور اس بچہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ بہت عمدہ اور بہترین متبادل ہے۔

ہیومن ملک بینک کا پس منظر اور اس کی ضرورت

اس انسانی دودھ کے حاصل کرنے کی پھر دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ضرورت کے وقت کسی ایسی خاتون کا انتظام کیا جائے جو بچہ کو دودھ پلا دیں۔ یہ قدرتی نظام کے بہت قریب اور ایسی صورت ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ یہ سب سے بہتر صورت ہے۔ لیکن اس میں چند مشکلات سامنے آئیں کہ جہاں مسئلہ ایک دو بچوں کا ہو وہاں تو ضرورت کے وقت ایسی خواتین کا ملنا نسبتاً کافی آسان ہوتا ہے۔ لیکن جہاں ایسے بچوں کا انتہائی نگہداشت کا وارڈ (NICU) ہو، اور وہاں موجود بچوں کی ایک بڑی تعداد مستقل رہتی ہو۔ وہاں ایسی خواتین کا انتظام کرنا بعض اوقات بچے کے سرپرست اور ہسپتال انتظامیہ کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

ایسی صورت میں عام طور سے ہسپتال کی انتظامیہ چونکہ کوئی مستقل انتظام نہیں کر سکتی اس لیے بچہ کے گھر والوں سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اپنے طور پر انتظام کرلیں۔ اور لوگ خود اس کا انتظام کرتے ہیں۔ لیکن لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کا انتظام نہیں کر پاتی، جس کی مختلف وجہ ہو سکتی ہیں، مثلاً وہ کسی دوسرے شہر سے آئے ہوئے ہیں، یا وہ یہاں کے رہائشی ہیں لیکن ان کی جان پہچان یا خاندان میں کوئی ایسی خاتون نہیں ہیں جو اس بچہ کو دودھ پلا سکیں۔ یا موجود ہیں لیکن وہ اس خدمت کے لیے راضی نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں صرف انسانی دودھ میسر نہ ہونے کی وجہ سے کئی معصوم جانوں کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔) اور یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ پاکستان نومولود بچوں کے mortality rate یعنی شرح اموات میں NPR کی رپورٹ کے مطابق top three ممالک میں شمار ہوتا ہے۔

اس ضروت کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے پہلے آسٹریا میں 1909ء میں پہلا ہیومن ملک بینک قائم کیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد 1960ء میں اس کو زیادہ عرصہ تک محفوظ رکھنے اور منتقلی میں آسانی کی غرض سے مختلف مراحل سے گذار کر پاؤڈر کی شکل میں لایا گیا۔ چنانچہ اس وقت بھی امریکہ میں سانفرانسسکو میں ایک ادارہ ہے، جہاں دنیا بھر کی خواتین اپنا دودھ فروخت کرتی ہیں اور وہ ادارہ اس انسانی دودھ کو پاؤڈر فارم میں ایکسپورٹ کرتا ہے، یہ مڈل ایسٹ میں بہت عام ہے۔ اس دودھ کو (Prolacta) کہتے ہیں۔ اس کا استعمال عام طور سے کیلریز (calories) بڑھانے کیلیے ہوتا ہے اور اس کو ماں کے دودھ کے ساتھ ملا کر دیا جاتا ہے۔ البتہ ہمارے ملک میں اس دودھ کا استعمال پاؤڈر شکل میں اس لحاظ سے ممکن نہیں کہ یہ غیر معمولی طور پر مہنگا پڑتا ہے۔ اور ایک اونس کی لاگت 100 سے 150 ڈالر ہے، اس حساب سے ایک بچہ کی ایک ہفتہ کی خوراک کا خرچہ 10000 ڈالر آتا ہے جو ظاہر ہے یہاں کے لوگ اور ادارے برداشت (afford) نہیں کرسکتے۔

اسلامی دنیا میں ہیومن ملک بینک

دنیا میں ملک بینک کا تصور مختلف حالات، عوامل اور تجربات پر تدریجاً(gradually) آتا گیا اور ویسٹرن کنٹریز اور ان کے بعد کئی غیر مسلم مشرقی ممالک میں بہت تیزی سے پھیل گیا۔ البتہ اسلامی ممالک میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی جس کی وجہ مسئلہ رضاعت اور اس کے نتیجے میں اختلاطِ نسب کے حوالے تحفظات تھے۔ اگرچہ رضاعت کا تصور اسلام کے لیے اجنبی نہیں ہے، بالخصوص عرب جو قرآن و احادیث مبارکہ کے اوّلین مخاطب ہیں وہاں اپنے بچوں کو بہتر نشو و نما کے لیے گاؤں دیہات بھیجنا، یہ ایک عام بات تھی۔ ہر سال مختلف دیہات کی خواتین شہر مکہ آتیں اور وہاں کے بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتیں۔ اور یہ بچے ان رضاعی ماؤں کا دودھ پیتے تھے۔ چنانچہ دائی حلیمہ رضی اللہ عنہا کا اپنی ساتھی خواتین کے ساتھ اسی غرض کیلئے مکہ مکرمہ تشریف لانا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے، اور یہ ان خواتین کا معمول کا واقعہ تھا کہ ہر سال شہر آتیں اور بچوں کو ساتھ لے جاتیں اس کے علاوہ بھی مختلف مصلحتوں کی بنیاد پر دوسری خواتین سے دودھ پلوایا جاتا چنانچہ نبی کریم ﷺ نے دائی حلیمہؓ کے علاوہ ابو لہب کی باندی حضرت ثوبیہؓ کا بھی دودھ پیا تھا، اور حضرت ثوبیہؓ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی دودھ پلایا تھا جو کہ آپ ﷺ کے چچا تھے، اور اس لیے یہ چچا آپکے رضاعی بھائی بھی تھے، نیز ان صحابیہ خاتونؓ نے حضرت ابو سلمہ المخزومیؓ کو بھی دودھ پلایا تھا۔

حاصل یہ کہ اسلام میں یہ تصور نہ تو غیر معروف ہے نہ کوئی ایسا مکروہ اور ناپسندیدہ فعل ہے جس کی اجازت صرف انتہائی نامساعد حالات میں دی گئی ہو، بلکہ یہ معمول کی عام سی بات تھی۔ البتہ عرب کے حالات اور غیر معمولی حافظہ کی وجہ سے ان سارے رشتوں کو لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اول تو اس وقت آبادی بہت کم تھی، دوسرا عرب وہ قوم تھی جس کو اپنے گھوڑوں تک کے پورے پورے نسب یاد ہوتے تھے، طویل اشعار پر مبنی طویل قصیدے ایک ہی نشست میں یاد کر لیا کرتے تھے۔

پاکستان میں ہیومن ملک بینک کی بنیاد

نومولود بچوں کے حوالے سے مذکورہ بالا مسئلہ پاکستان میں بھی کافی عرصہ سے پیش آرہا تھا، ورلڈ بینک گروپ کی 2022ء کی رپورٹ کے مطابق ہر 1000 میں سے 39 نومولود بچے مر جاتے ہیں ، اور یونیسیف کی 2010ء کی رپورٹ کے مطابق ہر 100 میں سے 16 بچے preterm پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف ماہرین اس کے لیے مناسب حل کی تلاش اور جستجو میں رہے ہیں۔ دیگر اسلامی ممالک جہاں ہیومن ملک بینک قائم کرنے کے حوالے سے کوشش کی گئی تھی۔ ان کی کوششوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں اس بات پر غور کیا گیا کہ کیا پاکستان میں ایسا ملک بینک قائم کرنا ممکن ہے؟ اور اس حوالے سے اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ کیونکہ ہمارے دین نے دوسروں کی مدد کرنے کی بھی بہت ترغیب دی ہے لیکن ایسی مدد کرنا جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی ہوتی ہو، ہرگز جائز نہیں۔ ایسی مدد

صرف ظاہری طور پر اچھی معلوم ہو سکتی ہے لیکن جب اسلام نے اس سے منع کیا ہے تو ممکن نہیں کہ وہ انسانیت کے لیے بہتر چیز ہو۔ چنانچہ پروفیشنلز کے ساتھ ساتھ علماء کرام کی طرف رجوع کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ اس سلسلہ میں ایک طریقہ کار بنایا گیا ہے، جس میں چند شرائط اور احتیاطی پہلوؤں کو اختیار کرتے ہوئے انسانی دودھ کو محفوظ کرنے کیلیے ہیومن ملک بینک قائم کرنے کا ارادہ ہے۔

SICHN میں ہیومن ملک بینک قائم کرنے کے لیے تیار کی گئی شرائط اور ایس او پیز کا خلاصہ:

1۔ جن خواتین سے دودھ لیا جائے گا، اور جن بچوں کو دیا جائے گا ان سب کا مکمل ڈیٹا (نام، ولدیت، شناختی، پتہ، فون نمبر وغیرہ) ویب سائٹ اور ہارڈ کاپی کی شکل میں ہسپتال کے ریکارڈ میں محفوظ کرنے کے ساتھ (بچے اور خواتین دونوں کے) متعلقہ خاندان کے ساتھ شئیر کیا جائے گا۔

2۔ دودھ کی ایک لاٹ میں زیادہ سے زیادہ 3 سے 4 خواتین کا دودھ شامل کیا جائے گا، اور اس سے صرف ایک بچہ کو دودھ دیا جائے گا، البتہ ناگزیر حالت میں ایک لاٹ سے 2 بچوں کو دینے کی نوبت آسکتی ہے اور اس صورت میں کوشش کی جائے گی کہ دونوں بچے لڑکے ہوں یا دونوں لڑکیاں ہوں، اور دونوں بچوں کا ڈیٹا متعلقہ خواتین کے ساتھ شئیر کیا جائے گا۔

3۔ اس دودھ کی فراہمی کے بدلے کوئی فیس نہیں لی جائے گی، نہ ہی دودھ عطیہ کرنے والی خواتین کو اس کے بدلے کوئی رقم یا اجرت فراہم کی جائے گی۔

4۔ حتی الامکان مسلم بچوں کو غیر مسلم خواتین کا دودھ نہیں دیا جائے گا۔

5۔ ڈیٹا شئیر کرنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ خاندان کے افراد کو مسئلہ رضاعت زبانی بھی سمجھایا جائے گا۔

6۔ تمام طبی پہلوؤں اور احتیاط کو مد نظر رکھا جائے گا۔

7۔ اس ملک بینک سے دودھ کی فراہمی صرف ان بچوں کو کی جائے گی جن کو واقعی ضرورت ہو، جس کا معیار یہ ہے کہ وہ بچہ Preterm ہو، اپنے طبعی وزن سے کم ہو، یا دودھ چوسنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اور آن ڈیوٹی ڈاکٹر تحریری طور پر اس بات کی تصدیق کر دیں، اور کوئی خاتون میسر نہ ہوں جو اس کو براہِ راست دودھ دے سکیں۔

8۔ ان باتوں پر عمل در آمد باقاعدہ کسی عالمِ دین، مفتی کی زیرِ نگرانی کیا جائے گا۔

9۔ یہ دستاویز اس مخصوص ادارے کے لیے ہے، کسی دوسرے ادارے کو اگر ہیومن ملک بینک کی ضرورت پیش آئے تو علماء کرام سے اپنے ادارے کیلیے مستقل طور پر علیحدہ سے اجازت حاصل کرنی ضروری ہوگی۔

10۔ جو خواتین ایک دفعہ ملک ڈونیشن کر چکی ہوں، اگر وہ دوبارہ کسی دوسرے بچے کے لیے ملک ڈونیشن کرنا چاہیں تو اول تو کوشش کی جائے کہ ان سے دوبارہ حتی الامکان ڈونیشن نہ لی جائے، اور اگر مجبوراً لینے کی

نوبت آجائے تو اس بات کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جائے، اور خاتون کے علاوہ پچھلے بچے اور موجود بچے کے گھر والوں کا ڈیٹا بھی دونوں بچوں کے خاندان میں شئیر کیا جائے، نیز اس بات کا لازمی اہتمام کیا جائے کہ دوبارہ آنے والی خاتون کی ملک ڈونیشن اگر بچہ (Male) کو دی گئی تھی تو اس بار بھی بچہ (Male) کو ہی دی جائے اور اگر پہلے بچی کے لیے استعمال ہوئی تھی تو آئندہ بھی صرف بچیوں کے لیے ہی استعمال کی جائے۔

11۔ اگر کسی بھی مرحلہ پر ان شرائط کی پابندی نہیں پائی گئی، اور تنبیہ کے باوجود اس کو درست نہیں کیا گیا تو اسلامی کونسل اور علماء کرام اپنی دی ہوئی اجازت واپس لینے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔

سوال: آپ حضرات علماء کرام سے سوال یہ ہے کہ کیا نومولود بچوں کی جان بچانے کے لیے اس طرح کا شعبہ مندرجہ بالا اصول وضوابط کے ساتھ کھولا جاسکتا ہے؟

اور اگر یہ شرعاً درست نہیں تو اس میں مزید کیا تبدیلی لائی جائے؟

جواب: سوال میں ہیومن ملک بینک کے قیام کے لیے جس بات کو بنیاد بنایا گیا ہے وہ قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کے لیے ماں کے دودھ کا ضروری ہونا ہے، یہ بات ایک مسلم حقیقت ہے کہ غذائیت، شفافیت اور افادیت میں ماں کے دودھ کا کوئی بدل نہیں، یہ دودھ ہر بچہ کے لیے ناگزیر ہے، خاص طور پر وہ بچہ جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا ہو اس کے لیے اس دودھ کی ضرورت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، ان سب باتوں کی نہ صرف یہ کہ شریعت نے رعایت رکھی ہے، بلکہ اس کا بدل بھی دیا ہے، چناں چہ کسی بھی بچے کے لیے ضرورت کے موقع پر اپنی ماں کے علاوہ دوسری عورتوں کے دودھ کو پینا جائز رکھا گیا ہے(1)؛ تاکہ نومولود کی ضرورت بسہولت پوری ہوسکے اور اس میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا مذکورہ ضرورت کے پیشِ نظر ہیومن ملک بینک کا قیام درست ہو گا؟ شریعت کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ فقہاء کی تصریح کے مطابق بچوں کو ماں کا دودھ پلانا محض ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے، ورنہ انسان کا دودھ انسان کا جزء ہونے کی وجہ سے قابلِ احترام اور ناقابلِ استعمال ہونا چاہیے تھا، (2) پھر جب ضرورت کی وجہ سے اس کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہے تو ضرورت کے بقدر ہی اس کی اجازت دی جائے گی(3) اور ضرورت اس صورت میں پوری ہو جاتی ہے جب بچے کو ماں یا ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت کا دودھ براہِ راست پلا دیا جائے، جیسا کہ ضرورت اور مجبوری کے موقع پر جان بچانے کے لیے حرام اشیاء کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، (4) لیکن یہ اجازت ایک محدود مقدار میں ہے، (5) یہ مطلب نہیں کہ باقاعدہ حرام کھانوں کے لیے ادارے کھول دیے جائیں اور حرام کھانوں کے ضرورت مند آکر اس کو حسبِ ضرورت لے جایا کریں۔

اسی وجہ سے فقہاء نے صراحت فرمائی ہے کہ مدتِ رضاعت کے بعد ماں کا دودھ پلانا حرام ہے، اس لیے کہ یہ انسان کا جزء ہے، محض ضرورت کی بنیاد پر اس کا استعمال روا رکھا گیا تھا، یہ ضرورت مدتِ رضاعت کے اندر پائی گئی تو اجازت بھی دی گئی، ضرورت پوری ہونے کے بعد استعمال کی اجازت نہ ہو گی۔(6)

ضرورت کے موقع کیلئے جو اجازت دی جاتی ہے ان کو ضابطہ کی شکل نہیں دی جاتی، ورنہ وہ رسمی بن کر معمول بن جایا کرتی ہیں، اور مسئلہ ہذا میں اگر ماں کا دودھ مختلف خواتین سے جمع کر کے متفرق بچوں کو دیا جانے لگا تو اس سے رضاعی رشتوں میں خلط کا بہت قوی اندیشہ ہے اور رضاعت کے باب میں اگر کبھی کوئی شبہ پیدا ہو جائے تو اس کا بھی اعتبار کرتے ہوئے رضاعی رشتہ کو ثابت مانا جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک سیاہ فام خاتون نے یہ دعوی کیا کہ انہوں نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی کو دودھ پلایا ہے تو حضرت عقبہ نے اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا چہرہ مبارک پھیر لیا اور مسکرا کر فرمایا: اب جب کہ ایک بات کہہ دی گئی تو اب اپنی بیوی کو اپنے سے جدا کر دے(7)، یہی علت بینک ہذا کے قیام کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ معلوم ہوتی ہے۔

نیز فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ عورتوں پر لازم ہے کہ دوسری عورتوں کے بچوں کو بغیر کسی ضرورت کے دودھ نہ پلائیں، لیکن اگر کسی وجہ سے دودھ پلا دیا ہو تو اسکو اہتمام کیساتھ یاد رکھنا چاہیے یا لکھ لینا چاہیے(8) کیوں کہ دودھ پلانے کی وجہ سے دودھ پلانے والی عورت اس بچے کی ماں بن جاتی ہے اور اس کے حقیقی بچے دودھ پلائے گئے بچوں کے بھائی بہن بن جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا آپس میں رشتہ اور نکاح جائز نہیں ہوتا۔(9) باقی رشتوں کو خلط سے محفوظ کرنے کے لیے سوال میں جن شرائط کا ذکر کیا گیا ہے وہ شرائط واقعۃً باریک بینی سے مرتب کی گئی ہیں، اور سائنس کے اس دور میں ان شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے تمام ریکارڈ کو محفوظ رکھنا کچھ دشوار نہیں، لیکن ہسپتال انتظامیہ اور ادارے کے سامنے مذکورہ مسئلہ اہمیت کا حامل ہے اس لیے وہ تو اس کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ہر چیز کو مرتب بھی کریں گے، محفوظ بھی رکھیں گے اور دودھ لینے والوں کو مسئلہ سے آگاہ بھی کریں گے، لیکن قوی اندیشہ ہے کہ دودھ لینے والے ان باتوں کا اہتمام نہ کریں، ریکارڈ محفوظ نہ رکھ سکیں یا کچھ عرصہ تک ریکارڈ محفوظ رکھنے کے بعد مزید کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ ان مسائل کو بھلا بیٹھیں یا دودھ لینے والے تو ان مسائل کا اہتمام کریں اور انکی اولاد مسئلہ کی حساسیت سے ناواقف ہونے کی بناء پر اس میں لاپرواہی کرنے لگیں۔

پھر سوال میں اس بات کا بھی ذکر کیا گیا کہ ماں کا دودھ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہر سال بیسیوں قبل از وقت پیدا ہونے والے بچے وفات پا جاتے ہیں جس کی وجہ سے ملک بینک کا قیام ناگزیر ہے، لیکن یہ دلیل بھی کمزور ہے، اس کا کچھ بیان اشارۃً گزشتہ سطور میں ہوا، جس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت کی وجہ سے جو امور جائز قرار دیے

جاتے ہیں ان میں ضرورت کے تحقق سے پہلے اس کی تیاری اور اس کا نظم بنا دینا شرعی اصولوں کی رو سے درست نہیں، ضرورت کے تحقق کے بعد ہی شرعی حدود کے اندر اس کا انتظام کیا جائے گا اور اس انتظام سے مراد یہ ہے کہ کسی ایسی خاتون کا بندوبست کر دیا جائے جو بچہ کو دودھ پلا دے، بچوں کی پیدائش سے پہلے محض موہومی بیماری اور متوقع ضرورت کے پیشِ نظر شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ماؤں کا دودھ جمع کرنا اور بینک کا انتظام کرنا شرعی اصولوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہو گا۔

شرائط میں سے شرط نمبر 10 میں یہ لکھا گیا کہ ایک خاتون کا دودھ ایک مرتبہ اگر لڑکے کے لیے دیا گیا تو آئندہ بھی کسی لڑکے ہی کو دیا جائے گا (تاکہ مستقبل میں خلطِ نسب کی وجہ سے رشتوں میں خرابی نہ آئے)، اگر مان لیا جائے کہ اس شرط کی رعایت ممکن ہو سکے گی، پھر بھی غیر یقینی اور غیر متحقق امر کے لیے شرع کے اصول سے ہٹ کر ایک چیز کا انتظام کرنا لازم آتا ہے اور ایسا کرنا درست نہیں۔

حاصل یہ کہ ہیومن ملک بینک قائم کرنا جائز نہیں، ضرورت مند بچوں کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو اسلام کے ابتدائی زمانہ سے اختیار کیا جا رہا ہے، یعنی: کسی خاتون کا انتظام۔

(1) **فتاویٰ ہندیہ میں ہے**":امرأة ترضع صبيابغيرإذن زوجها يكره لها ذلك إلا إذا خافت هلاك الرضيع فحينئذلابأس به كذافي فتاوى قاضي خان.(كتاب الكراهية،الباب الثلاثون،جلد:5،صفحه:372)

(2) **مبسوط سرخسی میں ہے**":ولانسلم أن اللبن غذاءعلى الإطلاق وإنما هو غذاء في تربية الصبيان لأجل الضرورة فهم لايتربون إلابلبن الجنس عادةكالميتةتكون غذاءعند الضرورة)".كتاب الاجارات،باب اجارةالظئر،جلد: 15،صفحه: 126،طبع: دارالمعرفة)

العناية شرح الهداية میں ہے":والثاني مسلم لأنه غذاء في تربية الصغار لأجل الضرورة فإنهم لا يتربون إلا بلبن الجنس عادة". (كتاب البيوع،باب البيع الفاسد،جلد:6،صفحه:423 ،طبع : دارالفكر)

(3) **الأشباه والنظائر لابن نجيم میں ہے**":الثانية: ما أبيح للضرورة يقدر بقدرها ولذا قال في أيمان الظهيرية: إن اليمين الكاذبة لاتباح للضرورةوإنماىباح التعريض،(انتہی).يعني؛لاندفاعها بالتعريض،ومن فروعه: المضطرلايأكل من الميتةإلاقدرسدالرمق)".الفن الاول،صفحه:73،طبع:دارالكتب العلمية)

درر الحكام في شرح مجلة الأحكام میں ہے" :(المادة 22) : ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها.أي أن الشيء الذي يجوز بناء على الضرورة يجوز إجراؤه بالقدر الكافي لإزالة تلك الضرورة فقط، ولا يجوز استباحته أكثر مما تزول به الضرورة. طبع: دارالكتببشخصا كان في حالة الهلاك من الجوع يحق له اغتصاب ما يدفع جوعه من مال الغير لا أن يغتصب كل شيء وجده مع ذلك الغير، كذلك جوز البيع بخيار التعيين في شيئين أو ثلاثة لا أزيد كأربعة أشياء أو خمسة، إذ لا ضرورة تدعو للزيادة؛ لأن ما أبيح للضرورة إنما يتقدر بقدرها(".المقالةالثانية،المادة 22،جلد:1،صفحه: 38 ،طبع:دارالجيل)

(4) **فتاوی شامی میں ہے**":اختلف في التداوي بالمحرم،وظاهرالمذهب المنع كمافي رضاع البحر،لكن نقل المصنف ثمةوهنا عن الحاوي: وقيل: يرخص إذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان، وعليه الفتوى. مطلب في التداوي بالمحرم (قوله اختلف في التداوي بالمحرم) ففي النهاية عن الذخيرة يجوز إن علم فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر. وفي الخانية في معنى قوله عليه الصلاة والسلام إن الله لم يجعل شفاءكم فيماحرم عليكم كما"رواه البخاري" أن مافيه شفاءلابأس به كمايحل الخمر

للعطشان في الضرورة،وكذااختاره صاحب الهداية في التجنيس فقال: لو رعف فكتب الفاتحة بالدم على جبهته وأنفه جاز للاستشفاء،وبالبول أيضا إن علم فيه شفاءلابأس به،لكن لم ينقل وهذا؛لأن الحرمةساقطةعندالاستشفاء كحل الخمرو الميتة للعطشان والجائع.اهـ من البحر.وأفادسيدي عبدالغني أنه لا يظهر الاختلاف في كلامهم لاتفاقهم على الجواز للضرورة، واشتراط صاحب النهاية العلم لاينافيه اشتراط من بعده الشفاءولذا قال والدي في شرح الدرر:إن قوله لا للتداوي محمول على المظنون وإلا فجوازه باليقيني اتفاق كما صرح به في المصفى.اهـ.أقول:وهوظاهرموافق لما مرفي الاستدلال، لقول الإمام:لكن قد علمت أن قول الأطباء لا يحصل به العلم. والظاهر أن التجربة يحصل بها غلبة الظن دون اليقين إلاأن يريدوا بالعلم غلبة الظن وهو شائع في كلامهم تأمل(".كتاب الطهارة ، باب المياه ، جلد : 1 ، صفحه : 210 ، طبع :سعيد)

(5)**احکام القرآن للجصاص میں ہے**":باب في مقدارمايأكل المضطر،قال أبو حنيفةوأبو يوسف و محمدوزفروالشافعي فيما رواه عنه المزني:لايأكل المضطرمن الميتةإلامقدارمايمسك به رمقه(من سورة البقرة،باب في مقدارمايأكل المضطر،جلد:1،صفحه : 158،طبع: دارالكتب العلمية)

(6)**فتاوی شامی میں ہے**":ولم يبح الإرضاع بعد مدته) لأنه جزء آدمي والانتفاع به لغير ضرورة حرام على الصحيح شرح الوهبانية)".كتاب النكاح،باب الرضاع،جلد:3 ،صفحه: 211،طبع: سعيد)

(7) **صحیح البخاری میں ہے**":عن عقبةبن الحارث،قال:تزوجت امرأة،فجاءت امرأةفقالت:إني قدأرضعتكما،فأتيت النبي ﷺ فقال:«وكيف وقدقيل،دعهاعنك»أونحوه".(كتاب الشهادات،باب المرضعة،جلد: 3،صفحه: 173 ،طبع :السلطانية)

(8)**البحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے**":وفي الولوالجية: والواجب على النساء أن لايرضعن كل صبي من غير ضرورة، فإذا فعلن فليحفظن أوليكتبن اهـ".(كتاب الرضاع ،جلد : 3، صفحه : 238)

فتاویٰ ہندیہ میں ہے":والواجب على النساءأن لايرضعن كل صبي من غيرضرورة وإن فعلن ذلك فليحفظن أويكتبن، كذا سمعت من مشايخي رحمهم الله تعالى كذافي المضمرات".(كتاب الرضاع ،جلد:1 ،صفحه: 345،طبع :دار الفكر)

(9)**بدائع الصنائع میں ہے**":والأصل في ذلك أن كل اثنين اجتمعا على ثدي واحد صارا أخوين أو أختين أو أخا وأختا من الرضاعةفلايجوزلأحدهماأن يتزوج بالآخرولابولده كما في النسب ... والأصل في هذه الجملة قول النبيﷺ«يحرم من الرضاع مايحرم من النسب»فيجب العمل بعمومهاإلاماخص بدليل".(كتاب الرضاع،فصل في المحرمات بالرضاع،جلد:4،صفحه:2،طبع: دار الكتب العلمية)

فتاویٰ شامی میں ہے":يحرم من الرضاع أصوله وفروعه وفروع أبويه وفروعهم،وكذافروع أجداده وجداته الصلبيون،وفروع زوجته وأصولها وفروع زوجها وأصوله وحلائل أصوله وفروعه."(كتاب النكاح،فصل في المحرمات،جلد:3 صفحه: 31)[1]

مرکز افتاء جامعہ نعیمیہ لاہور کا موقف

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محکمہ صحت سندھ کی جانب سے ملک کا پہلا" ہیومن ملک بینک(milk bank)"(ماں کے دودھ کا ڈونر بینک) صوبائی دارالحکومت کراچی کے سرکاری ہسپتال میں کھول دیا گیا ہے۔ دنیا بھر میں مختلف ہسپتالوں میں انسانی دودھ کے بینک بنیادی طور پر نوزائیدہ انتہائی نگہداشت ہے یونٹس(NICUs)میں قبل از وقت یا بیمار بچوں کو دودھ فراہم کرنے کے لیے کام کرتے ہیں لیکن پاکستان میں

[1] ۔جامعہ بنوریہ کراچی، **فتوی نمبر**144604100427 :

ایسے بینک اور سہولیات دستیاب نہیں۔ تاہم اب سندھ میں پہلے ہیومن ملک بینک کو یونیسیف کے تعاون سے کھولا گیا ہے جہاں عورتیں ان نوزائیدہ بچوں کے لیے دودھ جمع کرا سکیں گیں جو بچے کسی بھی وجہ سے ماؤں کا دودھ پینے سے محروم رہ گئے ہوں۔ ان کو جمع شدہ دودھ پلایا جائے گا تاکہ ان کی جان بچائی جاسکے۔ سننے میں آیا ہے کہ ملک کے پہلے ہیومن ملک بینک کے عملے کو ترتیب کے لیے متعدد اسلامی ممالک میں بھیجا جائے گا۔ کیا ہیومن ملک بینک بنانا جائز ہے؟ کیا عورتیں اس بینک کو دودھ فروخت کر سکتی ہیں؟ کیا اس بینک کے دودھ پینے سے حرمت رضاعت کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا؟ رضائی بہن بھائی میں تمیز نہیں ہو سکے گی۔ اس حوالے سے شرعی رہنمائی فرمائیں ہیومن ملک بینک بنانا جائز ہے؟ اس بینک کے شرعی حوالے سے کیا نقصانات ہو سکتے ہیں؟

الجواب بعون الملک الوهاب اللهم هداية الحق الصواب

(1) بچہ جب پیدا ہوتا ہے اسے ماں کی دودھ کی ضرورت ہوتی ہے ماں کے دودھ میں اس کیلیے بھرپور غذائیت ہوتی ہے۔ اس دودھ میں ہر وہ چیز موجود ہوتی ہے جو بچی کی نشوونما میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے بایں وجہ شرع شریف نے ماں کو دو سال تک دودھ پلانے کے لیے پابند کر دیا ہے تاکہ بچے کی بنیادی طور پر نشوونما ٹھیک طریقے سے ہو سکے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالی ہے "والولدت يرضعن اولدهن حولين كاملين لمن اراد ان يتم الرضاعة" "اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ حکم اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے۔" (سورۃ البقرۃ، آیت:233) ایک اور مقام پر ارشاد بانی عزوجل ہے۔ "وفصله فی عامین" "اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے۔" (سورۃ لقمان، آیت:14) مکتوبہ والا دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ دو سالہ تک بچے کو دودھ پلانا ماں کی شرعی ذمہ داری ہے۔ اور دو سال کے بعد دودھ پلانا شرعا جائز نہیں جیسا کہ روایت میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال كان يقول "لارضاع بعد حولين كاملين" "حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں پورے دو سال کے بعد رضاعت نہیں" (السنن الکبری ج7، ص:457، حدیث 15423، مکتبہ دارالبائز مکہ) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ "لارضاعة الاماكان في الحولين "رضاعت وہ ہے جو دو سال کے اندر ہو۔" (موطا امام مالک، کتاب الرضاع، ج:2، ص 607 حدیث:267 ادارا احیاء التراث العربی) مکتوبہ احادیث سے ثابت ہوا کہ دو سال کے بعد دودھ پلانا جائز نہیں۔ لیکن اگر بچے کو اڑھائی سال تک دودھ پلایا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ فقہ اسلامی کی معتبر کتاب ہدایہ میں ہے، "ثم مدة الرضاع ثلثون شهرا عند ابی حنيفة" "حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ہاں دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ یعنی اڑھائی سال ہے۔ (ہدایہ، ج:2 ص:369، کتاب الرضاع، مکتبہ رحمانیہ لاہور) مفتی اعظم ہند مفتی امجد علی اعظمیؒ لکھتے ہیں۔ "بچہ کو دو برس تک دودھ پلایا جائے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دودھ پینے والا لڑکا ہو یا لڑکی یہ

حکم دودھ پلانے کا ہے اور نکاح حرام ہونے کے اڑھائی برس کا زمانہ ہے یعنی دو برس کے بعد اگرچہ دودھ پلانا حرام ہے مگر اڑھائی برس کے اندر اگر دودھ پلا دے گی تو حرمت نکاح ثابت ہو جائے گی اور اس کے بعد اگر پیا تو حرمت نکاح نہیں اگرچہ پلانا جائز نہیں ہے۔" (بہار شریعت ج:2، حصہ:7 حصہ:7، ص:36 مکتبۃ المدینہ کراچی)

(2) بچہ / بچی مدت رضاعت میں کسی بھی عورت کا دودھ پی لے چاہے ایک گھونٹ ہو یا ایک قطرہ اس سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی اور وہ بچہ / بچی اس خاتون کی رضاعی اولاد کہلائے گی اور جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔"وامھتکم التی ارضعنکم واخوتکم من الرضعۃ" "اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں (بھی تم پر حرام ہیں۔)" (سورۃ النساء، آیت:23) امام ترمذی اپنی سند سے روایت لائے ہیں۔"عن علی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ حرم من الرضاع ماحرم من النسب" "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : بے شک اللہ تعالی نے رضاعت سے ان رشتوں کو حرام کیا جو نسب سے حرام ہے۔" (جامع الترمذی، ج:1، ص :217، ابواب الرضاع مکتبہ رحمانیہ لاہور) امام مسلم اپنی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو کچھ نسب سے حرام ہے وہ دودھ سے بھی حرام ہے۔" (صحیح مسلم، ج:11، ص:538 مکتبہ رحمانیہ لاہور) فقہ اسلامی کی معتبر کتاب فتاوی عالمگیر میں ہے "کل من تحرم بالقرابۃ والصہریۃ تحرم بالرضاع" "ہر وہ رشتہ جو قرابت وصہریت کی وجہ سے حرام ہو جاتا ہے وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے" (فتاوی عالمگیری ، ج:1 ص:277، مکتبہ حقانیہ بوغرہ روڈ چمن)

حضرت امام مالکؒ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں۔"عن عبداللہ بن عباس انہ کان یقول ماکان فی الحولین وان کانت مصۃ واحدۃ فانہ یحرم" "حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو دو سالوں کے درمیان دودھ پیئے اگرچہ ایک چسکی ہو بے شک وہ حرمت رضاعت کو ثابت کر دیتا ہے۔" (موطا امام مالک، کتاب الرضاع، ص:535 قدیمی کتب خانہ کراچی) ایک اور حدیث مبارک ہے۔"عن ابرا ھیم بن عقبہ انہ سئال سعیدبن المسیب عن الرضاعۃ فقال سعید کل ماکان فی الحولین وان کانت قطرۃ واحدۃ فھویحرم" "حضرت ابراہیم بن عقبہ سے روایت ہے کہ آپ نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے رضاعت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: دو سالوں کے درمیان جو دودھ پیئے گا اگرچہ ایک قطرہ ہو حرمت رضاعت کو ثابت کر دے گا۔" (موطا امام مالک، ص:536 قدیمی کتب خانہ کراچی) امام نسائی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔"ان علیاوابن مسعودکانا یقولان یحرم من الرضاع قلیلہ وکثیرہ" "بے شک حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہما فرمایا کرتے تھے کہ حرمت رضا عت ثابت ہو جاتی ہے قلیل اور کثیر دودھ پینے سے۔" (سنن نسائی، ج:2، ص:82 مکتبہ یادگار شیخ لاہور) محکمہ صحت

سندھ کی طرف سے عورتوں کا دودھ جمع کرنے کے حوالے سے جو بینک قائم کیا گیا ہے شرعی نقطہ نظر سے یہ ٹھیک نہیں۔اس میں کئی طبی و شرعی خرابیاں ہیں۔

(1)عورتوں کا دودھ نکال کر جمع کر کے بچوں کو پلانا خلاف فطرت عمل ہے جبکہ فطرت یہ ہے کہ بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ پیئے۔اس میں ماں اور بچہ کی صحت کی حفاظت ہے۔براہ راست چھاتی سے دودھ پینے سے ماں اور بچے کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ نکال کر پینے سے نہیں ہوتے۔

(2)ماں چھاتی سے دودھ پلانے کی وجہ سے کئی مہلک بیماریوں سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

(3)ماں کی چھاتی سے دودھ پینے کی صورت میں بچے میں فطرتاپیار و محبت اور انس پیدا ہوتا ہے۔

(4)بینک کی صورت میں عورتوں سے دودھ کی خرید و فروخت ہوگی۔بعض عورتیں بطور عطیہ دودھ دیں گی اور بعض غریب گھرانے کی عورتیں ضروریات کے پیش نظر دودھ فروخت کریں گیں اور عورت کا اپنا دودھ فروخت کرنا اور اسے خرید ناشرعاجائز نہیں ہے فقہ اسلامی کی معروف کتاب ہدایہ میں ہے۔"ولا بیع لبن امراۃ فی قدح ""پیالے میں عورت کا دودھ فروخت کرنا جائز نہیں۔"ہدایۃ آخرین، ص:56 مکتبۃ الحرمین لاہور)

(5)سب سے بڑی شرعی خرابی یہ ہوگی کہ بینک والے مختلف علاقوں اور نسلوں کی عورتوں کا دودھ چاہے خرید کر یا بطور عطیہ حاصل کریں گے اور پھر اسے آپس میں ملا دیں گے۔ان عورتوں کے نام و پتے بھی معلوم نہیں ہوں گے بعد ازاں یہ دودھ کئی بچے بچیاں ہیں پیئیں گے اور یہ معلوم نہیں رہے گا کہ کس عورت کا دودھ کس بچے اور بچی نے پیا ہے؟اس عمل کے بعد رضاعی بہن بھائی اور ماں،بیٹا،بیٹی میں تفریق کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن کی حد تک ہو جائے گا۔اور حرمت رضاعت کے سبب دودھ پلانے والی تمام عورتیں اس بچے کی مائیں اور ان عورتوں کے بچے اس کی رضاعی بہن بھائی بن جائیں گے اور اس بچے کے ساتھ جس دوسرے بچہ بچی نے دودھ پیا ہوگا وہ اس کا رضاعی بھائی و بہن بن جائے گا اور جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہے وہ دودھ کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں۔"(جامع الترمذی،ج:1،ص:1347،ابواب الرضاع مکتبہ رحمانیہ لاہور)ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسالم نے فرمایا:دودھ پلانے سے وہ سارے رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو پیدائش سے حرام ہوتے ہیں۔"(ابوداؤد،ج:1،ص؛296،یادگار شیخ لاہور)فقہ اسلامی کی معتبر کتاب فتاوی عالمگیری میں ہے" کل من تحرم بالقرابة والصهرية تحرم بالرضاع"۔"ہر وہ رشتہ جو قرابت وصہریت کی وجہ سے حرام ہو جاتا ہے وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے"(فتاوی عالمگیری،ج:1ص:277طبع نورانی کتب خانہ پشاور)

(6)کافرہ اور فاسقہ فاجرہ عورتوں کا دودھ بینک میں جمع کیا جائے گا اور ایسی عورتوں کے دودھ پلانے کو شریعت پسند نہیں کرتی کیونکہ دودھ انسان کے مشابہ ہوتا ہے۔اور اس کے اثرات بچے پر پڑتے ہیں۔کافرہ،فاسقہ،

فاجرہ اور بے وقوف عورتوں کا دودھ بچہ یا بچی پیئے گا تو اس دودھ کے اثرات اس بچہ / بچی پر پڑیں گے سنن بہیقی میں روایت ہے۔" نهى رسول الله ﷺان تسترضع الحمقاء فان اللبن يشبه "رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم نے بے وقوف عورت کا دودھ پلانے سے منع کیا ہے کیونکہ دودھ عورت کے مشابہ ہوتا ہے۔"(السنن الکبری مع الجوہر النسفی، ج:7، ص:464دار صادر بیروت) بے وقوف عورت کا دودھ پینے سے بچے میں یہ چیزیں فطرتاً آجائیں گیں جو کہ کسی طرح بھی درست نہیں۔

(7) مختلف عورتوں کا دودھ مخلوط یعنی مکس کیا جائے گا جو بچہ / بچی اس دودھ کو پیئے گا وہ ہر اس عورت کا رضاعی بیٹا / بیٹی بن جائے گا جس کا دودھ ہو گا اور اس دودھ کا ایک قطرہ بھی پی لیا تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ عظیم فقہ علامہ علاؤالدین حصکفیؒ لکھتے ہیں۔"وعلق محمد الحرمة بالمرا تين مطلقا ،قيل :وهو ال؛الا صح "، حضرت امام محمد رحمتہ اللہ علیہ نے دو عورتوں کا اکٹھا دودھ پینے سے مطلقاً حرمت کو متعلق کیا اور اسی کو اصح قرار دیا(درمختار مع ردالمحتار، ج:2، ص:443، مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ) علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں۔"لو كان لبن احدى المراتين غالبا تعلق التحريم به فقط ولوا ستويا تعلق بهما"، "اگر وہ عورتوں میں سے ایک کا دودھ غالب ہو تو اس سے حرمت متعلق ہو جائے گی فقط اور اگر برابر ہو تو دونوں سے حرمت متعلق ہو جائے گی۔(فتاوی شامی، ج:2، ص:444 مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ) فقہ اسلامی کی معتبر کتاب فتاوی ہندیہ میں ہے۔"واذا اختلط لبن امراتين تعلق التحريم با غلبهما عندهما وقال محمدؒ تعلق بهما كيفما كان وهو رواية عن ابى حنيفةؒ تعالى عليه وهواظهرواحوط حكذافى النبيين،ولواستوياتعلق التحريم بهمااجماعاكذافى النهر الفائق۔ "اور جب دو عورتوں کو دودھ مختلط (مکس) ہو جائے تو ان دونوں میں سے جس عورت کا دودھ غالب ہو گا اس سے حرمت متعلق ہو جائے گی شیخین کے ہاں اور امام محمدؒ فرماتے ہیں دونوں کے ساتھ حرمت متعلق ہو گی جیسا بھی ان کا دودھ ہو یعنی کم ہو یا زیادہ ہو اور یہ روایت امام ابو حنیفہؒ سے بھی ہے اور یہی اظہر و احوط ہے جیسا کہ تبیین میں ہے اور اگر دونوں کا دودھ برابر ہو تو دونوں سے حرمت متعلق ہو جائے گی۔"(فتاوی عالمگیری،، ج:1، ص:344۔345)

مذکورہ بینک کے قیام پر دلیل جارہی ہے کہ ایسے نوزائیدہ بچے جو اپنی ماں کا دودھ نہیں پی سکتے یا ماں کا دودھ میں میڈیکلی طور پر مضر ہے تو ایسے بچوں کی جان بچانے کے لیے ہیومن بینک قائم کیا جارہا ہے یہ دلیل محض تصوراتی و ظنی ہے جبکہ ہمارے ہاں ماں کے دودھ کے علاوہ بچے کی خوراک کے لیے متبادل دودھ اور دیگر چیزیں موجود ہیں۔ جن سے بچے کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے اور ہیومن ملک بینک کے قیام کی صورت محض ایک تصوراتی مصلحت کہ بچے کی جان بچانی ہے حالانکہ اس کا متبادل موجود ہے لہذا ایک مصلحت کے لیے کئی شرعی مفاسد و خرابیوں کا سامنا کرنا پڑے گا ان کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔لہذا فقہی قاعدہ ہے"درء المفاسد اولى من جلب المصالح "، "مفاسد کو دور کرنا مصالح کے حصول سے مقدم ہے"(الاشباہ والنظائر، ص78، جلد1، طبع دار الکتب علمیہ، بیروت)

خلاصہ جواب: ہیومن (خواتین) ملک بینک کا قیام کئی مفاسد شرعیہ کی وجہ سے درست نہیں۔۔۔[1]

مرکز افتاء جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا موقف

سوال: پاکستان میں 'ہیومن ملک بینک' کے نام سے ماؤں کا دودھ اکٹھا کرنے کا ایک سلسلہ سامنے آیا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو یاد رکھیں، شریعتِ اسلامیہ میں دیگر حلال و حرام کے مسائل کی طرح رضاعت کا مسئلہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ محض دودھ پینے پلانے کی بات نہیں ہے، بلکہ اس پر باقاعدہ شرعی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ رضاعت سے باقاعدہ اسی طرح حلت و حرمت ثابت ہوتی ہے جس طرح نسبی اور خونی رشتوں سے ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں اسکی صراحت ہے ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ أُمَّهَٰتُكُمۡ وَبَنَاتُكُمۡ وَأَخَوَٰتُكُمۡ وَعَمَّٰتُكُمۡ وَخَٰلَٰتُكُمۡ وَبَنَاتُ ٱلۡأَخِ وَبَنَاتُ ٱلۡأُخۡتِ وَأُمَّهَٰتُكُمُ ٱلَّٰتِيٓ أَرۡضَعۡنَكُمۡ وَأَخَوَٰتُكُم مِّنَ ٱلرَّضَٰعَةِ﴾(النساء: 23) **یعنی** جس طرح تمہارے نسبی رشتوں سے ماں، بیٹیاں، بہنیں تم پر حرام ہیں، اسی طرح تمہاری رضاعی مائیں اور بہنیں بھی تم پر حرام ہیں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا": یحرم من الرضاعۃمایحرم من النسب". (صحیح مسلم 1445) 'رضاعت سے بھی وہی حرمت حاصل ہوتی ہے، جو نسب سے ہوتی ہے'۔ نبی کریم ﷺ کو کہا گیا کہ آپ اپنے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے شادی کر لیں، آپ ﷺ نے فرمایا": إِنَّهَالاتَحِلُّ لِي،إِنَّهَاابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ وَ يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مايَحْرُمُ مِنَ الرَّحِمِ".(صحیح مسلم :1447) 'وہ میرے لیے حلال نہیں ہیں، کیونکہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہیں، جو رشتے خون کے سبب حرام ہوتے ہیں وہی رضاعت کے سبب بھی حرام ہوتے ہیں'۔ کیونکہ حضرت حمزہ اور آپ ﷺ نے ایک ہی خاتون کا دودھ پیا تھا۔

اسی طرح عقبہ بن حارث نے ام یعقوب بنت ابی اہاب بن عزیز رضی اللہ عنہا سے شادی کی، لیکن ایک سیاہ فارم عورت نے کہا کہ میں نے دونوں کو دودھ پلایا ہوا ہے۔ عقبہ یہ مسئلہ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ رشتہ کیسے قائم رہ سکتا ہے جب رضاعت کی بات کر دی گئی ہے۔ چنانچہ عقبہ نے ام یعقوب سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس نے کسی اور سے شادی کی۔ (صحیح بخاری:2640) اس کے علاوہ اور کئی ایک واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رضاعت ہونے یا نہ ہونے سے شرعی احکامات میں کس قدر فرق پڑتا ہے۔

لہذا ایک مسلمان کو ان مسائل کو اس طرح نہیں لینا چاہیے، جس طرح کہ غیر مسلم یا آزاد خیال لوگ چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ کیونکہ جن کے نزدیک مرد و عورت کے تعلقات میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں، تو وہ دودھ پینے پلانے میں یہ تکلف کیوں کریں گے؟

---

[1] ۔ جامعہ نعیمیہ لاہور، فتوی 033/24

حالانکہ رضاعت سے حرمت کا ثبوت مسلمانوں کے ہاں ایک اجماعی اور متفق علیہ مسئلہ ہے، جس سے قرابت داری اور حلت و حرمت کے ثبوت میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (الإجماع ص82 والأوسط 8/ 548لابن المنذر)ہیومن ملک بینک کا قیام اسلامی تعلیمات و قوانین کے ہم آہنگ نہیں، اس بات کو درج ذیل نکات میں واضح کیاجاسکتاہے:

- ملک بینک کے قیام سے رضاعت اور اس سے ثابت ہونے والے شرعی احکام متاثر ہوں گے، اور رشتوں اور قرابت داریوں سے متعلق انسان کم از کم شک و شبہ کا ضرور شکار ہو گا۔ لہذا ہر وہ چیز جو شرعی احکام کی تعطیل اور فساد کا باعث بنے یا انسان کو اس حوالے سے شکوک و شبہات کا شکار کرے، اس سے گریز لازمی ہے۔
- بچے کا براہ راست ماں کی چھاتی سے دودھ پینا اس کے ساتھ بچے اور ماں کی صحت کے کئی ایک مسائل جڑے ہوئے ہیں، ملک بینکس کی وجہ سے ماں اور بچہ دونوں صحت کے اعتبار سے کئی ایک اضرار و مفاسد کا شکار ہوں گے۔
- عالم اسلام میں عرصہ دراز سے شیر خوار بچوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے رضاعت کا جو سلسلہ رائج ہے، اس کی موجودگی میں ایسے معاشروں سے ایک نیا سسٹم لے کر آنا، جن کا اپنا خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہو، اس کی قطعا کوئی ضرورت نہیں ہے۔
- حلیب بنک کے جواز کے لیے بعض مصالح اور ضروریات کا ذکر کیا جاتا ہے، حالانکہ اصول یہ ہے کہ "الضرر لایزال بالضرر" و"درء المفاسد أولى من جلب المصالح". کسی ایک نقصان کو ختم کرنے کے لیے مزید نقصان کرنا درست نہیں، اسی طرح جہاں مصالح و مفاسد کا ٹکراؤ ہو رہا ہو، وہاں مزید سہولیات اور مصالح حاصل کرنے کے لیے نئے مفاسد کا دروازہ کھولنا جائز نہیں ہے۔
- کسی بھی عورت کا دودھ پینے سے حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، لیکن بعض احادیث وآثار سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ مرضعہ کے دودھ کا باقاعدہ بچے کی طبیعت پر اثر ہوتا ہے، اسی وجہ سے اہلِ علم نے مرضعہ کے انتخاب میں احتیاط کا حکم دیا ہے اور ایسی عورتوں سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے جن کی عادات و اطوار اور حرکات درست نہ ہوں۔ (السنن الكبير للبيهقي16/ 44 ،المغني لابن قدامة11/ 346)

جبکہ حلیب بنک میں عملا ایسی کوئی صورت موجود نہیں ہوتی کہ عورتوں اور ان کے دودھ میں فرق کیا جاسکے۔

عالمی افتاء کمیٹیوں کے فتاوی:

جسے ہمارے ہاں 'مدرز ملک بینک' یا 'ہیومن ملک بینک' کہا جاتا ہے، عربی میں اسے "بنک حليب الأمهات" کہا جاتا ہے۔ جس پر مجمع الفقہ الاسلامی میں تفصیلی گفتگو ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں عرصہ دراز سے

شیر خوار بچوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کیلئے رضاعت کا جو سلسلہ رائج ہے، وہ بہترین ہے، مسلمانوں کو 'مدرز ملک بنکس' جیسے مغربی اقدامات کی قطعا کوئی حاجت نہیں ہے۔ لہذا اسلامی ممالک میں اس پر پابندی عائد کی جائے۔ (مجلۃ المجمع، العدد الثاني 1 / 383)

اسی طرح لجنۃ دائمہ سعودی عرب نے بھی اسکے حرام اور ناجائز ہونے کا فتوی جاری کیا ہے۔ (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ – المجموعۃ الأولی 21 / 44) اسی طرح شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ، شیخ بکر ابو زیدؒ جیسے اہلِ علم نے بھی اس کی حرمت اور عدم جواز کا ہی فتوی دیا ہے۔

بعض اعتراضات کا جائزہ اور اشکالات کی وضاحت

بعض لوگ اہلِ علم کے فتاوی اور شرعی مسائل کے بیان پر اعتراضات اور اشکالات پیش کرتے ہیں، ذیل میں ان میں سے بعض کا ذکر کر کے ان کا مختصر جواب عرض کیا جاتا ہے:

(1) کیونکہ ملک بینکس میں دودھ نکال کر بچوں کو دیا جاتا ہے، وہ براہ راست عورتوں کی چھاتی سے دودھ نہیں پیتے تو یہ اشکال پیدا ہوا کہ کیا رضاعت کے ثبوت کیلئے براہ راست عورت کے پستان سے دودھ پینا لازمی ہے؟

جواب: اس میں جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے کہ رضاعت کے ثبوت کے لیے براہ راست پستان سے پینا ضروری نہیں، اگر ویسے ہی کسی برتن وغیرہ میں دودھ نکال کر بھی پی لیا تو رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ اصل اعتبار دودھ کا معدے اور دماغ میں پہنچ کر خوراک اور غذا بننا ہے وہ کسی بھی طریقے سے حاصل ہو جائے تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ (صحیح فقہ السنۃ 3 / 88) بلکہ بعض فقہاء نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے، جیسا کہ ابن نجیم لکھتے ہیں: إِنَّ الْوَجُورَ، وَالسَّعُوطَ تَثْبُتُ بِهِ الْحُرْمَةُ اتِّفَاقًا. (البحرالرائق 3/246) وجور اور سعوط دونوں سے بالاتفاق حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ وجور کا مطلب ہے دودھ نکال کر کسی برتن کے ذریعے منہ کی طرف سے دودھ پلانا اور سعوط کا مطلب ہے کہ ناک کے ذریعے دودھ ڈالنا۔ (بغیۃ المقتصد شرح بدایۃ المجتهد 10 / 5931)

(2) دودھ شریک تب ہوتا ہے جب بچہ ایک ماں کا دودھ پیئے اور کئی ماہ اس خاندان میں رہے۔ حالانکہ ملک بینک میں تو ایسی کوئی صورت حال نہیں ہے، بلکہ کوئی عورت اپنا دودھ جمع کروا دیتی ہے، وہاں دوسری عورتیں بھی جمع کروا دیتی ہیں۔ اس میں سے کوئی فرد دودھ خرید کر اپنے بچے کو پلا دیتا ہے۔ دوسری دفعہ وہ جس کا خریدتا ہے وہ پتہ نہیں کس ماں کا ہے؟ تو اس سے رضاعت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ انوکھا نیا اور منفرد مسئلہ کس کتاب فقہ وحدیث سے اخذ کیا گیا ہے کہ کسی ایک ہی ماں کا دودھ پینے اور کئی ماہ خاندان میں رہنے کی شرط پر رضاعت ثابت ہوگی ورنہ نہیں۔

اس میں کسی خاندان میں رہنے کی شرط یا کسی خاص مدت کا کہیں کوئی ذکر نہیں، البتہ اس بات میں قدرے

اختلاف ہے کہ کتنی دفعہ دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے۔؟

بعض اہل علم کے نزدیک ایک بار سیر ہو کر دودھ پی لینا کافی ہے، لیکن کئی ایک اہل علم کے نزدیک قرآن وسنت کی رو سے راجح یہی ہے کہ کم از کم پانچ بار دودھ پینا ضروری ہے، ایک دو بار دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں"كان فيما أنزل من القرآن عشر رضعات معلومات يحرمن، ثم نسخن بخمس معلومات، فتوفي النبي ﷺ والأمر على ذلك".(صحيح مسلم:1452) شروع میں دس رضاعتیں حرام کرتی تھیں، پھر پانچ رضاعتوں سے حرمت کا حکم نازل ہوا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہی فیصلہ تھا۔

ایک اور حدیث میں ہے": لا تحرم المصة ولا المصتان". (صحیح مسلم:1451)ایک دو دفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ لہذا اگر کوئی بچہ ایک دن میں پانچ مرتبہ دودھ پی لیتا ہے تو اسی ایک دن میں ہی رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

رہا یہ مسئلہ کہ ملک بینک میں تو ایک ماں کا دودھ نہیں ہوتا، بلکہ مختلف خواتین کا دودھ ہوتا ہے تو اس حوالے سے بھی اہلِ علم نے وضاحت کی ہوئی ہے، جو درج ذیل ہے: ایک ہی بچے کو جب مقررہ مقدار یعنی کم از کم پانچ مرتبہ ایک سے زیادہ ماؤں کا دودھ ملا کر پلایا جائے، تو اس سے ثبوتِ رضاعت کے حوالے سے تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف۔ تمام سے ہی رضاعت ثابت ہو جائے۔ یہ حنابلہ اور اکثر حنفیہ اور بعض شافعیہ کا موقف ہے۔

ب۔ کسی ایک سے رضاعت ثابت ہو، یعنی غالب کا اعتبار کیا جائے لہذا جس کا دودھ زیادہ ہو۔ اسی سے حرمت رضاعت قائم ہو جائے۔ یہ مالکیہ اور بعض احناف و شوافع کا موقف ہے۔)دونوں اقوال کی تفصیل کیلئے دیکھیں:النوازل فی الرضاع:226۔230)

ج۔ تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ جب ایک سے زیادہ خواتین کا دودھ ملا کر پلایا جائے تو کسی سے بھی حرمت ثابت نہ ہو۔ یہ موقف کسی کا بھی نہیں ہے لہذا یہ احتمال ساقط الاعتبار ہے۔

کئی بار ایک ماں کا دودھ بچے کو پلایا گیا اور اسی طرح کئی بار کسی دوسری ماں کا دودھ اسی بچہ کو پلایا گیا تو 'تعدد امھات من الرضاعۃ' سے رضاعت کی نفی نہیں بلکہ کئی خواتین کی رضاعی اولاد کا خلط ملط ہونا ثابت ہوتا ہے جو زیادہ خطرناک ہے۔

امام قرافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:لو أرضعها أهل الأرض حرمن عليه لأنهن أمهات نسائه(الذخيرة للقرافي 4/ 282)یعنی اگر کسی بچی کو علاقے کی تمام خواتین نے دودھ پلایا ہو تو اس بچی سے شادی کرنے والے شخص پر تمام خواتین حرام ہو جائیں گی کیونکہ وہ اس کی بیوی کی رضاعی مائیں ہیں، جن سے شادی کرنا حرام ہے۔ فرض کریں کہ اگر اجتماعی مخلوط دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں ہو سکتی تو انفرادی طور پر الگ الگ کئی خواتین کے دودھ سے بھی رضاعت ختم

شمار ہو گی؟

جب معترض خود یہ کہہ رہاہے کہ پتہ نہیں کس خاتون کا دودھ کس بچے کو پلایا جائے گا، تو پھر احتمال تو یہ بھی ہے کہ بار بار ایک ہی خاتون کا دودھ ایک ہی بچے کے حصے میں آجائے.. کوئی کس بنیاد پر یہ حتمی رائے دے سکتاہے کہ اگر ایک دفعہ اگر کسی ایک ماں کا دودھ خرید لیا تو دوسری بار اس کا نہیں خریدا جائے گا؟! اسی طرح اگر عورت کے دودھ کے ساتھ کوئی اور چیز ملا دی جاتی ہے مثلاً پانی یادوائی یا کوئی کیمیکل وغیرہ تو اس میں بھی غالب کا اعتبار کیا جائے گا، یعنی اگر دودھ زیادہ ہے تو رضاعت ثابت ہو جائے گی اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ مخلوط دودھ سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

(3) ہم جاپان اور دوسرے غیر مسلم ملکوں کا بنا ہوا دودھ پلاتے ہیں، اس بات کی تحقیق کبھی نہیں کی کہ وہ حلال ہے یا نہیں؟

جواب: جاپان یا کسی اور ملک کے خشک دودھ پلانے سے رضاعت ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ خواتین / ماؤں کے دودھ کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اور رضاعت کا تعلق عورت کے دودھ کے ساتھ ہے، ایسے تو نہیں ہے کہ اگر دو بچے کسی جانور کا دودھ پی لیں تو وہ آپس میں رضاعی بہن بھائی بن جائیں گے!

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تحقیق نہیں ہو رہی، وہاں تحقیق کرنی چاہیے نہ کہ اس کو آڑ بنا کر مزید اور چیزوں کو بلا تحقیق قبول کرنے پر زور دیا جائے۔

(4) اس وقت جب دودھ شریک بھائی بہن کا زمانہ تھا اس وقت خون نہیں لگایا جاتا تھا، اگر یہ اس وقت ہوتا تو خون دینے والا تو سگا بھائی بن جاتا۔

جواب: کسی کی جان بچانے کے لیے خون دینے سے رشتہ خون / یا حلت و حرمت رضاعت کی کوئی دلیل نہیں، رضاعت کے مسائل دودھ پلانے سے وابستہ ہیں اور شریعت نے اس بنیاد پر باقاعدہ حلت و حرمت کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک منصوص مسئلے کو غیر منصوص پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟

(5) اعضاء جیسا کہ گردہ جگر آنکھ وغیرہ اگر عطیہ کیے جا سکتے ہیں تو دودھ کیوں نہیں؟ کیا یہ چیزیں دودھ سے اہم نہیں ہیں؟

جواب: اعضاء کی پیوند کاری / عطیہ کرنا بذات خود ایک اختلافی مسئلہ ہے، اس کو جائز بھی مان لیں پھر بھی اس کی حیثیت رضاعت جیسی نہیں ہے۔

(6) اس موقع پر بعض لوگوں کی طرف سے رضاعتِ کبیر کا مسئلہ چھیڑا گیا ہے، لہذا اس کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ رضاعت کبیر کا مسئلہ اگرچہ قدرے مختلف فیہ ہے، لیکن اس میں ہمارے نزدیک راجح موقف یہی ہے کہ رضاعتِ کبیر سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

"إنما الرضاعة من المجاعة(صحيح البخاری:2647)'رضاعت بھوک سے ہے'۔یعنی رضاعت اسی عمر میں ثابت ہوتی ہے، جب وہ دودھ براہ راست بچے کی غذا بنتا ہو، اور اس کی بھوک مٹاتا ہو۔ ایک اور روایت میں ہے "لارضاع إلا في الحولين".
(موطا مالك:1290 ، سنن الدارقطني:174/4)
'رضاعت صرف دو سال کی عمر میں ثابت ہوتی ہے'۔

اس سلسلے میں سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما والے واقعہ کو ایک استثنائی صورت پر محمول کیا گیا ہے، اسے عمومی اصول نہیں بنایا جائے گا۔ اصولی بات یہی ہے کہ رضاعتِ کبیر سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر صحابہ کرام اور عموما اہلِ علم کا بھی یہی موقف ہے۔ امام ابن المنذرؒ نے صراحت فرمائی ہے: وأكثر أهل العلم غير قائلين بقصة سالم هذا، ويحتجون في هذا بظاهر كتاب الله عزوجل وبالأخبار الثابتة عن نبي ﷺ، وبأخبار أصحاب رسول الله ﷺ.وهو قول عوام أهل العلم، من أهل الحجاز، والعراق، والشام، ومصر، وغيرهم(الأوسط لابن المنذر8/ 558)جیسا کہ عرض کیا کہ راجح قول کے مطابق رضاعت کبیر ثابت نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی ملک بینک سے مستفید ہونے والے بچے وہ ہوں گے جو 'کبیر' کی بجائے 'صغیر' اور 'شیر خوار' کے زمرے میں ہی آئیں گے، لہذا اس حوالے سے رضاعت اور اس بنا پر حلت و حرمت کے سنگین مسائل پیدا ہوں گے۔

(7) کچھ لوگ بعض اہلِ علم کے فتاوی ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے ملک بنک کے قیام کو جائز قرار دیا ہے. وغیرہ۔

جواب: اس حوالے سے گزارش ہے کہ ہم نے اوپر اسکے عدم جواز اور اس کے دلائل کی وضاحت کر دی ہے، بلکہ جواز کے لیے پیش کیے جانے والے اشکالات کی بھی وضاحت کر دی ہے۔

دوسری بات: جن علمائے کرام نے جواز کی بات کی ہے، انہوں نے اس کے لیے جو شرائط اور احتیاطیں ذکر کی ہیں، کیا کسی ملک بینک میں ان شرائط وضوابط کا خیال رکھا جاتا ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے انٹرنیشل فتاوی کمیٹیوں کے حوالے سے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ مسئلہ کبھی بھی مسلم معاشروں کی ضرورت نہیں رہا، بلکہ لبرل قسم کے لوگ اسے اسلامی معاشروں میں دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آپ جواز کی بات ان علمائے کرام کی لے لیں جو شریعت کے اصول وضوابط کی بنیاد پر اس کی گنجائش کی بات کریں، لیکن عملا سسٹم اور نظام ان لوگوں کا نافذ کر دیں جو آزاد خیال اور لبرل قسم کے لوگ ہیں اور جن سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ رضاعت جیسے دقیق اور پیچیدہ مسئلہ میں شریعت کا خیال رکھنے کی زحمت گوارہ کریں گے۔ یہ تو اس قسم کے آوارہ لوگ ہیں کہ ایک شخص کا مادہ منویہ لے کر دوسرے کی بیوی میں رکھ دیتے ہیں، ایک عورت کا ایگ لے کر دوسری کو ڈونیٹ کروا دیتے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ بچے پیدا کروانے کے لیے کرائے کی مائیں متعارف کروائی ہوئی ہیں جو کہ سراسر شریعت کی مخالفت بلکہ فطرت کے خلاف جنگ ہے۔

(8)شریعت میں بحالتِ اضطرار انسانی جان بچانے کے لیے خنزیر کھانے کی بھی اجازت ہے، تو کیا بچوں کی جان بچانے کے لیے حلیب بینک کے قیام کی گنجائش نہیں ہو گی؟

جواب: بالکل شریعت میں اضطراری کیفیت میں گنجائش دی جاتی ہے، لیکن پہلے تو اضطرار کا متحقق ہونا ضروری ہے، دوسرا اضطرار کے احکامات اسی حالت کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، انہیں باقاعدہ اصول اور ضابطہ بنالینا اور معاشرے میں عام کر دینا جائز نہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کو وقتی طور پر جان بچانے کیلئے حرام کھانے کی اجازت ہے، لیکن اس بنیاد پر وہ کہے کہ میں ہمیشہ سود خوری یا خنزیر کھانا شروع کر دوں، یہ جائز نہیں ہو گا، اسی طرح اس بنیاد پر اگر لوگ خنزیر کے گوشت کے ہوٹلز کھول لیں، تاکہ کوئی مجبور و مضطر بوقت ضرورت جان بچا سکے، تو یہ جائز نہ ہو گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ملک بینک بنانا درست نہیں لہٰذا اسلامی معاشروں میں اس سے گریز ضروری ہے۔ ورنہ رضاعت اور اس بنا پر حلت و حرمت اور عادات و اخلاق کے سنگین قسم کے مسائل پیدا ہوں گے۔

اس مسئلہ میں ہمیں کم از کم سدالذریعۃ پر عمل کرتے ہوئے اس قسم کے اقدامات کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے اور مسلمانوں کو اس سے دور رکھنا چاہیئے۔

متعلقہ اداروں سے گزارش ہے کہ وہ اس کی روک تھام کے لیے کام کریں تاکہ معاشرہ ایک نئے فساد کا شکار نہ ہو۔[1]

مرکز افتاء جامعۃ الکوثر اسلام آباد کا موقف

سوال: ہیومن ملک بینک (Human Milk Bank) کے قیام کا شرعی جواز موجود ہے؟

جواب: مراجعِ عظام کے فتاویٰ کے مطابق رضاعت سے محرم ہونے کے چند شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے؛ "بچہ پستان سے دودھ پیے۔" پس اگر دودھ اس کے حلق میں انڈیل دیا جائے یا دودھ جمع کر کے کسی برتن کے ذریعے پلایا جائے تو یہ محرم ہونے کا ذریعہ نہیں بنے گا۔[2]

تجزیہ:

اسلامی فقہ میں رضاعت (دودھ پلانے) کا مسئلہ صرف ایک جسمانی غذائیت کی فراہمی نہیں بلکہ نسب، حرمتِ نکاح اور قرابت کے احکام سے وابستہ ہے۔ قرآنِ کریم نے رضاعی رشتوں کو نسبی رشتوں کے برابر قرار دیا ہے اور نبی کریم ﷺ کی احادیث نے اس اصول کو مزید واضح کر دیا ہے کہ "يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَايَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ"[3]۔ یہی اصول ان تمام تحریروں کی بنیاد ہے جو حالیہ دنوں میں پاکستان میں "ہیومن ملک بینک" کے قیام کے

[1] ۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد فتوی نمبر 543

[2] ۔ جامعۃ الکوثر اسلام آباد، انٹرویو

[3] ۔ صحیح بخاری، رقم الحدیث: 2645

پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ان مضامین کا بنیادی پیغام یہی ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کے مزاج اور احکام کی روشنی میں انسانی دودھ کے بینک کے قیام کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ ان تینوں تحریروں کا خلاصہ اور شرعی حکم ایک ہے، یعنی اس بینک کی عدم جواز، مگر ہر تحریر کا انداز، استدلال، دلائل کی ترتیب اور مخاطب کا دائرہ مختلف ہے، جو ان کی انفرادیت اور افادیت کو نمایاں کرتا ہے۔

ان تمام مضامین میں قرآن مجید کی وہی بنیادی آیت نقل کی گئی ہے جو سورہ نساء کی آیت 23 ہے، جس میں رضاعی ماں اور بہن کو نسبی ماں اور بہن کی طرح حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا حضرت حمزہ کی بیٹی سے نکاح سے انکار اور عقبہ بن حارث کا اپنی بیوی سے صرف رضاعت کی خبر سن کر علیحدگی اختیار کرنا، تینوں تحریروں میں مشترکہ طور پر بیان کیے گئے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ رضاعت کی بنیاد پر تعلقات کی حرمت کا مسئلہ قطعی اور غیر مبہم ہے۔

جب ہم ان مضامین کی گہرائی میں جا کر تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو بعض ایسے نکات سامنے آتے ہیں جہاں فقہی تفصیل، اسلوب اور دلیل کی شدت میں فرق نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً، بعض مضامین نے صرف یہ ذکر کیا کہ دودھ پلانے سے حرمت پیدا ہوتی ہے، جب کہ ایک مفصل مضمون میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت "خمس رضعات معلومات" کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا کہ کم از کم پانچ بار دودھ پینا ضروری ہے تاکہ حرمتِ رضاعت ثابت ہو سکے۔ اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ ایک یا دو گھونٹ سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، جو کہ حدیث "لاتحرم المصۃ ولا المصتان" سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا گیا۔ یہ نکتہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ فتویٰ صرف اصولی حکم پر نہیں بلکہ اس کے فقہی تقاضوں اور اجتہادی تفصیلات پر بھی مبنی ہوتا ہے۔

اسی طرح دودھ پلانے کے طریقے پر بھی تینوں مضامین متفق ہیں کہ رضاعت کیلئے براہ راست چھاتی سے پینا ضروری نہیں بلکہ برتن یا بوتل سے پلانا بھی حرمت کا باعث بنتا ہے۔ لیکن بعض مضامین نے اس نقطے کو تقویت دینے کے لیے فقہائے احناف، شوافع اور حنابلہ کی عبارتیں پیش کیں جیسے کہ "الوجور" اور "السعوط" جیسے فقہی اصطلاحات کو واضح کرتے ہوئے، ابن نجیم اور بیہقی کی کتب سے اقتباسات شامل کیے گئے، جس سے یہ استدلال صرف شرعی فہم تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک قابلِ تحقیق علمی بنیاد حاصل کرتا ہے۔

ہیومن ملک بینک کے سب سے نازک پہلو یعنی مخلوط دودھ کا مسئلہ تینوں مضامین میں مختلف انداز سے سامنے آیا۔ ایک تحریر میں اسے اخلاقی خرابی اور رشتوں کے خلط ملط ہونے کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ دوسری تحریر میں اسے فقہی زاوئے سے دیکھا گیا کہ اگر ایک بچے کو پانچ مرتبہ مختلف عورتوں کا دودھ ملایا جائے تو فقہا کا اختلاف موجود ہے: بعض کہتے ہیں سب عورتیں حرام ہو جائیں گی، بعض غالب کا اعتبار کرتے ہیں، اور بعض کے نزدیک رضاعت سرے سے

ثابت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن تیسرے مضمون نے ان اقوال کو منظم انداز میں پیش کر کے یہ نتیجہ دیا کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورت سے اجتناب کیا جائے تاکہ نسبی و رضاعی رشتے محفوظ رہیں۔ یہاں امام قرافی کا قول بطور دلیل ذکر کیا گیا کہ اگر ایک بچی کو اہلِ زمین کی سب عورتوں نے دودھ پلایا ہو تو سب اس پر حرام ہو جائیں گی، کیونکہ وہ اس کی بیوی کی رضاعی مائیں بن جائیں گی۔

ان مضامین کا ایک اہم امتیاز ان میں معاصر اشکالات اور جدید ذہنوں کے اعتراضات کا جواب ہے۔ بعض مضامین نے ان اعتراضات کو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا، جب کہ ایک مضمون نے ان تمام اشکالات کو سوال و جواب کی ترتیب میں بیان کر کے علمی انداز میں ان کا جواب دیا۔ جیسے: کیا خشک یا ڈبہ بند دودھ سے رضاعت ثابت ہوتی ہے؟ کیا خون دینے سے بھی کوئی رشتہ قائم ہوتا ہے؟ کیا اضطرار کی حالت میں رضاعت کا بینک قائم کیا جا سکتا ہے؟ ان تمام سوالات کے دلائل کے ساتھ جوابات دیے گئے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ فتویٰ دینے والے مفتی نے معاصر ذہن کی نفسیات، شکوک و شبہات اور میڈیا سے متاثر دلائل کا ادراک بھی مکمل طور پر کر رکھا ہے۔

ان مضامین میں یہ بھی مشترک ہے کہ سب نے مجمع الفقہ الاسلامی، لجنۃ دائمہ، اور سعودی علما جیسے شیخ ابن عثیمین اور شیخ بکر ابو زید کی آراء کو مستند بنیاد کے طور پر پیش کیا۔ تاہم کچھ مضامین نے ان آراء کو محض تائید کے لیے ذکر کیا، جب کہ ایک مضمون نے بین الاقوامی اجماع کو خود فتویٰ کا جزو بنایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف انفرادی رائے نہیں بلکہ امت مسلمہ کا اجتماعی موقف ہے۔

یہ تمام تجزیاتی نکات ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ ان فتاویٰ میں بظاہر مکمل اتفاق موجود ہے، مگر تفصیلات، استدلال، طرزِ نگارش، علمی حوالہ جات اور مخاطب کا دائرہ مختلف ہے، جس سے ہر ایک کی افادیت اور مقام واضح ہوتا ہے۔ کوئی فتویٰ عام فہم زبان میں عوام کے لیے مفید ہے، کوئی متوسط طلبہ کے لیے، اور کوئی اہلِ علم و تحقیق کے لیے۔ یہ فقہی تنوع، اسلوبی تنوع، اور علمی پختگی دراصل اسلامی فقہ کا حسن ہے۔

اسلامی معاشرے میں خاندانی نظام کی حفاظت کے لیے ایسے مغربی نظریات کی مخالفت صرف جذباتی ردعمل نہیں بلکہ علمی و اصولی تقاضا بھی ہے۔ شریعت نے جہاں ضرورت و اضطرار کو بعض حدود میں جائز رکھا ہے، وہیں فساد کے دروازے بند کرنے کو اصولی ترجیح دی ہے۔ ہیومن ملک بینک جیسے نظام کو اسلامی معاشرے میں رائج کرنا دراصل نسب، رضاعت، نکاح اور قرابت جیسے بنیادی احکام میں الجھن پیدا کرنا ہے، جس کا نقصان صرف شرعی نہیں بلکہ اخلاقی اور معاشرتی سطح پر بھی خطرناک ہو گا۔

خلاصہ:

1. چار مضامین میں تین کا بنیادی شرعی حکم "ناجائز" اور "غیر شرعی" ہونے پر ہے جبکہ جامعۃ الکوثر جوائز کے قائل اس بنیاد پر ہے کہ اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔
2. قرآنی آیات اور احادیث کی بنیاد مشترک ہے، لیکن بعض مضامین میں تفصیل زیادہ ہے۔
3. رضاعت کے تحقق میں ایک مضمون نے "پانچ بار دودھ پلانے" کی شرط پر خاص زور دیا ہے۔
4. براہِ راست دودھ پلانے کی شرط نہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے، لیکن بعض نے اسے مضبوط فقہی دلائل سے مزین کیا ہے۔
5. مخلوط دودھ کا مسئلہ ایک مضمون میں فقہی درجہ بندی کے ساتھ بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔
6. صرف ایک مضمون نے معاصر اعتراضات کا تفصیلی اور علمی انداز میں جواب دیا۔
7. بین الاقوامی فتاویٰ کا حوالہ سب میں ہے، مگر ایک مضمون میں اسے اجماعی موقف کے طور پر پیش کیا گیا۔
8. اسلوب کے اعتبار سے: ایک فتویٰ عوامی، دوسرا متوسط، اور تیسرا تحقیقی و تخصصی سطح پر ہے۔
9. رضاعت کبیر، اضطرار، خون واعضاء کے مسائل پر صرف ایک مضمون نے تفصیل سے گفتگو کی۔
10. تمام فتاویٰ اسلامی معاشرت کے تحفظ، رشتہ داری کی حرمت، اور فساد کے دروازے بند کرنے کو اصل بنیاد مانتے ہیں۔

نتائج

1۔ پاکستان میں مراکزِ افتاء کا قیام فقہی تحقیق، اور عوامی دینی رجوعات کے مؤثر حل کے لیے ایک تاریخی اور سماجی ضرورت کے طور پر سامنے آیا، جس نے فتویٰ نویسی کو ادارہ جاتی شناخت دی۔

2۔ جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی نے دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق منظم فتویٰ نظام، آن لائن رسائی، موضوعاتی ترتیب، اور جدید مسائل پر اجتہادی بصیرت کے ذریعے دیگر منتخب مراکز پر علمی سبقت حاصل ہے۔

3۔ جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، اور جامعۃ الکوثر اسلام آباد نے اپنے اپنے مسلکی اصولوں کی روشنی میں فتویٰ نویسی کا سلسلہ جاری رکھا، تاہم ان اداروں میں منظم فتویٰ نظام، آن لائن سہولیات، موضوعاتی ترتیب اور جدید مسائل کے حل میں مزید بہتری کی گنجائش باقی ہے۔

4۔ فتویٰ محض مسئلہ کا حل نہیں بلکہ ایک ایسا اصلاحی عمل ہے جو شریعتِ اسلامیہ کو عصرِ حاضر کے سماجی و قانونی مسائل سے ہم آہنگ کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

5۔ مراکزِ افتاء نے اسلامی معاشرت کو استحکام، رہنمائی اور شعور فراہم کرنے میں مدد دی، جس سے ان کا کردار صرف مذہبی اداروں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک سماجی اصلاحی تحریک کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

6۔ مراکزِ افتاء نے فتویٰ نویسی کو جدید ذرائع ابلاغ جیسے ای میل، ویب سائٹ، اور فون کے ذریعے وسعت دی، جس سے دینی رہنمائی کا دائرہ مقامی سے بڑھ کر قومی و بین الاقوامی سطح تک پہنچ گیا۔

7۔ مراکزِ افتاء نے فتاویٰ کو صرف شرعی حکم تک محدود رکھنے کے بجائے اصلاحی، تربیتی اور اخلاقی رہنمائی کا ذریعہ بنایا، اور ان میں موجود مسلکی تنوع نے علمی اختلاف کو باوقار انداز میں اجاگر کر کے اسلامی فقہ کی وسعت اور اعتدال کو نمایاں کیا۔

8۔ منتخب تمام مراکزِ افتاء نے مجموعی طور پر یہ ثابت کیا کہ وہ ایک ایسے فکری، دینی، قانونی، اور سماجی ادارے بن چکے ہیں جو پاکستانی معاشرت کو اسلامی شریعت کی روشنی میں اعتدال، انصاف، اور استحکام کی راہ دکھا رہے ہیں۔

9۔ معاصر عائلی مسائل جیسے آن لائن نکاح، طلاق ثلاثہ، یک طرفہ خلع، یتیم پوتے کی وراثت اور دوسری شادی میں مراکزِ افتاء نے شرعی موقف کو واضح کرتے ہوئے عوامی ذہن سازی میں بنیادی کردار ادا کیا، خصوصاً وہاں جہاں قانون اور شریعت میں اختلاف ہو۔

10۔ دوسری شادی پر جمہور فقہاء کی رائے میں پہلی بیوی کی اجازت شرط نہیں، مگر پاکستانی قانون میں اجازت لازمی ہے؛ مراکزِ افتاء نے اس اختلاف کو علمی بنیادوں پر واضح کیا۔

11۔ یک طرفہ عدالتی خلع پر احناف اور جمہور فقہاء شوہر کی رضامندی کو ضروری سمجھتے ہیں، جبکہ اہل تشیع اور اہل حدیث مکتب فکر یک طرفہ خلع کو درست قرار دیتے ہیں۔

12۔ آن لائن نکاح کے جواز پر فقہی اختلاف پایا جاتا ہے؛ احناف اور شوافع مجلسِ عقد کے اتحاد کے قائل ہیں، جبکہ اہلِ حدیث اور شیعہ فقہاء بغیر اتحادِ مجلس کے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

13۔ ہیومن ملک بینک جیسے منصوبوں کے حوالے سے جمہور علمائے اہل سنت محرمیت کے خدشات کی بنیاد پر اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، جبکہ اہلِ تشیع کے فقہاء اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔

14۔ یتیم پوتے کی وراثت پر جمہور فقہاء اسے غیر وارث قرار دیتے ہیں مگر اسلامی نظریاتی کونسل "وصیتِ واجبہ" کے اصول کو قانونی حل کے طور پر تجویز کرتے ہیں۔

سفارشات و تجاویز

- عائلی مسائل میں رہنمائی کا طریقہ کار ملکی سطح پر مزید آسان بنانے کی ضرورت ہے۔
- حکومت کو چاہئے کہ ان مراکز افتاء کے ساتھ مختلف قانونی اور مالیاتی بنیادوں پر مدد کریں تاکہ یہ مراکز افتاء موجودہ سے بڑھ کر عوام کو سہولت مہیا کر سکے۔
- مراکز افتاء کی رہنمائی سے عوام کو عدالتوں کے پیچیدہ اور طویل عمل سے بچایا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں قانونی اداروں کو تجویز دی جاتی ہے کہ فیملی کورٹس کے متبادل کے طور پر ان مراکز افتاء کی طرف سنجیدہ توجہ دی جائے۔
- حکومت کو چاہیے کہ متعمد مراکز افتاء کو قانونی حیثیت دیا جائے۔
- مختلف مکاتب فکر کے مراکز افتاء کے کردار کا تقابلی مطالعہ، اسلامک بنکاری و کاروباری معاملات، فقہ الجنایات۔
- غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کے تعین میں مراکز افتاء کا کردار کا جائزہ

فہارس

فہرست آیات

فہرست احادیث

فہرست اعلام

فہرست مراجع ومصادر

فہرست آیات قرآنیہ

صفحۃ نمبر	ایت نمبر	سورۃ	آیت مبارکہ	نمبر شمار
70	102	البقرة	يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ	1
70	168	البقرة	وَلَاتَتَّبِعُواخُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ	2
86	187	البقرة	هُنَّ لِباسٌ لَّكم وانتم لباسٌ لهنَّ	3
134،117،111،85	228	البقرة	وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ	4
189،134،84،82	229	البقرة	اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْتَسْرِيحٌ...	5
187،114،82	230	البقرة	فَإِن طَلَّقَهَافَلَاتَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُحَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا	6
113،106	282	البقرة	يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ	7
179،110،108	3	النساء	فَانْكِحُوامَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِمَثْنَى وَثُلَاثَ	8
183،108	3	النساء	فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً	9
77	6	النساء	وَابْتَلُواالْيَتَامَى حَتَّى إِذَابَلَغُوا النِّكَاحَ...	10
92	11	النساء	يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِمِثْلُ حَظِّ...	11
104	12	النساء	وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ	12
191،105	14,13	النساء	تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ	13
60	19	النساء	وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ	14
132،86	35	النساء	إِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَافَابْعَثُواحَكَمًامِنْ أَهْلِهِ	15
88	36	النساء	وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَاتُشْرِكُوابِهِ شَيْئًاوَبِالْوَالِدَيْنِ	16
16	127	النساء	وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ	17
16	176	النساء	يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ	18
79	26،15	الإسراء	وَآتِ ذَاالْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ	19
90	24	الاسراء	وَاخْفِضْ لَهُمَاجَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ...	20
108	33	النور	وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَايَجِدُونَ نِكَاحًاحَتَّى...	21
80	67	الفرقان	وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا ...	22
90	8	العنكبوت	وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ...	23
75	21	الروم	وَمِنْ اٰيَاتِه اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا	24
89	14	لقمان	وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي ...	25

26	يَاأَيُّهَاالنَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ	الاحزاب	29,28	143
27	يَاأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُواإِذَانَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ ---	الأحزاب	49	133،110
28	فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ	الطلاق	1	109،82
28	لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَايَخْرُجْنَ	الطلاق	1	133
30	وَتِلْكَ حُدُودُاللهِ وَمَنْ يَتَعَدَّحُدُودَاللهِ	الطلاق	1	134،59
31	يَاأَيُّهَاالنَّبِيُّ إِذَاطَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ	الطلاق	1	185،133،110
32	فَإِذَابَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْفَارِقُو	الطلاق	2	134
33	وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ	الطلاق	4	117،113
34	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا	التحريم	6	91

فہرست احادیث مبارکہ

نمبر شمار	حدیث مبارکہ	کتاب	صفحہ نمبر
.1	أَبْغَض الْحَلَال إِلَى اللّٰه عَزَّ وَجَلَّ الطَّلَاق	سنن أبی داؤد	132
.2	أَجْرَؤُكُمْ عَلَى الْفُتْيَا أَجْرَؤُكُم عَلَى النَّارِ	سنن الدارمي	16
.3	أُخْبِرَ رَسُولُ اللّٰهِﷺعَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا،فَقَامَ غَضْبَانَ،ثُمَّ قَالَ:أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَأَنَابَيْنَ...	سنن النسائي	137
.4	إِذَاتَزَوَّجَ الْعَبْدُفَقَدْكَمُلَ نِصْفُ الدِّينِ،فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِي النِّصْفِ-	مشکوة المصابيح	94
.5	اسْتَفْتَى النَّبِيَّ ﷺ،فِي نَذْرٍكَانَ عَلَى أُمِّهِ،فَتُوُفِّيَتْ قَبْلَ أَنْ تَقْضِيَهُ،فَافتاءهُ أَنْ يَقْضِيَهُ عَنْهَا"،فَكَانَتْ سُنَّةًبَعْدُ	سنن أبي داود	18
.6	اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ	سنن ابن ماجه	58
.7	إِنَّ أَعْظَمَ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مُؤْنَةً	كنز العمال	80
.8	إني ذاكرلك أمرافلاعليك أن لاتعجلي حتى تستأمري...	سنن الترمذی	144
.9	اني طلقت امراته مائةتطليقة ،قال :بانت منك ثلاث	مصنف ابن ابي شيبة	141
.10	أَيُّمَاامْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَاطَلَاقًافِي غَيْرِمَابَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ	جامع الترمذی،	97
.11	ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ	سنن الترمذي	111
.12	ثلاثةٌلايدخلُونَ الجنةَ أبدًا:الدَّيُّوثُ،والرَّجِلَةُمن النِّساءِ،و مُدمِنُ الخمْرِ	شعب الإيمان	61
.13	ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدُ، وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ، فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللّٰهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ.	صحيح البخاري	110
.14	جاءرجل الي عثمان فقال:اني طلقت امرأتي مائة،قال: ثلاث تحرمها عليك وسبعة و تسعون عدوان''	مصنف ابن ابي شيبة	141
.15	الْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللّٰهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلَى عِيَالِهِ	مشکوة المصابيح	50
.16	طلقتهاثلثا،قال:فقال في مجلس واحد؟قال:فانماتلك واحدة فارجعهاان شئت. قال:فرجعها	مسندامام احمد	138

.17	فَسَأَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا،	صحيح البخاري	133
.18	فطلقهاثلث تطليقات عندرسول الله ﷺ فأنفذه رسول الله	ابو داؤد	137
.19	فقال رسول الله ﷺ: اقْبَلِ الْحَدِيقَةَ، وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً	صحيح البخاري	97
.20	فَهَلَّا جَارِيَة تُلَاعِبهَا وَتُلَاعِبك	سنن الدارمي	62
.21	في امرأةالمفقود:تربص أربع سنين وتعتدأربعةأشهر وعشرا". ((وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ،فَقَالَ:اعْرِفْ وِكَاءَهَاوَعِفَاصَهَا،وَعَرِّفْهَا سَنَةً، فَإِنْ جَاءَ مَنْ يَعْرِفُهَا، وَإِلَّا فَاخْلِطْهَا بِمَالِك"	صحيح البخاري	167
.22	كان عمراذاأتي برجل قدطلق امرأته ثلاثافي مجلس أوجعه ضربا وفرق بينهما	مصنف ابن ابي شيبة	141
.23	كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ،	صحيح البخارى	95،93
.24	لَاتُبَاشِرْالْمَرْأَةُالْمَرْأَةَحَتَّى تَصِفَهَالِزَوْجِهَاكَأَنَّمَايَنْظُرُإِلَيْهَا	صحيح البخارى	72
.25	ماأردت؟قال واحدة،قال:هو علي ماأردت،	سنن ابى داؤد	139
.26	من اقتصدأغناه الله ومن بذرأفقره الله ومن تواضع لله رفعه الله ومن تجبر قصمه الله	صحيح البخاري	80
.27	مِنَ الْغَيْرَةِمَايُحِبُّ اللَّهُ، وَمِنْهَامَايُبْغِضُ اللَّهُ،فَأَمَّاالَّتِي يُحِبُّهَا اللَّهُ فَالْغَيْرَةُفِي الرِّيبَةِ،وَأَمَّاالَّتِي يُبْغِضُهَااللَّهُ فَالْغَيْرَةُ فِي غَيْرِ رِيبَةٍ	سنن أبي داود	61
.28	يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ	مشكوة المصابيح	95

فہرست اعلام

صفحہ نمبر	شخصیت کا نام	نمبر شمار
140	ابن طاؤس	1
150	ابن ہمام	2
115	ابو بکر جصاص	3
154	ابو طاہر الزیاد	4
140	باجیؒ	5
50	حسین سالم اسد	6
30	ڈابھیل	7
63	سیدہ زینب الغزالی	8
66	علی شریعتی	9
127	قرافیؒ	10
122	الکاسانی	11
153	کرخیؒ	12
41	محسن علی نجفی	13
15	محمد امین ابن عابدین شامی	14
109	مفتی محمود	15

مصادرومراجع

1. القرآن
2. ابن الأثير، مجدالدين أبوالسعادات المبارك بن محمدبن محمدبن محمدابن عبدالكريم الشيباني الجزري، النهايه في غريب الحديث الناشر:المكتبةالعلمية، بيروت، 1399ھ
3. ابن الرشد،بداية المجتهدونهايةالمقتصد،للإمام القاضي الفقيه النظارالأصولي المتكلم أبي الوليد محمد بن أحمد بن محمد بن رشدالحفيد 595ھ
4. ابن القيم الجوزى،ابی عبدالله محمدبن ابی بکر،اعلام المؤقعين عن رب العالمين،دارابن الجوزى،1423،
5. ابن الهمام شرح مختصرالطحاوى،دار البشائر الإسلامية- ودارالسراج، 1431 ھ - 2010 م
6. ابن الهمام، كمال الدين، فتح القدير، الناشر:شركة مكتبة ومطبعة مصفى البابي الحلبي وأولاده بمصر ، 1389 ھ -
7. ابن حزم،المحلى بالاثار،ت:محمدمنيرالدمشقی،ادارةالطباعة المنيرية،القاهرة،1352ھ
8. ابن حزم الظاهری،أبومحمدعلی بن أحمد،المحلى شرح المجلى،ت452ھ
9. ابن رشدالخير،أبوالوليدمحمدبن أحمدالقرطبى بدايةالمجتهدونهايةالمقتصد:،ط دارالفكر،(ت 545)
10. ابن عابدين،محمدأمين بن عمربن عبدالعزيزعابدين الدمشقي الحنفي،ردالمحتارعلى الدرالمختار،ایچ ایم سعید، 2009ء،
11. ابن عابدين،محمدأمين بن عمربن عبدالعزيزعابدين الدمشقي الحنفي،شرح عقودرسم المفتی،مکتبه سعیده،سهارنپور 2009
12. ابن قيم الجوزية،محمدبن أبي بكربن أيوب بن سعدشمس الدين،إعلام الموقعين عن رب العالمين الناشر: دارالكتب العلمية،ييروت1991م،
13. ابن مفلح،إبراهيم بن محمد،النكت والفوائدالسنيةعلى مشكل المحرر،(الرياض،مكتبةالمعارف، 1404
14. ابن نجيم ،زين الدين بن إبراهيم بن محمد،البحرالرائق،مکتبه حقانيه پشاور،)،ندارد
15. ابن همام عبدالرزاق الصنعانی،مصنف عبدالرزاق،طبع مصر 1436
16. أبوالبركات أحمدبن محمدالعدوي،الشهيربالدرديروالشرح الكبير:دارالكتاب العربي، بيروت
17. أبوالحسن برهان الدين علي بن أبي بكرالمرغيناني،الهدايةفي شرح بدايةالمبتدي،تحقيق:طلال يوسف، دارإحياءالتراث العربي،بيروت، 1445ھ
18. أبوالحسن علي بن خلف بن عبدالملك بن بطال،شرح صحيح البخاری،دارالنشر:مكتبة الرشد، السعودية /الرياض، 2003م
19. أبو بكرأحمدبن الحسين البيهقي،السنن الكبرى،دارالكتب العلمية،بيروت،لبنان،2003م

20.أبو داودسليمان بن الأشعث السجستاني السنن،سنن ابی داؤد، مکتبہ رحمانية لاهور،2015،
21.أبو عبد الله محمد بن يزيد، ابن ماجة القزويني ،سنن ابن ماجة،دارالرسالةالعالمية،1430هـ،
22.أبو محمد بهاء الدين المقدسي ،العدة شرح العمدة (القاهرة: دارالحديث، 2003):
23.أبوالحسن علي بن الحسين بن محمدالسُّغْدي الحنفي النتف في الفتاوى،دارالفرقان عمان،مؤسسة الرسالة ،بيروت، 461هـ
24.ابواحسين مسلم بن حجاج قشيری نیشاپوری۔الجامع الصحيح،مكتبة رحمانية لاهور،نامعلوم
25.ابوالفضل مولاناعبد الحفيظ بلياوي، مصباح اللغة،حقانية، ملتان،1999
26.أبوالقاسم سليمان بن أحمدبن أيوب الطبراني،المعجم الكبير،القاهره:مكتبة ابن تيمية)1440هـ
27.أبوالوليدمحمدبن أحمدالقرطبي الأندلسي،بدايةالمجتهدونهايةالمقتصد(بيروت:دارالمعرفة،الطبعةالسادسة 1456،
28. أبوعبدالله،محمدبن أحمدالأنصاري القرطبي،الجامع لأحكام القرآن،للقرطبى:دارالكتب المصرية 1384
29.أبومحمدحافظ عبدالستارحماد،فتاوى أصحاب الحديث(مكتبةاسلاميةلاهور،2014)
30.أبومحمدمحمودبن أحمد،بدرالدين العيني الحنفي،البناية شرح الهداية،دارالكتب العلمية ،بيروت، الطبعة الأولى م: 855هـ
31.أبومحمدموفق الدين عبد الله بن أحمد،ابن قدامة المقدسي المغني،مكتبة القاهرة، 1388هـ
32.ابویاسر،الشیخ، ہماری شادیاں ناکام کیوں؟ ناشر: نعمانی کتب خانہ لاہور، 2006ء
33.ابی بکرعبدالله بن محمدبن ابی شیبه،مصنف ابن ابي شيبة:ادارةالقرآن والعلوم الاسلامية، كراتشى ،2007
34. أحمدبن علي أبوبكرالرازي الجصاص الحنفي،أحكام القرآن للجصاص:قدیمی کتب خانہ کراچی، ندارد
35.أحمدبن فارس بن زكرياءالقزويني الرازي،أبوالحسين،معجم مقاييس اللغة،الناشر: دار الفكر،1979ء
36.أحمدبن مصطفیٰ،مفتاح السعادة مصباح السيادةفى موضوعات العلوم،(بيروت: دارالكتب العلمية، الطبعة الاولیٰ: 1985
37.احمد رضا، معجم متن اللغة، الناشر: دار مكتبة الحياة – بيروت: 1380 هـ،
38.أحمدمختارعبدالحميدعمر ،بمساعدةفريق عمل،معجم اللغةالعربيةالمعاصرة،الناشر،عالمالكتب، 2008م
39.أحمد مختار، عبد الحميد الدكتور ،معجم اللغة العربية المعاصرة، عالم الكتب ،2008 م
40.ابو زهره، محمد۔ الأحوال الشخصية۔ قاهره: دار الفكر العربى، 1957ء۔
41.اسلامی نظریاتی کونسل ، سالانہ رپورٹ13-2012 ء

42.آشنایی با دانشگاه اسلامی کوثر پاکستان، خبرگزاری رسمی حوزه.
43.الأصفهانی،أبوالقاسم الحسين بن محمدالمعروف بالراغب الأصفهانی،المفردات في غريب القرآن،دارالقلم،بيروت 1412ھ
44.الإمام الحافظ العلامةجمال الدين أبومحمدعبدالله بن يوسف الزيلعي الحنفي،نصب الراية،بيروت : المكتب الإسلامی،1393
45.امام کمال الدين محمدبن عبدالواحد، فتح القدير،المكتبة الرشيدية،کوئٹہ، ندارد
46.بخاری،اسماعیل بن ابراهيم بن مغيره صحيح البخاری،,الناشر،دارالاشاعت ، کراچی ،2009،
47.برهان الدين،محمودبن أحمدالمحيط البرهاني في الفقه النعماني،(بيروت،دارالكتب العلمية، 2004 م)
48.العيني،بدرالدين محمود بن أحمد .البناية شرح الهداية .بيروت: دار الكتب العلمية، 2000.
49.البيهقي،أبوبكرأحمدبن الحسين،شعب الإيمان،مكتبة الرشدللنشر والتوزيع بالرياض، 2003
50.تاريخ التشريع الاسلامی للشيخ خضری،الفكرالسامی فی تاريخ الفقه الاسلامی،ط:دارالكتب العلمية بيروت،ندارد
51.التبريزی،شيخ ولی الدين الخطيب ، مشكوة المصابيح ،مكتبة الشيخ، 2005ء
52.الترمذي،محمدبن عيسى،أبوعيسى،سنن الترمذي،مطبعةمصطفى البابي الحلبي،مصر، 1975م
53.حافظ ابن حجر،فتح الباری:المكتبةالسلفية،مصر، 1390 ھ
54.الحافظ الكبيرعلی بن عمرالدارقطني،سنن الدارقطني،(بيروت:مؤسسةالرسالة،الطبعة الاولى:2004ء
55.حسين يوسف موسىٰ وعبدالفتاح الصعيدی،الإفصاح فی فقه اللغة،مكتب الإعلام الإسلامي، شعبان 1410ھ):
56.خالدبن مساعدبن محمدالرويتع،التمذهب(دراسةنظريةنقدية)،المملكةالعربية السعودية،2013،
57.الدرامی،أبومحمدعبدالله بن عبدالرحمن بن الفضل بن بَهرام بن عبدالصمدالدارمي،التميمي السمر قندي،مسندالدارمي المعروف بـ (سنن الدارمي)،دارالمغني للنشروالتوزيع، المملكةالسعودية ، 2000
58.الدردير، أحمد بن محمد بن أحمد العدوي،الشرح الصغير مع حاشية الصاوي (القاهرة، دارالمعارف)
59.الدكتورسعدالدين هلالی،البصمةالوراثيةوعلائقاالشرعيةدراسةفقهية(القاهرة: مكتبة وهبة، 2010ء)
60.الدكتور وهبة الزحيلی،الوجيز فی أصول الفقه(کراچی: قديمی کتب خانة،تندارد)
61.الدكتورمحمدسليمان أشقر،اثبات النسب بالبصمة الوراثية،مشمولة أبحاث اجتهادية فی الفقه الطبي (دارالنفائس، 1424ھ)
62.الدکتورخواجه عبدالمجيب،جين اورجينتک انجينئرنگ(لاهور:اردوسائنس بورڈ،طبع اول 2010ء)،
63.الزحيلي، وهبة، الفقه الإسلامي وأدلته،(دمشق، دار الفكر،2006ء

64. الزركشي،أبوعبدالله بدرالدين محمدبن عبدالله بن بهادر،البحرالمحيط في أصول الفقه:دارالكتبي، 1994
65. الزيلعي،عثمان بن علي(تبيين الحقائق شرح كنزالدقائق،(القاهرةالمطبعةالكبرى الأميريةبولاق،1313)
66. زين الدين،أحمدبن عبدالعزيز،فتح المعين بشرح قرةالعين بمهمات الدين(الرياض،داربن حزم) 2010
67. السرخسي،شمس الأئمة،محمدبن أحمد،المبسوط للسرخسي،بيروت، دارالمعرفة، 1414هـ-1993
68. سيف الدين،أبوالحسن،علي بن محمد الآمدي،الإحكام في أصول الأحكام،:مؤسسة النوربالرياض، سنة 1387 هـ
69. شاه ولي الله محدث دهلوي،حجة الله البالغة: دارابن كثير، 2012ء
70. الشربيني،شمس الدين،محمدبن أحمد،مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج(بيروت، دار الكتب العلمية 1415هـ)
71. شمس الدين أبوعبدالله محمدبن أبى بكرالزرعى الدمشقى ابن قيم الجوزية،الطرق الحكميةفي السياسية الشرعية(بيروت:مكتبةالمؤيد،الطبعةالاولى،1989)
72. شمس الدين محمدالقةستانى،الخراسانى،جامع الرموز،شرح مختصرالوقايةالمسمى بالنقاية،مظهر العجائب كلكته،انديا 1858
73. شهاب الدين،عبدالرحمن بن محمد،إرشادالسالك إلى أشرف المسالك في فقه الإمام مالك،(القاهرة، مكتبة مصطفى البابي الحلبي وأولاده)ندارد
74. شهاب الدين أبوالعباس أحمدبن ادريس القرافي المالكي،الاحكام في تمييزالفتاوى من الأحكام للقرافى،مكتبة الانوار.
75. الشيخ حسين محمد،الملاح الفتوى نشأتها و تطورها اصولهاوتطبيقاتها،المكتبةالعصرية،بيروت، ندارد
76. الشيخ نظام وجماعة من علماء الهند\العالمكيرية، الفتاوى الهندية(دارالفكر،سنةالنشر 1991م)
77. صالح بن غانم السدلان،القرائن ودورهافى الإثبات فى الشريعة الاسلامية (الرياض:داربلنسية للنشرو التوزيع)
78. الطرق الحكمية فى السياسية الشرعية، دارالجيل بيروت لبنان،1998ء
79. عبد الغني بن طالب بن حمادة)، اللباب في شرح الكتاب، (بيروت: المكتبة العلمية م: 1298هـ
80. عبدالقادربن عمربن عبدالقادربن عمربن أبي تغلب بن سالم التغلبي الشَّيْبَاني،نيل المأرب بشرح دليل الطالب،الكويت: مكتبة الفلاح،: 1983م
81. عبدالرحمن الجزيرى،كتاب الفقة على المذاهب الأربعة:شعبه مطبوعات محكمةاوقات پنجاب،لاهور 1974
82. عبدالوهاب خلاف،أحكام الأحوال الشخصيةفي الشريعةالإسلامية،:مطبعةدارالكتب المصرية

بالقاهرة،1938م ،
83.عثمانى محمدتقى،تكملة فتح الملهم مكتبة معارف القرآن ،كراچى،ندارد،
84.عثمانى، محمدتقى،اصول الافتاء وادابه ، ناشر:مكتبة معارف القرآن كراچى،2015،
85.علاء الدين، علي المتقي الهندي (ت 975) كنز العمال، الناشر: مؤسسة الرسالة،1981م
86.علامه محمدالحضرى بک،تاريخ التشريع الاسلامى، ترجمة تاريخ فقه اسلامى مولانا عبدالسلام ندوى، لاهور،اسلامى اكادمى،اردو بازار،دارالفكر،بيروت لبنان 2001ء
87.علي المتقي،علاء الدين الشاذلي الهندي ،كنز العمال، الناشر: مؤسسة الرسالة، 1981م
88.علي بن أبي بكر المرغيناني، الهداية،الميزان ،لاهور،2006ء
89.على بن محمدالسيدالشريف الجرجاني،معجم التعريفات(قاهرة:دارالفضيلةللنشروالتوزيع والتصديرتندارد)
90.عليش،محمدبن أحمدبن محمد،منح الجليل شرح مختصر خليل،بيروت ،دار الفكر1409ھ
91.عمر بن محمد سبيل، البصمة الوراثية ومدى مشرعية استخدامها فى النسب والجناية، رياض:دارالنشر 1423
92.العينى،حافظ بدرالدين محمودبن احمد،عمدة القارى،مكتبة امدادية ،كوئت 2001ء
93.الغزالي،أبوحامدمحمدبن محمد،الوسيط في المذهب (القاهرة: دار السلام،1417ھ)،
94.فخرالدين عثمان بن علي الزيلعي الحنفي،تبيين الحقائق شرح كنزالدقائق،المطبعةالكبرى الأميرية– القاهرة،الطبعةالأولى 1313ھ،
95.فخرالدين،عثمان بن الزيلعى،الحنفى،تبيين الحقائق شرح كنزالدقائق(دارالكتاب الاسلامى،قاهرةمصر 1313ھ)
96.قاسمى،مولاناحميدالزمان،كيرانوى،اصول الافتاء،ادارة اسلاميات،2001ء
97.قراررات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي الدولي،(مكةالمكرمة،منظمةمجمع الفقه الإسلامي الدولي الإصدار،الرابع2021ء ،
98.القرافي،شهاب الدين أبي العباس أحمدبن إدريس بن عبدالرحمن الصنهاجي،تهذيب الفروق بهامش الفروق، عالم الكتب للطباعة والنشر والتوزيع 1990،
99.القرطبى،محمدبن احمدبن محمدبن رشد،بدايةالمجتهدونهايةالمقتصد:دارالاحياء لتراث العربى، 1416
100.القزويني،أبوعبدالله محمدبن يزيدبن ماجة،سنن ابن ماجه،دارالرسالةالعالمية،–2009م،
101.قلعجي،محمدرواس،قنيبي،حامدصادق،معجم لغةالفقهاء،الناشر:دارالنفائس للطباعة والنشر والتوزيع – 1988م
102.قواعدالفقه،محمدعميم الإحسان المجددي البركتي،ر:الصدف ببلشرز، كراتشي،1986،
103.الكتاب:مسندأبي يعلى،المؤلف:أبويعلى أحمدبن علي المحقق:حسين سليم أسدالناشر:دارالمأمون

للتراث، دمشق،1984،
104. الكاسانى،امام علاءالدين ابى بكربن مسعودالكاسانى،الحنفى،بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، بيروت ،دار الكتب العلمية 1406هـ - 1986م
105. لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي ،الفتاوى الهندية(بيروت، دار الفكر ، 1310 هـ
106. لجنةمكونةمن عدةعلماءوفقهاءفي الخلافةالعثمانية،مجلةالأحكام العدلية،مكتبةحقانية،كوئته2011ء
107. مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني، الموطأ، كتاب الأقضية، (مكتبة رحمانية،لاهور ندارد، 1419،
108. مجدالدين أبوالفضل عبدالله بن محمودبن مودودالموصلي الحنفي الاختيارلتعليل المختار، مطبعة الحلبي -القاهرة، 1356هـ
109. محمد أبوزهره ، الأحوال الشخصية،(دارالفكر العربى ، مصر، 1957ء)
110. محمد أبوزهره،تنظيم الأسرة و تنظيم النسل ،دارالفكر العربى(1976)ء
111. محمدبن أحمدبن أبي سهل شمس الأئمةالسرخسي،المبسوط للسرخسي،مصر،دارالمعرفة،بيروت،لبنان ندارد
112. محمدبن أحمدبن محمدبن أحمدبن رشد،بدايةالمجتهدونهايةالمقتصد(دارالحديث،القاهرة، 2004 م
113. محمدبن أحمد،أبوبكرعلاءالدين السمرقندي،تحفةالفقهاء،دارالكتب العلمية،بيروت،الطبعةالثانية 1414هـ،
114. محمد بن الحسن الشيباني أبوعبدالله،الحجة على أهل المدينة (عالم الكتب، بيروت ، 1403هـ
115. محمدبن على بن محمدبن على بن عبدالرحمٰن الحنفي الحصكفي،الدرالمختار،مكتبةرشيدية، ت ندارد
116. محمدبن يوسف بن أبي القاسم العبدري أبوعبدالله،التاج والإكليل لمختصرخليل(بيروت:دار الفكر، 1398هـ
117. محمد ناصر الدين الألباني، صحيح وضعيف الجامع الصغير وزيادته، (المكتب الإسلامي)
118. محمدنعمان محمد على البعدانى، مستجدات العلوم الطبية وأثرها فى الإختلاف الفقه (دارالكتب، الطبعة الاولىٰ، 2016)،
119. محمدبن مكرم بن على،أبوالفضل،جمال الدين ابن منظورالأنصاري الرويفعى الإفريقى،لسان العرب، دارصادر،بيروت، 1414
120. مرتبه انور ، مفتى ،خير الفتاوى، (ملتان،مكتبة امدادية،1418هـ)
121. المرداوي،علاءالدين أبوالحسن علي بن سليمان الإنصاف في معرفةالراجح من الخلاف(بيروت، دار إحياء التراث العربي)،
122. مصطفى بن عبدالله،الشهيربـ(حاجي خليفة)وبـ(كاتب جلبي)،كشف الظنون عن أسامي الكتب و

الفنون،دارإحياءالتراث ببيروت 1943،
123. مظهر علی ادیب، خاتون خانة، ناشر: مكتبة ذكریٰ، رامپور،1979،
124. المعروف بالراغب،المفردات في غريب القرآن،، 1412ھ،
125. المغني،موفق الدين أبومحمدعبدالله بن أحمدبن محمدبن قدامةالمقدسي الجماعيلي الدمشقي الصالحي الحنبلي: دارعالم الكتب للطباعةوالنشروالتوزيع،الرياض،المملكة العربية السعودية
126. موسوعةالمفاهيم الإسلاميةالعامة،المجلس الأعلى للشئون الإسلامية،مصر
127. موفق الدين أبومحمدعبدالله بن أحمدالمقدسي،المغني مع الشرح الكبير،(بيروت: دارالفكر،1997
128. ميني،روح الله موسوي،تحريرالوسيلة،اردومترجم،ندارد،(موسسةتنظيم ونشرآثارامام خميني ،1413ھ
129. نخبةمن اللغويين،المعجم الوسيط،مجمع اللغةالعربيةالقاهرة، 1972 م،
130. النسائی،ابوعبدالرحمن احمدبن شعیب بن علی بن سنان بن بحراالخراسانی ،سنن النسائی، 2012
131. النووي، أبوزكريايحيى بن شرف،شرح النووي على مسلم،دارإحياءالتراث العربي بيروت، 1392
132. النووى،أبوزكريامحيي الدين يحيى بن،المنهاج شرح النووي شرح صحيح مسلم،دارإحياءالتراث العربي بيروت،ندارد
133. النووي،أبوزكريامحيي الدين يحيى بن شرف،روضةالطالبين وعمدةالمفتين(دمشق،المكتب الإسلامي 1412ھ / 1991م
134. وزارة الأوقاف والشئون الإسلاميةالكويت،الموسوعة الفقهيةالكويتية،دارالسلاسل الكويت،1983ء

اردو مصادر و مراجع

1. احمد امین، پروفیسر، اسلام پر کیا گزری، مترجم: مولانا عمر احمد عثمانی، ناشر: دوست ایسوسی ایٹس، لاہور نامعلوم
2. از اولین دانشگاه شیعی در پاکستان چه می دانیم؟ خبر آنلاین
3. از اولین دانشگاه شیعی در پاکستان چه می دانیم؟ خبر آنلاین، جامعة الکوثر از افتخارات شیعه در پاکستان، خبر گزاری رسمی حوزه
4. اسرار احمد، ڈاکٹر، اسلام میں عورت کا مقام، ناشر: انجمن خدام القرآن لاہور، 2012
5. اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کا تیسرا اجلاس، منعقدہ عمان، مؤرخہ 11 تا16 / اکتوبر1986ء، قرارداد 161
6. ام المدارس جامعہ سلفیہ فیصل آباد کا مختصر تعارف- العلماء، 2024-12-16
7. برناڈلیوس، اسلام کا بحران، جہاد اور دہشت گردی، 2015
8. بنوری، محمد یوسف، بصائر و عبر، طبع: مکتبہ بینات، جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی: 2006
9. پروفیسر ڈاکٹر عبد الرؤف شکوری، کلوننگ: ایک تعارف، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع ششم 2006ء

10. تقی، عثمانی، مفتی، آسان ترجمۃ القرآن، مکتبہ معارف القرآن کراچی، 2010
11. تھانوی، اشرف علی، تحفہ زوجین، ناشر، مکتبہ عمر فاروق، کراچی، 2006
12. جنگ اخبار، 5 نومبر 2021ء،
13. جنگ سنڈے میگزین، 2، ستمبر 2007ء،
14. مفتی محمد شفیع، جواہر الفقہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، 2010ء
15. خضری بک، واصول الافتاء، مفتی محمد تقی عثمانی، طبع: مکتبہ معارف القرآن کراچی: 2014
16. خلیلی، منیر احمد، عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، 2004
17. خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، اشاعتِ دہم: 1993ء
18. دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
19. دارالافتاء جامعۃ الرشید کراچی
20. دارالافتاء جامعہ سلفیہ، فیصل آباد
21. دارالافتاء جامعہ نعیمہ لاہور
22. دارالافتاء جامعہ نعیمیہ لاہور
23. دسویں سالانہ رپورٹ، مسلم عائلی قوانین، اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد
24. دلیل ویب ڈسک، محمد ہارون، جامعہ نعیمیہ کا افراد سازی میں کردار، 5 مئی 2022ء
25. ڈاکٹر مفتی فہیم اختر ندوی، اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے (نئی دہلی: ایفا پبلی کیشنز، ت ندارد)
26. ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، مطالعہ تہذیب، (کراچی: قرطاس، طبع سوم 2016ء)
27. ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، نشان راہ، فکر پبلیشر، لاہور، 2009ء
28. ذاکر نائیک، ڈاکٹر، مترجم: سید امتیاز احمد، اسلام میں خواتین کے حقوق جدید یا فرسودہ، : دار النوادر لاہور
29. سعید احمد جلال پوری، "ڈی این اے ٹیسٹ اور ثبوتِ نسب"، ماہنامہ بینات (شوال المکرم، 1428ھ)،
30. سید ابو الاعلیٰ مودودی، پردہ، (کراچی: ادارہ معارفِ اسلامی، 2002ء)
31. شاہ ولي الله، أحمد بن عبد الرحيم الدهلوي، حجۃ الله البالغۃ، الناشر: دار الجيل، بيروت لبنان، :- 2005م
32. شفیع، مفتی، معارف القرآن، مکتبہ معارف القرآن کراچی، 2008،،
33. عثمانی، محمد تقی، مفتی، ہمارے عائلی مسائل، ناشر: دار الاشاعت کراچی، 2012
34. علی شریعتی، ڈاکٹر، مسلمان عورت اور دور حاضر کے تقاضے، مترجم: پروفیسر سردار نقوی، ادارہ احیائے

تراث اسلامی، 1988ء،

35. عمری، سید جلال الدین، اسلام میں عورت کے حقوق، ناشر: اسلامک پبلی کیشنز لاہور،

36. فتاوی مسعودی، محمد مسعود احمد، حیات مسعودی، کراچی: 1987ء)،

37. قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین،

38. قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ترتیب: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ناشر: مرکزی کتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، جنوری 2015ء،

39. قادری، سید احمد عروج، اسلام کے عائلی قوانین، ترتیب: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ناشر: مرکزی کتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، جنوری 2015ء،

40. کیلانی، محمد اقبال، نکاح کے مسائل، ناشر: مکتبہ بیت السلام، ریاض،

41. ماہنامہ البینات، کراچی، دسمبر، 2006، ، ماہنامہ بینات، شوال المکرم 1428ھ نومبر 2007ء،

42. مجموعہ فتاوی صابریہ، لاہور: انجمن مستشار العلماء، 1907ء)،

43. محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، جمع تالیف، عمر انور بدخشانی، زمزم پبلشرز، 2006

44. محسن ملت مفسر قرآن آیت اللہ شیخ محسن علی نجفی اعلی اللہ مقامہ، حالات زندگی- حوزہ نیوز ایجنسی، 9 جنوری 2024

45. محمد اسحاق صدیقی، اسلام کا سیاسی نظام، مجلس دعوت و تحقیقِ اسلامی بنوری ٹاؤن کراچی 1401ھ،

46. محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، میمن اسلامک پبلشرز کراچی 2012،

47. محمد شفیع، مفتی، جواھر الفقہ، ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، 2010ء،

48. محمد مظہر الدین صدیقی، دینِ فطرت، (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، جنوری 2010ء

49. محمد تقی امینی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، قدیمی کتب خانہ کراچی، 2012ء

50. محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، 2010ء،

51. مرتبہ حقانی، مختار اللہ، فتاوی حقانیہ، (اکوڑہ خٹک، جامعہ دار العلوم حقانیہ، 2010ء)،

52. مسلم عائلی قوانین آرڈیننس 1961ء، نظر ثانی و سفارشات، اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد،

53. مسلم عائلی قوانین آرڈیننس، 1961ء، (اردو ترجمہ، نمبر 8، مجریہ 1961ء)

54. مفتی عبد الرّحیم لاجپوری، فتاوی رحیمیہ، دار الاشاعت کراچی، 2003،

55. مفتی محمود، فتاویٰ مفتی محمود، ناشر: جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور، 2010ء

56. مولانااشرف علی تھانویؒ، الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ(امارت شرعیہ ہند،2014ء)

57. مولانامحمد طیب، دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، بھارت: دارالعلوم دیوبند،1965ء

58. نائیک، ذاکر، ڈاکٹر، تصویر کائنات میں رنگ / اسلام میں عورت کا مقام، مترجم: عطاتراب، ناشر: ندارد،

59. نجم الفتاوی،، مفتی، سید نجم الحسن، شعبہ نشرواشاعت دارالعلوم یاسین القرآن، نارتھ کراچی،2006

انگریزی مصادرومراجع

1.Devasia,Leelamna, Female Victims,Dattson Publishers,Nagpur,

2.Islam ,the west and the chellenges of modernity

3.Oxford Advanced learners Dictionary,

4.Max Radian, Encylopeadia of social scinces, the macmillan New York,vo